میلان کنڈیرا

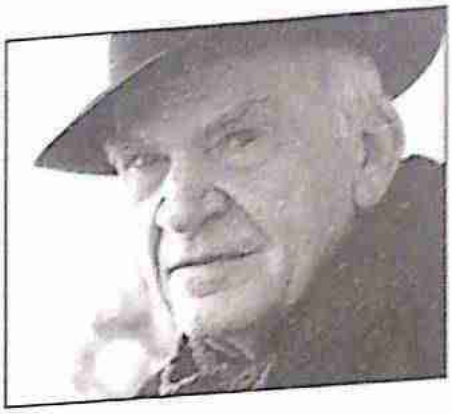
خندہ اور فراموشی کی کتاب

(ناول)

انگریزی سے ترجمہ

محمد عمر میمن





یکم اپریل 1929 کو چیک جمہوریہ کے شہر برنو (Brno) میں پیدا ہونے والے میلان کنڈیرا کو عالمی فکشن میں نہایت بلند پایہ مقام حاصل ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد چیکوسلوواکیہ میں کمیونسٹ حکومت قائم ہوئی۔ اگرچہ کنڈیرا پہلے خود بھی کمیونسٹ پارٹی کا رکن رہ چکا تھا، تاہم اپنی اختلافی آرا کے باعث پارٹی بدر کردیا گیا۔ اس نے اس واردات کو اپنے ناول مذاق (The Joke) کا موضوع بنایا ہے۔

1968 میں چیکوسلوواکیہ پر روسی فوجی قبضے کے نتیجے میں نزلہ ملک کے بہترین دماغوں پر گرا۔ چنانچہ ایسی تمام سربرآوردہ شخصیتوں کو جن کا تعلق ثقافتی میدان سے تھا چن چن کر ملازمت سے برطرف کردیا گیا اور ان کے خیالات کی ترویج اور ان کی کتابوں کے مطالعے اور نشر و اشاعت پر کڑی پابندی بھی عائد کردی گئی۔

1968 میں "بہارِ پراگ" (The Prague Spring) کی ناکامی کے نتیجے میں کنڈیرا 1975 میں نقلِ مکانی کر کے پیرس چلا آیا۔ اس کے ناول خندہ اور فراموشی کی کتاب اور وجود کی ناقابلِ برداشت لطافت جو بہ اتّفاق رائے اس کا بہترین تخلیقی کارنامہ شمار کیا جاتا ہے، اسی پُرآشوب دور کا فکشنی عکس پیش کرتے ہیں۔

کنڈیرا نے نصف درجن سے بیش ناول لکھے ہیں جو کثرت سے سراہے گئے اور مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوئے ہیں۔ تخلیق کے علاوہ کنڈیرا خاص طور پر فکشن کی تنقید کے میدان میں بڑی گہری بصیرت کا حامل ہے جس کا عکس ہمیں اس کے متعدد مکالموں اور فکشن کے فن پر اس کی کتاب میں ملتے ہیں۔ اس کے مطابق، ناول کی ہیئت میں اتنی لچک ضرور موجود ہے کہ اس میں تقریباً ہر شے سما سکتی ہے، شرط بس سلیقے کی ہے۔ ناول پیدا ہی اس لیے ہوا ہے کہ واقعیت کے متخالف اور متضاد پہلوؤں کو بیک وقت بکمال مہمان نوازی اپنے میں جگہ دے سکے۔ دوسرے یہ کہ وہ سمجھتا ہے کہ کہانی کی وحدت پلاٹ کے علاوہ موضوع یا کثرتِ موضوع سے بھی قائم ہوسکتی ہے، جس کے لیے وہ مغربی موسیقی کی اصطلاح polyphony (تعدّد اور ادغامِ اصوات) استعمال کرتا ہے۔

میلان کنڈیرا

خندہ اور
فراموشی کی کتاب

(ناول)

انگریزی سے ترجمہ
محمد عمر میمن

مکتبۂ دانیال

اشاعتِ اوّل- ۲۰۱۸ء

ناشر- حُوری نورانی
سرورق کی پینٹنگ- اکرم وڑائچ

طباعت- مقصود دانش پریس، کراچی
قیمت- ۷۵۰ روپے

ISBN: 978-969-419-089-1

Khanda Aur Faramoshi Ki Kitab
by Milan Kundera
Translated by Muhammad Umar Memon

® PAKISTAN PUBLISHING HOUSE
مکتبۂ دانیال

Snowhite Centre, Opposite Jabees Hotel,
Abdullah Haroon Road, Karachi-74400
Phone:35681457-35682036-35681239
Email:danyalbooks@hotmail.com

ترتیب

پہلا حصہ

گمشدہ خطوط

1

فروری 1948 میں اشتراکی رہنما کلیمنت گوت والت (Klement Gottwald) پراگ کے بروک طرزِ تعمیر کے محل کی بالکونی میں نمودار ہوا تا کہ ان ہزاروں لاکھوں ہم شہریوں سے خطاب کرے جو پرانے شہر کے چوک میں مجمع لگائے کھڑے تھے۔ یہ چیک تاریخ کا سخت دشوار لمحہ تھا — ان فیصلہ کن لمحوں میں سے جو ہزار سال میں دو ایک بار ہی آتے ہیں۔

گوت والت کے دائیں بائیں اس کے کامریڈ تھے۔ کلے مینتس (Clemenitis) برابر کھڑا تھا۔ ہلکی سی برفباری ہوری تھی، موسم سرد تھا، اور گوت والت برہنہ سر۔ فکر مند کلے مینتس نے اپنی سموری ٹوپی اتار کر گوت والت کے سر پر رکھ دی۔

پارٹی کے پروپیگنڈائی شعبے نے ایک تصویر ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں شائع کی جس میں گوت والت سموری ٹوپی پہنے بالکونی میں کامریڈوں کے ساتھ کھڑا ہے اور قوم سے خطاب کررہا ہے۔ اشتراکی چیکوسلوواکیہ کی تاریخ اُس بالکونی پر وجود میں آئی۔ بچہ بچہ اس تصویر کو پوسٹروں، درسی کتابوں، اور عجائب گھروں میں دیکھ چکا ہے۔

چار سال بعد کلے مینتس پر غداری کا الزام لگایا گیا اور پھانسی دے دی گئی۔ پروپیگنڈائی شعبے نے اسے فوراً تاریخ سے یکسر محو کردیا اور، ظاہر ہے، تمام تصویروں سے بھی۔ ٹھیک اس وقت سے گوت والت بالکونی پر اکیلا کھڑا ہے۔ جہاں پہلے کلے مینتس کھڑا ہوا تھا، وہاں بس محل کی دیوار ہی ہے۔ کلے مینتس کا کچھ باقی بچ رہا ہے تو وہ گوت والت کے سر پر منڈھی ہوئی ٹوپی ہے۔

2

یہ 1971 ہے، اور میریک (Mirek) کا کہنا ہے کہ اقتدار کے خلاف آدمی کی جدوجہد فراموشی کے خلاف حافظے کی جدوجہد ہے۔

اس کی یہ کوشش اس چیز کو برحق ٹھہرانے کے لیے ہے جسے اس کے دوست لاپروائی کہتے ہیں: واقعات کو ڈائری میں احتیاط سے درج کرلینا، ساری خط وکتابت کو محفوظ رکھنا، ان جلسوں کی یادداشتیں بنانا جہاں حالاتِ حاضرہ پر بحث ہوتی ہو اور اس بات پر مباحثے کہ اب اس کے بعد کیا کرنا چاہیے۔ ہم جو بھی کرتے ہیں اس سے آئین کی خلاف ورزی نہیں ہوتی، وہ ان سے کہتا ہے۔ چھپانے کی کوشش، اپنے کو مجرم سمجھنا — بس یہی خاتمے کا آغاز ہے۔

ہفتہ بھر پہلے، عملے کے ساتھ ایک نئی عمارت کی چھت پر کام کرتے وقت، اس نے نیچے دیکھا اور اچانک چکر آنے لگے۔ اس کا توازن بگڑ گیا اور ایک شہتیر کو پکڑا جو مستحکم نہیں تھا، وہ اپنی جگہ سے کھسک گیا اور بعد میں اُسے شہتیر کے نیچے سے کھینچ کھانچ کر نکالا گیا۔ پہلے پہل چوٹ خطرناک معلوم ہوئی، لیکن بعد میں، جب اسے پتا چلا کہ یہ عام سا ٹوٹا ہوا بازو ہے، تو اس نے اطمینان کا سانس لیا اور کہا کہ چلو اب ایک دو ہفتوں کی چھٹی مل جائے گی جن میں وہ کام کیے جاسکیں گے جنھیں نبٹانے کا ارادہ بہت دنوں سے کر رہا ہے۔

بالآخر وہ اپنے محتاط دوستوں کی روش پر آہی گیا۔ ٹھیک ہے، آئین کی رو سے آزادیِ تقریر حاصل تھی، لیکن قانون ہر اس عمل کو واجب سزا قرار دیتا تھا جسے ملک کے لیے نقصان دہ سمجھا جاسکے۔ اب یہ بھلا کون بتا سکتا ہے کہ ملک کب چیخنا چلانا شروع کردے کہ فلاں فلاں عمل سے اس کو گزند پہنچ رہی ہے؟ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اِن قابلِ گرفت کاغذات کو کسی محفوظ جگہ منتقل کردے تو بہتر ہوگا۔

لیکن سب سے پہلے وہ زدینا (Zdena) والا معاملہ طے کرلینا چاہتا تھا۔ اس نے زدینا کو لانگ ڈسٹینس فون کرنا چاہا، لیکن اس تک پہنچنے میں کامیابی نہ ہوئی۔ اس سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش میں چار دن برباد ہوگئے۔ پھر، گذشتہ کل کہیں جا کر رسائی ہوئی۔ زدینا نے وعدہ کیا کہ آج دوپہر اس کا انتظار کرے گی۔

اس کے سترہ سالہ بیٹے نے احتجاج کیا کہ پلاسٹر چڑھے بازو کے ساتھ اس کا کار چلانا ممکن نہیں۔ یہ واقعی تھا بھی مشکل کام۔ گوپھل میں پڑا ہوا زخمی بازو بے کاری اور بیچارگی سے سینے پر جھولتا رہا۔ جب بھی وہ گیئر بدلتا، چند ثانیوں کے لیے اسٹیرنگ وہیل چھوڑ دینا پڑتا۔

3

زدینا سے اس کے معاشقے کو پچیس سال ہو رہے تھے اور اب اس کی صرف چند یادیں ہی باقی رہ گئی تھیں۔

ایک بار جب وہ ملنے آئی تو رومال سے آنکھیں تھپتھپاتے اور ناک پونچھتے ہوئے۔ میریک نے پوچھا کیا ہوگیا ہے۔ ایک دن پہلے ایک روسی سیاستداں مرگیا تھا، زدینا نے بتایا۔ کوئی زدانوف، آربوزوف، یا مشتربوف۔ اگر آنسوؤں کے قطروں کی تعداد سے قیاس کیا جائے تو وہ مشتربوف کی موت پر اپنے باپ کی موت سے زیادہ دلگیر تھی۔

کیا یہ سب واقعی ہوا ہوگا؟ یا مشتربوف کا ماتم میریک کی موجودہ نفرت کا واہمہ تھا؟ نہیں، یہ سب 'سچ مچ' پیش آیا تھا، اگرچہ یہ ظاہر ہے کہ وہ فوری حالات جنھوں نے اس واقعے کو قابلِ اعتبار اور حقیقی بنایا تھا، اب اس کی دسترس سے نکل چکے تھے، اور اس کی یاد نامعتبر اور مضحکہ خیز بن گئی تھی۔

زدینا سے متعلق اس کی ساری یادیں ایسی ہی تھیں۔ وہ ٹرام میں بیٹھے اس اپارٹ مینٹ سے واپس آرہے تھے جہاں انھوں نے پہلی بار ہم بستری کی تھی۔ (میریک کو یہ جان کر خاص طور پر تسکین ہوئی کہ وہ ان تمام مباشرتوں کو بالکل فراموش کرچکا تھا، ان کے کسی ایک لمحے کی یادآوری نہیں کرسکتا تھا۔) وہ کنارے کی نشست پر ہچکولے کھاتے ہوئے افسردہ، متفکر اور حیرت انگیز طور پر سال خوردہ نظر آرہی تھی۔ جب اس نے پوچھا کہ اتنی خاموش کیوں ہے تو بتایا کہ وہ ان کی مباشرت سے مطمئن نہیں ہوئی ہے۔ کہنے لگی کہ میریک نے بھی اس کے ساتھ دانشوروں کی طرح جفتی کی ہے۔

اس وقت کے سیاسی محاورے میں 'دانشور' کا لفظ فحش سمجھا جاتا تھا۔ اس سے وہ آدمی

مراد لیا جاتا تھا جو زندگی کو سمجھنے میں ناکام رہا ہو اور عام لوگوں سے کٹا ہوا ہو۔ اُس زمانے میں وہ کمیونسٹ جنھیں دوسرے کمیونسٹوں نے سولی پر چڑھایا ان پر یہی تہمت دھری گئی۔ اُن لوگوں کے برخلاف جن کے پانو مضبوطی سے زمین میں گڑے ہوئے تھے، ان لوگوں کے بارے میں قیاس کیا جاتا تھا کہ ہواؤں میں اڑتے پھرتے ہیں۔ ایک لحاظ سے اب یہ بالکل جائز تھا کہ ان کے پیروں کے نیچے سے زمین ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھینچ لی جائے اور زمین سے تھوڑا سا اوپر لٹکا رہنے دیا جائے۔

لیکن جب زدینا نے اسے ایک دانشور کی طرح جفتی کرنے کا طعنہ دیا تو اس سے اس کی کیا مراد تھی؟

کسی نہ کسی وجہ سے وہ اس سے آسودہ نہیں ہوئی تھی، اور جس طرح وہ ایک تجریدی رشتے کو (جیسے ماشتربوف نامی اجنبی سے اپنے تعلق کو) از حد ٹھوس جذبے (آنسوؤں کی شکل میں) کا حامل بنانے کی اہل تھی، اسی طرح وہ غایت درجے کے ٹھوس عمل کو تجریدی معنی دے سکتی تھی اور اپنی ناآسودگی کو سیاسی نام۔

4

عقبی شیشے میں نظر ڈالتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ ایک کار مسلسل اس کا تعاقب کر رہی ہے۔ اسے اس پر کبھی شک نہیں ہوا تھا کہ اس کا پیچھا کیا جاتا رہا ہے، لیکن اب تک انھوں نے بڑی ماہرانہ احتیاط کا مظاہرہ کیا تھا۔ لیکن آج ایک انقلابی تبدیلی آ گئی تھی: وہ چاہتے تھے کہ اُسے اُن کا علم ہو جائے۔

پراگ سے لگ بھگ پندرہ میل دور کھیتوں کے درمیان اونچی سی باڑھ تھی، جس کے پیچھے گاڑیوں کی مرمت کی دکان تھی۔ وہاں اس کا ایک اچھا دوست ہوا کرتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس سے گاڑی اسٹارٹ کرنے والا پرزہ بدلوا لے جو ٹھیک کام نہیں کر رہا تھا۔ داخلے کے پاس آ کر اس نے کار روک دی۔ وہاں سرخ اور سفید دھاریوں والا پھاٹک راستہ روکے کھڑا تھا۔ ایک بھاری بھرکم عورت اس کے برابر کھڑی تھی۔ میریک اس کے پھاٹک کھولنے کا

انتظار کرتا رہا، لیکن وہ بس ساکت وصامت کھڑی اسے گھورتی رہی۔ اس نے ہارن بجایا، لیکن جواب ندارد۔ اس نے کھڑکی سے جھانکا۔

"ابھی تک حوالات نہیں گئے؟" عورت نے پوچھا۔

"نہیں، ابھی تک تو نہیں" میریک نے جواب دیا۔ "پھاٹک کھولنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

وہ اسی بے حسی سے اسے مزید چند طویل لمحوں تک دیکھتی رہی، پھر جمائی لی اور پھاٹک کے پاس پہرے دار کی کوٹھری میں جا کر کرسی میں دھنس کر بیٹھ گئی اور میریک کے رخ پیٹھ پھیر لی۔

چنانچہ وہ کار سے اترا اور پھاٹک کے گرد چکر کاٹتا ہوا اپنے مستری دوست کی تلاش میں مرمت کرنے والے حصے میں چلا گیا۔ مستری اس کے ساتھ ساتھ باہر نکلا اور خود ہی پھاٹک کھول دیا (عورت ہنوز اسی بے حسی سے کوٹھری میں براجمان رہی)۔ میریک کار اندر لے آیا۔

"ٹیلی وژن پر آ کر ڈینگیں مارنے کا یہی حشر ہوتا ہے" مستری نے کہا۔ "ہر ایری غیری تمھاری شکل پہچان جاتی ہے۔"

"کون ہے یہ؟" میریک نے پوچھا۔

اسے معلوم ہوا کہ جب روسی فوجیوں نے چیکوسلوواکیہ پر چڑھائی کی، جس کے نتائج ہر جگہ محسوس کیے جا رہے تھے، تو اس نے اس عورت کی زندگی بھی بدل کر رکھ دی تھی۔ یہ دیکھ کر کہ بلند عہدیداروں کو بھی (اور اس کے مقابلے میں ہر شخص بلند عہدے ہی پر تھا) اقتدار، مرتبہ، ملازمت، حتیٰ کہ روز کی روٹی سے بھی ادنیٰ سے اتہام پر محروم کیا جا رہا ہے، تو وہ جوش میں آ گئی اور خود بھی مخبری کرنے لگی۔

"ایسا ہے تو ابھی تک پھاٹک کی ملازمت کیوں کر رہی ہے؟ ان لوگوں نے اسے ترقی کیوں نہیں دی؟"

مستری مسکرانے لگا۔ "دیں بھی تو کیسے۔ پانچ تک بھی تو گن نہیں سکتی۔ یہی کر سکتے ہیں کہ اسے مخبری کرنے دیں۔ بس یہی اس کا انعام ہے۔" مستری نے ہڈ اٹھایا اور اندر انجن کا معائنہ کرنے لگا۔

میریک کو ناگہانی احساس ہوا کہ کوئی اس سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا ہوا ہے۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو سرمئی کوٹ، سفید قمیص اور ٹائی، اور بھوری پتلون میں ایک آدمی نظر آیا۔ اس کی موٹی گردن اور پھولے ہوئے چہرے کے اوپر مصنوعی طریقے سے سفید لہر ڈالے ہوئے بالوں کا گچھا پڑا ہوا تھا۔ وہ وہاں کھڑا مستری کو اٹھے ہوئے ہُڈ کے اندر جھکے ہوئے دیکھتا رہا۔

کچھ دیر بعد مستری نے بھی اسے دیکھ لیا۔ "کسی کی تلاش میں ہو؟" اس نے پیٹھ سیدھی کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں،" موٹی گردن اور لہریے دار بالوں والے نے کہا۔ "کسی کی تلاش میں نہیں ہوں۔"

مستری پھر انجن پر جھک گیا اور بولا، "پراگ کے بیچوں بیچ 'وین سِسْلوش' (Wenceslaus) چوک میں ایک آدمی کھڑا قے کر رہا تھا۔ ایک دوسرا آدمی اس کے پاس آیا، اس کی طرف دیکھا، اور سر ہلا کر بولا، "مجھے تمھارے جذبات کا پورا پورا احساس ہے۔"

5

بنگلا دیش کی خونریزی نے جلد ہی چیکوسلوواکیہ پر روسی حملے کی یاد کو محو کر دیا، الیَندے (Allende) کے قتل نے بنگلا دیش کی سسکیوں کا دَم گھوٹ دیا، صحرائے سینا کی جنگ نے الیَندے کے قتل کی یاد بھلوا دی، کمبوڈیا کے قتلِ عام کے سامنے لوگ سینا کو بھول بھال گئے۔ و علیٰ ہٰذا القیاس، یہاں تک کہ بالآخر ہر شخص ہر چیز کو فراموش ہو جانے دیتا ہے۔ اُن وقتوں میں جب تاریخ ابھی ہولے ہولے حرکت کرتی تھی، واقعات کم کم اور وقفوں وقفوں سے پیش آتے تھے اور بہ آسانی ذہن نشین کر لیے جاتے تھے۔ ان کی حیثیت ایک عام طور پر تسلیم کیے ہوئے 'پس منظر' کی ہوتی تھی جس کے سامنے نجی زندگی کی سنسنی خیز مہمات وقوع پذیر ہوتیں۔ موجودہ دور میں تاریخ سرعت کے ساتھ حرکت کرتی ہے۔ کوئی بھی تاریخی واقعہ، اگرچہ اسے جلد ہی بھلا دیا جاتا ہو، اگلی ہی صبح جدت کی شبنم سے دمکنے لگتا ہے۔ اب یہ پس منظر نہیں ہوتا، بلکہ مہم جوئی بذاتہٖ، وہ مہم جوئی جو زندگی کی عام تسلیم شدہ پیش پا افتادگی کے سامنے رونما ہو رہی ہو۔

چونکہ ہم یہ فرض نہیں کر سکتے کہ کوئی بھی تاریخی واقعہ، خواہ یہ کتنا ہی قریبی کیوں نہ ہو، سبھوں کے علم میں ہوتا ہے، یہ لازم ہے کہ میں چند سال پہلے پیش آئے ہوئے واقعات کو اس طرح رقم کروں جیسے وہ ہزاروں سال پرانے ہوں۔ 1939 میں جرمن فوجی بوہیمیا میں دندناتے ہوئے داخل ہوئے اور چیک ریاست کا وجود ختم ہوگیا۔ 1945 میں روسی فوجیں داخل ہوئیں اور ملک کو دوبارہ خودمختار جمہوریہ قرار دے دیا گیا۔ عوام نے روس کے لیے بڑے جوش وخروش کا مظاہرہ کیا — جس نے جرمنوں کو ان کے ملک سے نکال باہر کیا تھا — اور چونکہ وہ چیک کمیونسٹ پارٹی کو اس کا وفادار نمائندہ تصور کرتے تھے، اس لیے انھوں نے اپنی ہمدردیاں اس کی جانب منتقل کر دیں۔ سو یہ ہوا کہ فروری 1948 میں کمیونسٹوں نے اقتدار سنبھال لیا، خونریزی اور تشدد سے نہیں، بلکہ نصف کے لگ بھگ عوام کے پرمسرت نعروں کی گونج میں۔ اور براہِ کرم یہ یاد رکھیے: آبادی کا یہ نصف جس نے پرجوش نعرے بلند کیے زیادہ فعّال، زیادہ ذہین، اور بہتر نصف تھا۔

ہاں، جو جی چاہے کہیے — کمیونسٹ زیادہ ذہین تھے۔ ان کے پاس پرشکوہ لائحۂ عمل تھا، ایک نئی نویلی دنیا کا منصوبہ جس میں ہر شخص کے لیے مناسب جگہ ہوگی۔ کمیونسٹوں کے مخالفین کے پاس ایسا کوئی عظیم خواب نہیں تھا؛ اگر کچھ تھا تو بس چند اخلاقی اصول تھے، باسی اور بے جان، جن سے قائم نظام کی تارتار پتلون کی پیوندکاری ہو سکے۔ تو ظاہر ہے شان وشوکت کے پرجوش حامی محتاط مفاہمت پسندوں پر سبقت لے گئے اور وقت ضائع کیے بغیر اپنے خواب کو حقیقت بنانے میں جُت گئے: ہر فرد و بشر کے لیے بہشتِ عدل وانصاف کی تخلیق۔

مجھے اپنی بات دہرانے دیجیے: 'بہشت، ہر فرد و بشر کے لیے'۔ لوگوں نے ہمیشہ ایسی بہشت کی تمنا کی ہے، ایک باغ جہاں بلبلیں نغمہ سنج ہوں، ہم آہنگی کی اقلیم جس میں دنیا اجنبی کے روپ میں آدمی کے خلاف سینہ تان کر نہیں کھڑی ہوجاتی، اور نہ ایک آدمی دوسرے آدمیوں کے خلاف، جہاں دنیا اور اس کے تمام باسی ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوتے ہیں اور آسمانوں کو روشن کرنے والی آگ وہی ہوتی ہے جو انسانوں کے سینوں میں فروزاں ہوتی ہے، جہاں ہر متنفس باخ کے کسی عالی شان کثیر الاصوات نغمے کا سُر ہوتا ہے، اور جو اپنا سُر ملانے سے انکار کرتا ہے محض ایک سیاہ دھبّا، بے مصرف اور بے معنی، جسے بڑی آسانی سے

کسی کیڑے مکوڑے کی طرح انگلیوں میں پکڑ کر مسلا جا سکتا ہے۔

شروع ہی سے ایسے لوگ تھے جنھیں احساس تھا کہ ان کا مزاج اس بہشت سے لگا نہیں کھاتا اور وہ ملک چھوڑ دینا چاہتے تھے۔ لیکن چونکہ بہشت اپنی تعریف میں سبھوں کی دنیا ہے، چنانچہ ملک چھوڑ کر جانے والے اس کی صحت اور جواز کی در پردہ نفی کر رہے تھے۔ سو پردیس جانے کے بجائے وہ قید خانوں میں جا بسے۔ جلد ہی ہزاروں لاکھوں ان کے ساتھ آ شامل ہوئے، بشمول متعدد کیمونسٹوں کے، جیسے وزیر خارجہ کلے مینتس، وہ شخص جس نے گوت والت کو اپنی ٹوپی اُڑھائی تھی۔ عشاق پردۂ سیمیں پر شرمائے شرمائے ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے رہے، شہریوں کی عدالت میں ازدواجی بے وفائیوں پر سخت سزائیں دی جاتی رہیں، بلبلیں نغمہ سنج رہیں، اور کلے مینتس کا جسم بنی نوعِ آدم کو نئی سحر کی نوید دینے والے گجر کی طرح آگے پیچھے جھولتا رہا۔

اور اچانک ان نوجوان اور ذہین انتہا پرستوں کو ایک عجیب سے احساس نے آ لیا کہ انھوں نے دنیا میں کوئی چیز بھیج دی ہے، ایک عمل جو ان کا کیا دھرا ہے، جس نے اپنی مستقل زندگی اختیار کر لی ہے، جو اپنے ابتدائی تصور سے بیگانہ ہو گیا ہے اور اس تصور کے موجدین کو یکسر نظر انداز کر بیٹھا ہے۔ سو ان نوجوان اور ذہین انتہا پسندوں نے چلّا چلّا کر اپنے عمل کو لوٹ آنے کے لیے کہا، اسے ڈانٹا ڈپٹا، اس کا پیچھا کیا، اور دبوچ لینے کی کوشش۔ اگر میں ان باصلاحیت انتہا پسند مفکّروں کی نسل کے بارے میں کبھی کوئی ناول لکھوں گا تو اس کا نام "گمشدہ عمل کے تعاقب میں" رکھوں گا۔

6

مستری نے کار کا ہُڈ گرا دیا۔ میریک نے پوچھا کہ اس پر کتنی رقم واجب الادا ہے۔

"کچھ نہیں،" مستری بولا۔

میریک اسٹیرنگ وہیل کے پیچھے آ بیٹھا۔ اس فراخ دلی نے اسے متاثر کیا۔ سفر جاری رکھنے کی اسے کوئی خواہش نہیں ہو رہی تھی۔ مستری کے ساتھ وقت گزارنا اور لطیفوں کا تبادلہ

کرنا کہیں بہتر تھا۔ مستری نے جھک کر گاڑی کے اندر سر ڈالا اور اس کے شانے پر ہاتھ مارا۔ پھر وہ پھاٹک کی طرف گیا اور اسے کھول دیا۔

جب میریک روانہ ہوا تو مستری نے سر سے اس سمت میں اشارہ کیا جہاں مرمت کی دکان کے داخلے کے سامنے ایک اور کار کھڑی ہوئی تھی۔

موٹی گرن اور لہریے دار بالوں والا آدمی اپنی گاڑی کے کھلے ہوئے دروازے سے ٹیک لگائے کھڑا میریک پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اور اسٹیرنگ کے پیچھے بیٹھا ہوا آدمی بھی یہی کر رہا تھا۔ اس معاملے میں دونوں ہی دیدہ دلیر اور بے شرم واقع ہوئے تھے، اور ان کے پاس سے گاڑی پر گزرتے ہوئے میریک نے بھی جواباً یہی تاثر اختیار کیا۔

وہ عقبی آئینے میں ان پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ دیکھا کہ آدمی جست بھر کر اگلی نشست پر آبیٹھا ہے اور کار نے 'یو' (U) ٹرن لیا ہے تاکہ وہ اس کا تعاقب جاری رکھ سکیں۔

اسے خیال آیا کہ ان قابلِ گرفت کاغذات سے جان چھڑانے کے لیے اسے کچھ کرنا چاہیے تھا۔ اگر وہ علالتی چھٹی کے اگلے ہی دن ان سے نبٹ لیا ہوتا اور زدینا سے گفتگو کرنے کا انتظار نہ کیا ہوتا تو اس کام کے بخیر و خوبی انجام پا جانے کا امکان تھا۔ لیکن اس کے ذہن میں تو زدینا چھائی ہوئی تھی۔ وہ اِدھر کئی سال سے اس سے جا کر ملنے کے منصوبے بناتا رہا تھا۔ لیکن ان پچھلے چند ہفتوں میں اسے یوں محسوس ہوا کہ وہ ملاقات کو اب اور زیادہ ملتوی نہیں کر سکتا، وقت اس کی گرفت سے نکلا جا رہا ہے، اور اسے اس ملاقات کو ہر لحاظ سے مکمل اور حسین بنانے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔

7

ان دور افتادہ دنوں میں زدینا سے تعلق توڑ لینے پر (ان کا معاشقہ لگ بھگ تین سال چلتا رہا تھا) اسے بے انتہا آزادی کا احساس ہوا تھا، یوں لگتا تھا جیسے اچانک ہر بات اس کے حسبِ حال ہونے لگی ہو۔ جلد ہی اس نے ایسی عورت سے شادی کر لی جس کی خوبصورتی نے اُس کی عزتِ نفس کو بڑی تقویت پہنچائی۔ پھر وہ عورت مر گئی اور وہ بیٹے کے ساتھ ایک طرح کی عشوہ

طراز تنہائی میں اکیلا رہ گیا جو بہت سی دوسری عورتوں کی دلبستگی، دلچسپی، اور فکرمندی کا باعث بنی۔

وہ اپنے تحقیقی کام میں بھی بے حد کامیاب رہا تھا، اور اس بات نے اسے بچائے رکھا تھا۔ چونکہ ملک کو اس کی حاجت تھی، وہ چبھتے ہوئے سیاسی فقرے بازی کرسکتا تھا جس کی دوسروں کو جرأت بھی نہیں ہوسکتی تھی۔ جیسے جیسے عمل کی یادآوری کی کوشش کرنے والے فرقے کا اثر و رسوخ بڑھتا گیا، وہ ٹیلی وژن پر بار بار دکھائی دینے لگا، اور دیکھتے دیکھتے مشہور و معروف شخصیت بن گیا۔ روسیوں کے آنے کے بعد جب اس نے اپنے نظریات سے براءت کا انکار کردیا، تو انھوں نے اسے ملازمت سے برطرف کردیا اور اس کے پیچھے خفیہ پولیس کا گھیرا ڈال دیا۔ لیکن ان باتوں نے اس کی بے باکی ختم نہیں کی۔ وہ اپنی قسمت کا گرویدہ تھا اور اسے بربادی کی طرف گام زن ہونے میں بڑی شان و شوکت اور حسن کا احساس ہوتا تھا۔

آپ مجھے غلط نہ سمجھیں۔ میں نے کہا کہ وہ اپنی قسمت کا گرویدہ تھا، اپنی ذات کا نہیں۔ یہ دو بہت مختلف باتیں ہیں۔ اس کی زندگی نے اپنی الگ پہچان پیدا کر لی تھی اور اپنی پسندیدہ دلچسپیوں کی جستجو کرنے لگی تھی، جو میریک کی دلچسپیوں سے یکسر مختلف تھیں۔ یہ جو میں نے کہا کہ اس کی زندگی اس کا مقسوم بن گئی، تو اس سے میرا منشا یہی ہے۔ قسمت کی ایسی کوئی نیت نہیں تھی کہ میریک کے حق میں (چاہے اس کی مسرت، سلامتی، خوش باشی، یا صحت کے لیے) اپنی چھنگلی بھی اٹھائے، جبکہ خود میریک اپنی قسمت کے لیے سب کچھ کرنے کے لیے تیار تھا (اس کے شکوہ، شفافی، حسن، روش، اور تفہیم کے لیے)۔ وہ خود کو اپنی قسمت کا ذمے دار سمجھتا تھا، لیکن اس کی قسمت اس کے لیے کوئی ذمے داری محسوس نہیں کرتی تھی۔

اپنی زندگی کی بابت اس کا رویہ وہی تھا جو سنگ تراش کا اپنے مجسمے یا ناول نگار کا اپنے ناول کے بارے میں ہوتا ہے۔ ناول نگار کے غیر منفک حقوق میں سے ایک اپنی نگارش پر نظرِ ثانی کا حق بھی ہے۔ اگر اسے ناول کا آغاز پسند نہیں، تو وہ اسے دوبارہ لکھ سکتا ہے یا بالکل ہی حذف کرسکتا ہے۔ لیکن زدینا کے وجود نے میریک کو ادیب کے اختیار سے محروم کردیا تھا۔ زدینا ناول کے اولین صفحات کا حصہ بنے رہنے پر مصر تھی۔ وہ قلم زد کیے جانے کی انکاری تھی۔

8

آخر میریک کو زدینا پر اس قدر ندامت کیوں محسوس ہوتی تھی؟

بالکل سامنے کی وجہ تو یہ ہے کہ کھیل کے شروع ہی میں میریک ان لوگوں میں شامل ہو گیا تھا جنھوں نے اپنے عمل کو مار گرانے کا عہد کیا تھا، جبکہ زدینا سدا اسی باغ کی وفادار رہی تھی جس میں بلبلیں نغمہ سنج ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ ابھی حال ہی میں وہ آبادی کے اس دو فیصد سے بھی جا ملی تھی جس نے روسی ٹینکوں کا سواگت کیا تھا۔

درست، لیکن میں اسے اتنی قائل کر دینے والی بات نہیں سمجھتا ہوں۔ اگر سارا مسئلہ صرف اتنا ہی تھا کہ اس نے روسی ٹینکوں کا خیر مقدم کیا، تو بس وہ اسے لوگوں کے سامنے خوب زور زور سے سخت سست کہہ لیتا؛ لیکن اس سے کبھی واقف ہونے کا انکار نہ کیا ہوتا۔ نہیں، زدینا نے اس کے حق میں اس سے کہیں زیادہ برا کیا تھا: وہ بدصورت تھی۔

لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بیس سال سے زیادہ ہو رہے تھے کہ وہ اس کے ساتھ نہیں سویا تھا۔

اس سے بہت بڑا فرق پڑتا تھا۔ اتنے فاصلے سے بھی زدینا کی بے ہنگم طور پر بڑی ناک اس کی زندگی پر اپنا سایہ ڈال رہی تھی۔

چند سال پہلے اس کی بے حد حسین داشتہ رہی تھی۔ ایک بار وہ اس شہر گئی جہاں زدینا رہتی تھی، اور وہاں سے خاصی مضطرب ہو کر لوٹی۔ "سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر تم نے کیسے اس ہولناک عورت سے سروکار رکھا تھا؟"

اس نے بتایا کہ وہ اسے صرف یوں ہی سا جانتا ہے اور اس کے ساتھ کسی قربت کا صاف انکار کر دیا۔

بظاہر وہ زندگی کے ایک بڑے راز سے بالکل ہی ناواقف نہیں تھا: عورتوں کو حسین مردوں کی جستجو نہیں ہوتی، بلکہ ایسے مردوں کی جن کے ساتھ حسین عورتیں ہوں۔ چنانچہ ایک بدصورت داشتہ رکھنا بڑی کاری غلطی ہے۔ میریک نے زدینا کے سارے آثار مٹا دینے کی حتی المقدور کوشش کی، اور چونکہ بلبلوں کے دل دادہ اس سے زیادہ سے زیادہ نفرت کرنے لگے

تھے، اسے امید تھی کہ زدینا جو بڑی مستعدی سے افسر شاہی کا زینا پھلانگتی جا رہی ہے اسے بھول جانے پر بہت زیادہ خوش ہوگی۔

وہ غلطی پر تھا۔ زدینا اس کے بارے میں دنیا جہان میں بات کرتی پھرتی، بس ذرا سا عذر ملنے کی دیر تھی۔ ایک مرتبہ بدقسمت اتفاق کے ہاتھوں ان کی کسی سماجی تقریب میں مڈبھیڑ ہوگئی، اور اس نے فوراً ہی گذشتہ واقعات کا ذکر کر کے یہ بات واضح کردی کہ اس کا میریک سے جسمانی تعلق رہ چکا ہے۔

وہ اس پر طیش میں آ گیا تھا۔

"اگر تم اس سے اتنی ہی شدید نفرت کرتے ہو، تو اس کے ساتھ معاشقہ کیوں کیا؟" ایک دوست نے ایک مرتبہ دریافت کیا۔

میریک نے یہ وضاحت کی کہ اُس زمانے میں وہ ایک بیس سالہ لونڈا تھا، عمر میں اُس سے سات سال کم۔ علاوہ ازیں، زدینا کا احترام کیا جاتا تھا، اسے سراہا جاتا تھا، وہ قادر المطلق تھی! زدینا نے اس کی مدد کی، اسے آگے بڑھایا، بااثر لوگوں سے متعارف کرایا!

"اچھا خاصا گو گیٹر (go-getter) تھا، یار! سمجھے؟" اس نے چلّا کر کہا۔ "ایک ہٹیلا، جوان گو گیٹر۔ اسی لیے اس کے ساتھ چپکا رہا۔ ہوا کرے بدصورت، میری بلا سے!"

9

میریک سچ نہیں بول رہا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ زدینا نے مشتر بوف کی موت پر آنسو ضرور بہائے تھے، لیکن پچیس سال پہلے اس کے بااثر لوگوں سے روابط وابط کچھ نہیں تھے اور اس حالوں نہیں تھی کہ خود اپنے ذریعۂ معاش کو بڑھاوا دے سکے، دوسروں کے کام آنے کا تو خیر کیا ذکر۔

تو پھر اسے یہ سب گھڑنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اس دروغ گوئی کی؟

میریک ایک ہاتھ سے کار چلا رہا تھا۔ اوپر عقبی آئینے پر نظر ڈالی تو خفیہ پولیس والوں کی کار دکھائی دی اور اچانک اس کے چہرے پر سرخی پھیل گئی۔ ایک بالکل ہی غیر متوقع یاد

ابھی ابھی عود کر آئی تھی۔

ایک عبقری کے انداز میں پہلی جفتی کرنے پر جب وہ پیٹ بھر کر اس پر لعن طعن کر چکی کی تو میریک نے ازالے کے طور پر اس کے سامنے برجستہ اور بے محابا شہوت کا مظاہرہ کرنا کی ٹھانی تھی۔ سو یہ بات درست نہیں تھی کہ وہ اس کے ساتھ اپنی ساری ہم بستریاں بھول گیا تھا! یہ والی اسے خوب یاد تھی۔ وہ اس پر نمائشی جنون کے ساتھ حرکت کر رہا تھا، لمبی سی غرّاتی ہوئی آواز نکال رہا تھا — ایسی ہی جیسے ایک کتّا مالک کے سلیپر سے جنگ کرتے وقت نکالتا ہے — اور (ہلکے پھلکے تعجب کے ساتھ) دیکھ رہا تھا کہ وہ اس کے نیچے کتنے سکون، ٹھنڈے مزاج، تقریباً لاتعلقی سے پسری ہوئی ہے۔

کار بیس سال پہلے کی اُس غراہٹ سے گونج رہی تھی، اس کی اطاعت شعاری اور غلامانہ جوش و خروش کی وہ کربناک آواز، مطابقت کرنے اور حالات کے مطابق خود کو ڈھالنے پر اپنی رضامندگی کی آواز، اس کی مضحکہ خیز صورتِ حال، اس کی بپتا۔

ہاں، یہ درست ہے۔ میریک حقیقت کا اعتراف کرنے کے بجائے اپنے کو ایک جرأت مند گو گیٹر ظاہر کرنے پر آمادہ تھا: اس نے بدصورت داشتہ پال رکھی تھی تو اس لیے کہ خوبصورت عورتوں کی جستجو کرنے کا پتّا نہیں تھا۔ زدینا اتنی ہی بلند تھی جتنا بلند وہ اس زمانے میں خود کو سمجھتا تھا۔ کمزور ارادہ اور مطلق ناداری — یہی وہ راز تھے جنھیں مخفی رکھنے کا وہ تمنائی تھا۔

کار شہوت کی طوفانی غراہٹ سے گونج رہی تھی، اس کو یہ بات قائل کرانے کی کوشش کر رہی تھی کہ زدینا محض ایک چھلاوہ تھی اور اگر وہ اپنی قابلِ تنفر جوانی کو بھلا دینے کا خواہش مند ہے تو اس چھلاوے کو مٹا دینا ہوگا۔

اس نے زدینا کے گھر کے پاس آ کر کار روک دی اور اس کا تعاقب کرنے والی کار اس کے پیچھے آ کر رک گئی۔

10

تاریخی واقعات عام طور پر ایک دوسرے کی بڑی بھونڈی نقالی کرتے ہیں، لیکن چیکوسلوواکیہ

میں، جیسا کہ میں دیکھتا ہوں، تاریخ نے ایسا تجربہ کیا جس کی مثال نہیں ملتی۔ عام نہج کے برخلاف، جس میں لوگوں کا ایک گروہ (طبقہ، قوم) دوسرے گروہ کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے، تمام لوگ (ایک پوری نسل) خود اپنی جوانی ہی کے خلاف بغاوت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔

ان کا مقصد یہ تھا اس عمل کو پھر گرفت میں لائیں اور سدھا لیں جو انھیں کا ساختہ تھا، اور وہ اس میں تقریباً کامیاب بھی ہوگئے۔ 1960 کی پوری دہائی میں ان کا اثر و رسوخ بڑھتا رہا اور 1968 کے شروع میں یہ کم و بیش اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ یہ وہی دور ہے جسے عام طور پر پراگ کا موسمِ بہار کہا جاتا ہے: آئڈل (idyll) کے محافظ ذاتی مکانوں میں لگے ہوئے پوشیدہ مائکروفون ہٹانے لگے، سرحدیں کھول دی گئیں، اور سُر باخ کے عظیم الشان کثیر الاصوات نغمے کی متعیّنہ ترتیب چھوڑ چھاڑ کر اپنے اپنے گیت الاپنے لگے۔ یہ جوش و خروش ناقابلِ یقین تھا۔ سچ مچ کے میلوں ٹھیلوں کا سماں بندھ گیا۔

روس جو سارے کرۂ ارض کے لیے اعلا ترین کثیر الاصوات نغمے کا موسیقار ہے، یہ برداشت نہ کرسکا کہ سُر اپنی دھن میں نکل پڑیں۔ 21 اگست 1968 کو اس نے پانچ لاکھ فوجیوں کا لشکر بوہیمیا کے علاقے میں اتار دیا۔ چند دنوں بعد ایک لاکھ بیس ہزار چیک ترکِ وطن کر گئے، اور پیچھے رہ جانے والوں میں سے کوئی پانچ لاکھ کو نوکری چھوڑ کر عام مشقت طلب کام اختیار کرنے پڑے، مضافات میں، الگ تھلگ واقع کارخانوں کی کنوئیر بیلٹ پر، یا ٹرک کے اسٹیرنگ وہیل کے پیچھے — دوسرے لفظوں میں، ایسی جگہوں اور نوکریوں پر جہاں کوئی کبھی ان کی آواز نہ سن سکے۔

اور یہ خاطر جمع کر لینے کے لیے کہ کسی ناخوشگوار یاد کا سایہ بھی اس تازہ جلا بخشی ہوئی آئڈل کو مضطرب کرنے نہیں وارد ہوگا، پراگ کے موسم بہار اور قوم کی تابناک تاریخ پر کلنک کی مانند روسی ٹینکوں دونوں کو منسوخ کر دینا ضروری تھا۔ نتیجے میں، چیکوسلوواکیہ میں کوئی تنفّس بھی 21 اگست نہیں مناتا ہے، اور ان لوگوں کے نام جو اپنے ہی شباب کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ قوم کے حافظے سے مٹا دیے گئے ہیں، جیسے اسکول کے کام میں کی گئی غلطی مٹا دی جاتی ہے۔

ایسے مٹا دیے جانے والے ناموں میں میریک بھی تھا۔ وہ میریک جو اِس وقت زدینا

کے دروازے تک پہنچنے کے لیے زینہ چڑھا رہا تھا حقیقت میں صرف ایک سفید داغ تھا، کسی بمشکل نظر آنے والے خلا کا ٹکڑا جو بل کھاتا زینہ چڑھتا ہوا آ رہا تھا۔

11

وہ زدنیا کے سامنے بیٹھا ہوا ہے، اس کی بانہہ گوپھل میں پڑی جھول رہی ہے۔ زدینا دوسری طرف متوجہ ہے، اس سے نظریں کترا رہی ہے، برجستہ روانی سے بول رہی ہے۔

"مجھے نہیں معلوم کہ تم کس لیے آئے ہو، لیکن میں تمھارے یہاں آنے سے خوش ہوں۔ میں پارٹی کے بعض لوگوں سے گفت وشنید کرتی رہی ہوں۔ تمھارا یوں تعمیری عملے کے ساتھ لگے بندھے کام پر زندگی گزارنا دیوانگی ہے۔ پارٹی نے اپنے دروازے تم پر بند نہیں کرلیے ہیں۔ یہ میں یقین سے جانتی ہوں، کامل یقین سے۔ اب بھی وقت ہے۔"

وہ اس سے پوچھتا ہے کہ کیا کرے۔

"ایک پیشی طلب کرو۔ تمھیں اس معاملے میں خود ہی پہل کرنی ہوگی۔"

وہ سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ کس طرف ہے۔ یہ ان کا اُس سے یہ کہنے کا انداز تھا کہ ایک آخری پانچ منٹ کی رعایتی مدت اسے دی جارہی ہے کہ باہر آکر اپنی ہر بات اور عمل سے تائب ہوجائے۔ اسے ان کے کھیل کا علم تھا: لوگوں کو ان کے ماضی کے عوض مستقبل بیچنا۔ وہ اسے ٹیلی وژن پر آکر قوم کے سامنے تاسف اور ندامت کے ساتھ یہ بیان دینے پر مجبور کریں گے کہ جب اس نے روس اور بلبلوں کے خلاف وہ ترش وتلخ باتیں کہی تھیں تو کتنی شدید غلطی پر تھا۔ وہ اسے اپنی زندگی کی مذمت کرنے پر مجبور کریں گے؛ ایک سایہ بن جانے پر، ایسا آدمی بن جانے پر جس کا کوئی ماضی نہیں تھا، ایک اداکار جس کے لیے کوئی کردار نہیں تھا؛ اس زندگی کو بھی جس کی مذمت کررہا ہے ایک سایہ بنا دینے پر، وہ کردار بن جانے پر جسے اس کے اداکار نے چھوڑ دیا ہے۔ صرف سایہ بنا کر ہی وہ اسے زندہ رہنے دیں گے۔

وہ نگاہیں زدینا پر جمائے رکھتا ہے۔ وہ اتنی تیزی سے کیوں بول رہی ہے؟ اس قدر بے چین کیوں ہے؟ دوسری طرف کیوں دیکھ رہی ہے، آنکھیں کیوں پھیرے ہوئے ہے؟

بالکل صاف بات ہے: وہ اس کے لیے ایک دام بچھا رہی ہے۔ وہ پارٹی یا پولیس کے احکام پر عمل کر رہی ہے۔ اس کے ذمے یہ کام لگایا گیا ہے کہ میریک کے گھٹنے ٹکوا دے۔

12

لیکن میریک غلطی کر رہا ہے! کسی نے بھی زدینا کو اس سے گفت وشنید کا اختیار نہیں دیا ہے۔ خواہ وہ کتنا ہی کیوں نہ گڑگڑائے، ادنیٰ سا اختیار رکھنے والا کوئی شخص بھی کبھی اسے ساعت کا موقع نہیں دے گا۔ اب اس کا وقت نکل چکا ہے۔

اپنے حالات سدھارنے کے لیے اگر زدینا اس سے ہاتھ پانو مارنے کا تقاضا کر رہی ہے، اگر وہ یہ مشورہ دراصل پارٹی کے بالا ترین عہدیداروں کے ایما پر دے رہی ہے، تو اس کی وجہ اس کی مدد کرنے کی خود زدینا کی کوئی الجھی ہوئی اور پراگندہ خواہش ہے۔ اگر وہ اس قدر دھواں دار باتیں کر رہی ہے اور اس سے نظریں چار کرتے ہوئے گھبرا رہی ہے، تو اس کی وجہ کوئی چال وال نہیں ہے جو گرہ میں دبائے بیٹھی ہو بلکہ یہ کہ اس کے اختیار میں کچھ بھی نہیں۔

کیا میریک اسے کبھی سمجھ سکا ہے؟

اس نے ہمیشہ یہی خیال کیا تھا کہ پارٹی سے زدینا کی اتنی شدید وفاداری کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک سیاسی انتہا پسند تھی۔

اس کا قیاس غلط تھا۔ پارٹی سے وفاداری کی وجہ اس کی میریک سے محبت تھی۔

جب اس نے زدینا کو چھوڑ دیا تو زدینا صرف یہی چاہتی تھی کہ ثابت کر دکھائے کہ وفاداری ہی ارفع ترین قدر ہے۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ میریک 'ہر اعتبار سے' بے وفا اور وہ 'ہر اعتبار سے' وفادار رہی ہے۔ جو دیکھنے میں سیاسی انتہا پسندی معلوم ہوتا تھا وہ محض وفاداری کا ایک عذر، ایک حکایت، ایک منشور تھا، ایسی محبت کا در پردہ گلہ جو مساوی گرم جوشی سے لوٹائی نہ گئی ہو۔

میں اسے چشمِ تصور میں دیکھ سکتا ہوں کہ اگست کی ایک صبح طیاروں کی لرزہ خیز گھن

گرج سے جگ پڑی ہے۔ دوڑ کر سڑک پر نکل آتی ہے، اور لوگ بڑی دہشت کے ساتھ اسے بتاتے ہیں کہ روسی فوج نے بوہیمیا پر قبضہ کرلیا ہے۔ وہ ہذیانی قہقہہ لگاتی ہے۔ روسی ٹینک سارے کافروں کو سزا دینے آئے ہیں! بالآخر وہ اپنی آنکھوں سے میریک کا زوال دیکھے گی! بالآخر وہ اسے اپنے گھٹنے ٹیکتے ہوئے دیکھے گی! بالآخر وہ اس پر جھک سکے گی — اور جیسا کہ وہ وفاداری کی قدر و قیمت خوب جانتی ہے — اور اس کی مدد کر سکے گی۔

میریک نے اس گفتگو کو بڑی بیدردی سے ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے جو ابتدا ہی سے غلط سمت میں چل پڑی ہے۔

"یاد ہیں وہ سارے خط جو میں نے تمھیں لکھے تھے؟ یہ مجھے واپس چاہییں۔"

"خط؟" وہ پوچھتی ہے، حیرانی سے اوپر دیکھتے ہوئے۔

"ہاں، میرے خط۔ کم از کم سو تو بھیجے ہوں گے۔"

"اچھا وہ خط،" وہ کہتی ہے۔ "اب یاد آیا۔" اچانک اسے میریک کی آنکھیں نظر آ گئی ہیں اور وہ ٹھیک ان میں دیکھ رہی ہے، میریک کو یہ ناخوشگوار احساس ہوتا ہے کہ وہ ٹھیک اس کی روح کی گہرائیوں میں دیکھ سکتی ہے اور ٹھیک ٹھیک جانتی ہے کہ وہ کیا چاہتا ہے اور کیوں چاہتا ہے۔

"ہاں، ظاہر ہے۔ تمھارے خط،" وہ دہراتی ہے۔ "میں ابھی ابھی انھیں دوبارہ پڑھ رہی تھی۔ کون یقین کرسکتا تھا کہ تم اتنے ہیجانی جذبوں کے مالک ہو۔"

وہ "ہیجانی جذبوں" کے لفظ کئی مرتبہ اور استعمال کرتی ہے، اور اچانک اس کا تکلم اتنا ہی آہستہ رو اور سوچا سمجھا ہے جتنا پہلے تیز رو اور اضطراری تھا۔ معلوم ہوتا ہے وہ کسی ہدف کا نشانہ لے رہی ہے جسے مار گرانے کا تہیہ کیے بیٹھی ہے، اور یہ یقین کر لینے کے لیے کہ نشانہ ہدف پر لگتا ہے وہ نظریں اس پر جمائے رکھتی ہے۔

13

پلاسٹر چڑھا بازو سینے پر آگے پیچھے جھولتا رہا، اور اس کا چہرہ یوں تمتمایا ہوا تھا جیسے تھپڑ پڑا ہو۔

ہاں، اس کے خط بے حد جذباتی رہے ہوں گے۔ اس کے پاس اور کوئی چارہ بھی کہاں تھا۔ یہ تو اسے ثابت کرنا ہی تھا کہ زدینا سے اس کے تعلق کی وجہ محبت ہی تھی، کوئی کمزوری اور غربت نہیں۔ اور صرف ایک مبالغہ آمیز جذبہ ہی اتنی شدید بدصورت لڑکی سے معاشقے کو برحق ثابت کر سکتا تھا۔

"یاد ہے، تم جد و جہد میں مجھے اپنا فوجی ساتھی کہا کرتے تھے؟"

اگر انسانی طور پر یہ ممکن ہوتو اس کی سرخی ایک درجہ اور گہری پڑ گئی۔ وہ لاتحاشا مضحکہ خیز لفظ "جد و جہد۔" آخر ان کی جد و جہد کن باتوں پر مشتمل تھی؟ لاتمناہی جلسے اور گئے پڑی پیٹھیں۔ لیکن جب وہ آخر کار ایک انقلابی بیان دینے کے لیے کھڑے ہو ہی گئے (طبقاتی دشمن سخت تر عقوبت کا مستحق ہے، اِس یا اُس خیال کو اور زیادہ جامع بنانے کی ضرورت ہے) تو کسی رزمیہ پینٹنگ کے پیکر نظر آ رہے تھے: وہ زمین پر گرا جا رہا ہے، پستول بہ کف، بازو سے خون کی دھاریں ابلی پڑ رہی ہیں، جبکہ وہ، ذرا چھوٹے سائز کی پستول ہاتھ میں لیے آگے اس مستقبل کی طرف بڑھتی چلی جا رہی ہے جسے دیکھنے کے لیے میریک زندہ نہیں رہے گا۔

یہ زمانہ تھا جب اس کی جلد پر عنفوانِ شباب کے بعد کے مہاسوں کے نشان ابھی تک پڑے ہوئے تھے، اور انھیں چھپانے کی کوشش میں اس نے بغاوت کا نقاب چڑھا لیا تھا۔ وہ سبھوں سے کہتا پھرتا کہ وہ اپنے مالدار کاشتکار باپ سے علاحدہ ہو گیا ہے اور صدیوں پرانے دیہاتی رسم و رواج سے غایت درجے کی نفرت کرتا ہے جن کی بنیاد زمین اور ملکیت پر ہے۔ وہ جھگڑے اور گھر سے اپنے ڈرامائی اخراج کا ذکر کرتا۔ ان تمام باتوں میں صداقت کا ادنیٰ سا شائبہ بھی نہیں تھا۔ اب جبکہ پیچھے مڑ کر ان کی طرف نظر ڈالتا ہے تو اسے کہانیوں اور دروغ و ریا کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

"تم اس زمانے میں بالکل مختلف تھے،" زدینا کہتی ہے۔

وہ خطوں کے بنڈل لیے زدینا کے گھر سے نکلنے کا تصور کرتا ہے۔ قریب ترین ردّی کی ٹوکری کے پاس پہنچ کر رک جاتا ہے، بنڈل کو دو انگلیوں سے متلاتے ہوئے یوں اٹھاتا ہے جیسے گُو سے سَنے ہوں، اور ٹوکری میں ڈال دیتا ہے۔

14

"آخر تم خطوں کا کیا کرو گے؟" اس نے پوچھا۔ "کیوں انھیں واپس لینا چاہتے ہو؟"

ظاہر ہے وہ زدینا سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ انھیں ردی کی ٹوکری میں پھینکنا چاہتا ہے، سو اس نے افسردہ سا لہجہ اختیار کیا اور بولنا شروع کیا کہ اب وہ اُس عمر کو پہنچ گیا ہے جب آدمی پیچھے مڑ کر اپنی زندگی کا جائزہ لیتا ہے۔

(یہ ساری کارروائی اسے بے حد مضطرب کر رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی کہانی ناقابلِ یقین لگ رہی ہو، اسے خجالت ہو رہی تھی۔)

ہاں، وہ پیچھے مڑ کر ضرور دیکھ رہا تھا، لیکن اس لیے کہ اب اسے اور یاد نہیں رہا تھا کہ جوانی کے دنوں میں وہ کیسا تھا۔ اسے بہرحال یہ معلوم تھا کہ وہ گمراہ ہو گیا تھا۔ اپنی ابتدا کی طرف مراجعت کی وجہ یہ تھی کہ معلوم تو ہو آخر غلطی کس مقام پر ہوئی تھی۔ زدینا سے مراسلت کا جائزہ لینے کی وجہ اپنی جوانی کے اسرار، اپنی ابتدا، اپنے نقطۂ انحراف کو جان لینے کی خواہش تھی۔

زدینا نے انکار میں سر ہلا دیا۔ "یہ میں کبھی واپس نہیں کروں گی۔"

"صرف مستعار مانگ رہا ہوں،" اس نے جھوٹ بولا۔

وہ انکار میں سر ہلاتی رہی۔

وہ یہ سوچنے سے باز نہ رہ سکا کہ خط یہیں اپارٹ مینٹ میں تھے، ان تک بہ آسانی پہنچا جا سکتا تھا، اور کہ وہ انھیں کسی وقت بھی اور کسی کو بھی پڑھنے کے لیے دے سکتی تھی۔ میریک کے لیے یہ خیال ہی ناقابلِ برداشت تھا کہ اس کی زندگی کا ایک ٹکڑا پیچھے زدینا کی گرفت میں رہ گیا ہے، اور اس کا جی چاہا کہ ان کے درمیان کافی کی میز پر رکھی ہوئی وزنی ایش ٹرے اٹھا کر اس کا سر پاش پاش کر ڈالے اور خط لے کر بھاگ جائے۔ اس کے بجائے، اس نے پلٹ کر دیکھنے اور اپنی ابتدا کی بابت اپنی احتیاج کی کہانی دہرا دی۔

اس نے سر اٹھا کر میریک کو دیکھا اور نگاہوں سے اسے خاموش کر دیا۔ "میں یہ تمھیں کبھی نہیں دوں گی۔ کبھی نہیں۔"

15

جب وہ اسے رخصت کرنے اپنے اپارٹ مینٹ کے دروازے تک آئی، دونوں کاریں آگے پیچھے دروازے کے سامنے کھڑی تھیں۔ خفیہ ایجنٹ سڑک کی دوسری جانب گشت لگا رہے تھے۔ جب انھوں نے میریک اور زدینا کو باہر آتے دیکھا تو ٹھہر گئے۔

"یہ دو اصحاب،" وہ ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا، "تمام وقت میرا تعاقب کرتے رہے ہیں۔"

"واقعی؟" اس نے مشتبہ انداز میں کہا۔ "سبھی تمھاری پکڑ دھکڑ میں لگے ہوئے ہیں، کیوں ٹھیک ہے نا؟" اس کی آواز سے کچھ زیادہ ہی طنز ٹپک رہا تھا۔

وہ اتنی کلبیت زدہ کیسے ہوسکتی تھی کہ اس سے کھلے بندوں کہے کہ وہ دو آدمی جو انہیں اس قدر نمایاں رعونت سے گھور رہے تھے بس چہل قدمی پر نکلے ہوئے تھے؟

اس کی صرف ایک ہی توجیہ کی جاسکتی تھی: یہی کہ وہ ان کا کھیل کھیل رہی تھی، ایسا کھیل جس میں سب سے یہ فرض کرنے کے لیے کہا جاتا ہے کہ خفیہ پولیس کا کوئی وجود نہیں اور کسی پر بھی جور و ستم نہیں ہوئے ہیں۔ اس دوران میں ایجنٹ سڑک عبور کر چکے تھے، اور میریک اور زدینا نے انھیں کار میں سوار ہوتے ہوئے دیکھا۔

"خدا حافظ،" میریک بولا، زدینا پر پھسلتی سی نگاہ بھی ڈالے بغیر۔ وہ اسٹیئرنگ وہیل کے پیچھے جا بیٹھا۔ عقبی آئینے میں اسے ایجنٹ اپنے تعاقب میں روانہ ہوتے ہوئے نظر آئے۔ اسے زدینا نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ اسے دوبارہ کبھی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

اسے یہ احساس نہیں تھا کہ وہ فٹ پاتھ پر کھڑی دیر تک اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی ہے۔ اور اس کے چہرے پر خوف و ہراس طاری ہے۔

نہیں، زدینا کا سڑک پار کھڑے ان آدمیوں کی حقیقت سے انکار کلبیت نہیں تھی۔ چیزیں اس کی بساط سے زیادہ سنگین ہوتی جارہی تھیں۔ وہ حقیقت کو میریک سے پوشیدہ رکھنا چاہتی تھی اور خود اپنی ذات سے بھی۔

16

جانے کہاں سے ایک سرخ رنگ کی برق رفتار اسپورٹس کار آ ٹپکی اور میریک اور خفیہ ایجنٹوں کی کار کے بیچ میں آ گئی۔ میریک نے کار کی رفتار تیز کر دی۔ وہ بس اب ایک چھوٹے سے شہر میں داخل ہونے ہی والے تھے۔ سڑک میں ایک موڑ پڑتا تھا۔ میریک کو اندازہ ہوا کہ وہ اپنے متعاقبین کے حلقۂ نظر سے نکل آیا ہے اور فوراً ہی بغلی راستے میں غوطہ مار گیا۔ اس کے بریک چنگھاڑے اور ایک چھوٹا سا بچہ جو سڑک پار کرنے ہی والا تھا عین وقت پر جست لگا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے عقبی آئینے میں دیکھا کہ سرخ کار زناٹے بھرتی ہوئی شاہراہ پر آگے نکل گئی ہے۔ ایجنٹوں کی گاڑی کے ظاہر ہونے سے پہلے وہ ایک اور سڑک پر مڑ گیا۔ اس نے ان سے پیچھا چھڑا لیا تھا۔

شہر سے نکلنے کے لیے اس نے جو سڑک اختیار کی وہ ایک بالکل ہی مختلف سمت میں جاتی تھی۔ اب کوئی اس کے تعاقب میں نہیں تھا؛ سڑک خالی پڑی تھی۔

اس نے ایجنٹوں کا تصور کیا کہ ہر طرف اسے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں، خوفزدہ کہ ان کا بوس ان کی خوب خبر لے گا۔ وہ خوب زور زور سے ہنسنے لگا۔ اس نے کار کی رفتار کم کر دی اور کھیتوں کا نظارہ کرنے لگا، وہ عمل جو اس نے حقیقت میں اس سے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ ہمیشہ ہی کسی چیز کے انتظام یا کسی چیز پر بات چیت کرنے کے لیے جاتے ہوئے وہ مکان کو ایک منفی قدر تصور کرنے لگا تھا، وقت کا ضیاع، اس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ۔

اس کے تھوڑے سے آگے سرخ اور سفید دھاریوں والے دو جنگلے آہستہ آہستہ نیچے آ رہے تھے۔ اس نے کار روک دی۔

اسے اچانک بے حد تھکن محسوس ہونے لگی۔ آخر اسے زدینا سے جا کر ملنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ وہ خط واپس کیوں لے لینا چاہتا تھا؟

اسے یہ پورے کا پورا سفر سخت احمقانہ، بے معنی، اور بچکانہ معلوم ہوا۔ یہ کسی منصوبے کا نتیجہ نہیں تھا، نہ کسی عملی تدبیر کا، بس بے قابو ترغیب ہی تھی، دور ماضی میں پہنچنے اور اسے گھونسا مار کر پاش پاش کر دینے کی ترغیب، اپنی جوانی کے کینوس کے چیتھڑے اڑا دینے کی، ایسی منہ

زور ترغیب جس وہ قابو میں نہ رکھ سکا اور جو اب نا آسودہ ہی رہے گی۔

وہ بے حد تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ اب وہ اُن قابلِ مواخذہ دستاویزات کو اپنے اپارٹ مینٹ سے نہیں ہٹا سکے گا۔ وہ ان کی نظر میں تھا، اور وہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑنے والے تھے۔ اس کام کو انجام دینے میں اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ ہاں، ہر بات کے لیے دیر ہو چکی تھی۔

فاصلے میں دور اسے ریل گاڑی کی چھک چھک سنائی دی۔ جنگلے کے قریب چھوٹے سے مکان کے پاس کوئی عورت سر پر سرخ رنگ کا رومال باندھے کھڑی ہوئی تھی۔ ریل گاڑی قریب آئی، یہ سست رفتار مقامی گاڑی تھی۔ ایک بوڑھا، ہاتھ میں پائپ لیے، کھڑکی سے جھکا اور تھوک دیا۔ پھر اسٹیشن کی گھنٹی بجی، اور سرخ رومال والی عورت جنگلوں کے قریب گئی اور دھری کو گھمایا۔ جنگلے اوپر اٹھنے لگے اور میریک نے کار اسٹارٹ کی۔ وہ کار چلاتا ہوا ایک گانو میں پہنچا، لمبی سڑک جو اسٹیشن پہنچ کر ختم ہو رہی تھی — ایک چھوٹی سی، پستہ قد، سفید عمارت جس کی لکڑیوں والی باڑھ سے اسے پلیٹ فارم اور ریل کی پٹریاں نظر آ رہی تھیں۔

17

اسٹیشن گھر کی کھڑکیاں بگونیا کے گملوں سے آراستہ تھیں۔ میریک کار روک دیتا ہے۔ اسٹیرنگ وہیل کے پیچھے بیٹھے بیٹھے گھر اور کھڑکیوں اور سرخ رنگ کے پھولوں کو دیکھتا ہے۔ بھولے بسرے زمانوں سے ایک اور سفید رنگ کا گھر یاد میں نمودار ہوتا ہے، ایک اور سفید گھر جس کی کھڑکیوں کی سِلوں پر بگونیا کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ یہ گرمیوں کی تعطیل میں پہاڑی گانو کا چھوٹا سا ہوٹل ہے۔ لمبی سی ناک کھڑکی کے پھولوں کے پیچھے سے جھانکتی ہے، اور بیس سالہ میریک اوپر ناک کی طرف دیکھتا ہے اور بیکراں محبت محسوس کرتا ہے۔

پہلے پہل اسے یہ تحریک ہوتی ہے کہ گیس پیڈل کو زور سے دبا کر اس یاد سے بھاگ نکلے۔ لیکن اِس بار مَیں اسے اپنے ساتھ دھوکا نہیں کرنے دوں گا، میں اس یاد کو لوٹا لاؤں گا اور کچھ دیر تک باقی رہنے دوں گا۔ سو میں دہراتا ہوں: یہ زدینا کا چہرہ اور بڑی سی ناک ہے جو کھڑکی میں بگونیا کے پھولوں کے درمیان ابھر رہی ہے، اور میریک کو بیکراں محبت محسوس

ہوتی ہے۔

کیا یہ ممکن ہے؟

بالکل ہے، اور کیوں نہ ہو؟ کیا کمزور آدمی کسی بدصورت عورت کے لیے سچی محبت نہیں محسوس کرسکتا؟

وہ اسے اپنے رجعت پسند باپ سے بغاوت کرنے کا بتاتا ہے، وہ عبقریوں کے خلاف لعن طعن کرتی ہے: ان کے پچھلے حصوں پر گٹے پڑ گئے ہیں اور وہ ایک دوسرے کے ہاتھ تھامتے ہیں، ساتھ ساتھ جلسوں میں شریک ہوتے ہیں، اپنے چیک رفیقوں کی مخبری کرتے ہیں، جھوٹ سے کام لیتے ہیں، اور جفتی کرتے ہیں۔ وہ مشتر بوف کی موت پر آنسو بہاتی ہے، وہ اس کے اوپر پڑا ہوا کسی پاگل کتے کی طرح غراتا ہے، اور وہ ایک دوسرے کے بغیر گزارہ نہیں کر سکتے ہیں۔

وہ وجہ جس کی بنا پر میریک اس کی تصویر اپنی زندگی کی ایلبم سے نکال دینا چاہتا ہے یہ نہیں تھی کہ اس نے زدینا سے محبت نہیں کی تھی، بلکہ یہ کہ اس نے کی تھی۔ اسے اپنی یاد سے مٹا دینا، اس سے اپنی محبت کو مٹا دینا تھا۔ اس نے اس کو تصویر سے اسی طرح مٹا دیا تھا جس طرح پارٹی کے پروپیگنڈائی شعبے نے کلے مینتس کو اس بالکونی سے مٹا دیا تھا جہاں سے گوت والت نے اپنا تاریخی خطاب دیا تھا۔ میریک بھی تاریخ کو اتنا ہی نئے سرے سے لکھنے والا ہے جتنا کہ کمیونسٹ پارٹی ہوتی ہے، جتنا کہ ساری سیاسی جماعتیں، ساری قومیں، سارے لوگ ہوتے ہیں۔ لوگ ہمیشہ یہی نعرے لگاتے ہیں کہ ایک بہتر مستقبل تخلیق کرنے کے خواہاں ہیں۔ اور یہ سچ نہیں ہے۔ مستقبل تو وہ بے حس خلا ہے جس میں کسی کو دلچسپی نہیں۔ ماضی زندگی سے لبریز ہے، ہمیں مشتعل کرنے کا مشتاق، ہمیں بھڑکانے اور ہماری اہانت کرنے کا، ہمیں یہ ترغیب دلانے کا کہ یا تو اسے نیست و نابود کردیں یا از سرنو تعمیر کریں۔ مستقبل کے مالک بننے کی تنہا وجہ یہی ہے کہ لوگ اپنے ماضی کو بدل دینا چاہتے ہیں۔ وہ ان تجربہ گاہوں میں داخلے کے لیے لڑ رہے ہیں جہاں تصویروں کے نوک پلک سنوارے جاتے ہیں، جہاں سوانح اور تاریخیں دوبارہ لکھی جاتی ہیں۔

وہ یہاں اسٹیشن پر کتنی دیر ٹھہرا رہا؟

یہاں اس کے ٹھہرنے کے کیا معنی نکلتے ہیں؟
کچھ بھی نہیں۔

ایک دن وہ اسے اپنی یاد سے مٹا دیتا ہے اور بگونیا والے سفید گھر کو یکسر فراموش کر دیتا ہے۔ وہ اب پھر دیہاتی علاقے سے فرّاٹے کے ساتھ کار چلاتا ہوا نکلا جا رہا ہے، دائیں بائیں نظر ڈالے بغیر۔ بارِدگر خلا اس کی ترقی کی راہ میں محض ایک رکاوٹ سے زیادہ نہیں۔

18

وہ جس کار سے پیچھا چھڑا چکا تھا اس کے گھر کے سامنے کھڑی تھی۔ دونوں آدمی اس سے تھوڑے فاصلے پر کھڑے ہوئے تھے۔

اس نے اپنی کار ان کی گاڑی کے پیچھے کھڑی کردی اور باہر نکلا۔ انھوں نے تقریباً شگفتہ مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا، یوں جیسے کہ میریک کا انھیں جُل دے جانا ایک ہلکی پھلکی سی شرارت ہو جس میں وہ سب ساتھ شریک رہے ہوں۔ جب وہ ان کے قریب سے گزرا، تو موٹی گردن اور سفید لہریے دار بال والا ہنسنے لگا اور سلام کے طور پر سر کو جنبش دی۔ اس بے تکلفی کے اظہار پر ایک فوری تشویش نے میریک کو آ لیا۔ یہ کہیں زیادہ بے تکلفانہ تعلقات کی آمد کی نوید دے رہی تھی۔

وہ جھجکے بغیر گھر کی طرف بڑھا اور کنجی لگا کر اپارٹ مینٹ کا دروازہ کھولا۔ سب سے پہلی چیز جو نظر آئی وہ اس کے بیٹے کا چہرہ تھا جو دبے دبے اضطرب سے بھرا ہوا تھا۔ ایک چشما چڑھا اجنبی قدم بڑھاتا ہوا میریک کے پاس آیا اور اپنی شناخت کرائی۔ "سرکاری وکیل کا جاری کیا ہوا تلاشی کا وارنٹ دیکھنا چاہتے ہو؟"

"ہاں،" میریک نے کہا۔

اپارٹ مینٹ میں دو آدمی اور تھے۔ ایک ڈیسک کے پاس کھڑا ہوا تھا، جس پر کاغذات، نوٹ بکس، اور کتابوں کا اونچا سا انبار لگا ہوا تھا۔ وہ انھیں ایک ایک کر کے اٹھاتا جا رہا تھا، دریں اثنا دوسرا آدمی، جو ڈیسک کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا، اس کا کہا نقل کرتا جا رہا تھا۔

چشمے والے نے سینے کی جیب سے تہہ کیا ہوا کاغذ نکال کر میریک کو تھما دیا۔ "یہ رہا تلاشی کا وارنٹ، اور،" اس نے دوسرے دونوں آدمیوں کی طرف اشارہ کیا، "وہ رہی ان اشیا کی فہرست جو ہم ضبط کر رہے ہیں۔"

فرش پر ہر طرف کاغذات اور کتابیں بکھری ہوئی تھیں، الماریوں کے دروازے پھٹاس کھلے تھے، اور فرنیچر دیواروں کے پاس سے کھسکا ہوا تھا۔

میریک کے بیٹے نے اس کی طرف جھک کر کہا، "یہ یہاں تمھارے جانے کے پانچ منٹ بعد آئے تھے۔"

ڈیسک کے پاس والے آدمی اپنی فہرست سازی میں منہمک رہے: میریک کے دوستوں کے خطوط، روسی قبضے کے اولین دنوں کی دستاویزات، سیاسی صورتِ حال کے جائزے، جلسوں کی روداد، اور چند کتابیں۔

"معلوم نہیں ہوتا کہ تم اپنے دوستوں کی بہت زیادہ پروا کرتے ہو،" چشمے والے نے ضبط شدہ اشیا کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلا کر کہا۔

"تمھیں آئین کے خلاف کوئی چیز نہیں ملے گی،" میریک کے بیٹے نے کہا۔ میریک اپنے الفاظ کو پہچان گیا۔

چشمے والا بولا کہ کیا آئین کے خلاف جاتا ہے اور کیا نہیں کا فیصلہ عدالت کرے گی۔"

19

ترکِ وطن کرنے والے (اور یہ تعداد میں ایک لاکھ بیس ہزار ہیں) اور وہ جنھیں خاموش اور ملازمتوں سے برطرف کر دیا گیا ہے (کوئی پانچ لاکھ) دھند میں داخل ہوتے ہوئے جلوس کی طرح معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ اب دکھائی نہیں دیتے اور بھلا دیے گئے ہیں۔

لیکن جیل خانہ، اگرچہ یہ ہر طرف سے دیواروں میں گھرا ہوا ہے، تاریخ کی بڑے شاندار طور پر روشن تماشا گاہ ہے۔

میریک یہ بات زمانوں سے جانتا ہے۔ پورا سال اسے جیل خانے کا خیال ناقابلِ

مزاحمت طور پر کشش انگیز معلوم ہوا ہے، بالکل اسی طرح جیسے فلوبیئر کو یقیناً مادام بوواری کی خودکشی پُرکشش معلوم ہوئی تھی۔ نہیں، میریک کو اپنی زندگی کی کہانی کا اس سے بہتر اختتام نہیں مل سکتا تھا۔

وہ انسانی حافظے سے لکھوکھا زندگیوں کو مٹا دینا چاہتے تھے اور صرف ایک بے داغ عہد کی ایک بے داغ آئڈل ہی کو باقی رہنے دینا چاہتے تھے۔ لیکن میریک ان کی آئڈل پر ایک کلنک کی طرح اپنے پورے قد سے پسر جانا چاہتا تھا۔ اور وہیں رہنا چاہتا تھا، گوت والت کے سر پر کلیمینتس کی ٹوپی کی طرح۔

انھوں نے ضبط شدہ اشیا کی فہرست پر میریک سے دستخط کروائے اور پھر اسے اور بیٹے کو ساتھ آنے کے لیے کہا۔ ایک سال کی تفتیشی حراست میں رکھنے کے بعد اسے عدالت میں پیش کیا گیا۔ میریک کو چھ سال کی سزا ہوئی، بیٹے کو دو سال کی، اور ان کے دس کے لگ بھگ رفیقوں کو ایک سے چھ سال کی میعاد کی۔

دوسرا حصہ

ماں

1

ایک زمانے میں مَرکیتا (Marketa) کو ساس اچھی نہیں لگتی تھی۔ جن دنوں وہ اور کرل (Karel)، کرل کے خاندان کے ساتھ رہ رہے تھے (اُن دنوں سسر ابھی زندہ تھا)، تو روز ہی اس کی ساس سے جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ ساس بے حد دشمنی کرتی اور بات بے بات برا ماننے پر پر تُلی رہتی۔ یہ دونوں کی برداشت سے باہر تھا اور وہ کسی دوسری جگہ منتقل ہو گئے۔ "ماں سے جتنی دور ممکن ہو سکے" ان دنوں ان کا نعرہ تھا۔ ملک کے دوسرے سرے کے شہر میں انھوں نے مکان لے لیا اور اب سال میں ایک مرتبہ ہی کرل کے والدین سے ملاقات ہوتی، اور یہ بھی کوئی طے نہیں تھا۔

پھر ایک دن سسر آنجہانی ہوگیا، اور ماں اکیلی رہ گئی۔ انھوں نے اسے تجہیز و تکفین کے موقعے پر دیکھا۔ وہ لاغر اور بڑی بری حالت میں تھی اور انھیں پہلے کے مقابلے میں سکڑی ہوئی لگی۔ دونوں کو ایک ہی خیال آ رہا تھا: اب تم یہاں اکیلی نہیں رہ سکتیں — ہمارے ساتھ آ کر رہو۔

دونوں کو ایک ہی خیال آ رہا تھا، لیکن صاف کہہ دینے کی ہمت ایک کو بھی نہیں ہوئی۔ خاص طور پر جنازے کے بعد والے دن ان کے ساتھ اس گمبھیر سیر کے دوران، برے حالوں اور سکڑی ہوئی ہونے کے باوجود، ماں نے ایکو ایک گناہ کی بابت انھیں با قاعدہ لیکچر دے ڈالا تھا جس کے وہ کبھی اس کے خلاف مرتکب ہوئے تھے — اور وہ بھی اتنی سختی سے جو انھیں بالکل غیر موزوں معلوم ہوئی۔ "یہ نہیں بدلنے والی،" جب وہ ریل گاڑی میں تنہا رہ گئے تو کرل نے مَرکیتا سے کہا۔ "دکھ کی بات ضرور ہے لیکن 'ماں سے دور' پر اب بھی قائم رہنا ہوگا۔"

لیکن سال گزرتے گئے اور یہ درست ہے کہ ماں بدل کر نہ دی، مَرکیتا ضرور بدل گئی تھی، کیونکہ اسے یکبارگی محسوس ہوا کہ وہ ساری باتیں جو ساس نے اسے دکھ دینے کے لیے کی تھیں حقیقت میں بالکل بے ضرر اور احمقانہ تھیں اور اگر کوئی غلطی پر تھا تو یہ 'وہ خود' تھی جس نے چند سخت سی باتوں کو اتنی زیادہ اہمیت دے دی تھی۔ اُس وقت تک وہ ماں کو یوں دیکھتی رہی تھی جیسے بچہ بالغ کو دیکھتا ہے، لیکن اب ان کے رول الٹ گئے تھے: مَرکیتا بالغ تھی، اور ماں، کم از کم اگر فاصلے سے دیکھا جائے، ایک چھوٹی سی بے کس بچی۔ اسے درگزر اور تحمل کی لہر اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی، یہاں تک کہ اس نے ساس سے خط و کتابت بھی شروع کر دی۔

بڑھیا پر اس کا فوری اثر ہوا، بڑی حق شناسی سے اسے جواب دینے لگی اور مَرکیتا سے اور زیادہ خط لکھنے کا مطالبہ کیا۔ بس صرف انھیں کے سہارے اکیلے زندہ رہنا قابلِ برداشت ہے، اس نے دعویٰ کیا۔

وہ خیال جو کرل کے باپ کی تجہیز و تکفین کے موقعے پر متشکل ہوا تھا اب پھر ان کے دماغ میں دوڑنے لگا۔ بیٹے نے ایک بار پھر بہو کی کریمانہ جبلتوں کی مزاحمت کی۔ یہ کہنے کے بجائے، "ماں، ہمارے ساتھ آ رہو" انھوں نے اسے صرف ایک ہفتہ آ کر رہنے کی دعوت دی۔

ایسٹر کا موقع تھا اور ان کا دس سالہ لڑکا چھٹی منانے گیا ہوا تھا۔ ایوا اگلے ہفتے، اتوار کے دن، آنے والی تھی۔ سو وہ اُس اتوار کے سوا پورا ہفتہ ماں کے ساتھ گزارنے کے لیے تیار تھے۔ اس سنیچر کو آ سکتی ہو، انھوں نے ماں سے کہا، اور اگلے سنیچر تک رہو۔ اتوار کے دن ہمیں کچھ مصروفیت ہے، کہیں جانا ہے۔ انھوں نے اس سے زیادہ نہیں بتایا کیونکہ وہ ایوا کے بارے میں بات کرنے کے بہت زیادہ مشتاق نہیں تھے۔ کرل نے یہ دو بار اور فون پر بھی کہا۔ اس سنیچر سے اگلے سنیچر تک۔ اتوار کو ہمیں کچھ کرنا ہے، کہیں جانا ہے۔ اور ماں نے جواب دیا، ہاں، بچّو، تمھاری بڑی نوازش ہے۔ یقین کرو، تم جب چاہو گے لوٹ جاؤں گی۔ بس اپنی تنہائی سے تھوڑی سی مہلت ہی تو چاہتی ہوں۔

لیکن جب سنیچر کی شام مَرکیتا نے اگلی صبح اسے اسٹیشن پہنچانے کے لیے وقت طے کرنا چاہا، تو ماں نے بالکل صاف اور سیدھے لفظوں میں بتایا کہ وہ پیر سے پہلے نہیں جائے گی۔ جب مَرکیتا حیران نظر آئی، تو یہ اضافہ کیا، "کرل نے مجھ سے کہا تھا کہ تمھیں پیر کو کچھ کرنا ہے،

کہیں جانا ہے، سو مجھے پیر تک لوٹنا ہوگا۔"

ظاہر ہے مَرکیتا یقیناً یہ کہہ سکتی تھی، "اماں، تم سے غلطی ہوگئی ہے، ہم لوگ تو کل جا رہے ہیں،" لیکن اس کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ کوئی مقام گھڑ نہیں سکتی تھی کہ وہاں جا رہے ہیں۔ اسے اندازہ ہوا کہ انھوں نے اپنی عدم موجودگی کے عذر میں بڑی لاپروائی سے کام لیا ہے، سو اس نے کچھ بھی نہیں کہا اور بہ جبر و اکراہ تسلیم کرلیا کہ ماں سارا اتوار بھی انھیں کے ہاں رہے گی۔ بس واحد طمانیت کی بات یہ تھی کہ لڑکے کا کمرا، جس میں انھوں نے ماں کا بندوبست کیا تھا، اپارٹ مینٹ کے دوسرے سرے پر تھا اور یوں ماں انھیں تنگ نہیں کر سکے گی۔

"چلو جانے بھی دو، اتنی دل تنگی نہ دکھاؤ،" اس نے ناپسندیدگی کے ساتھ کرل سے کہا۔ "ذرا بے چاری کو دیکھو تو سہی۔ میرا دل تو اسے دیکھ کر واقعی ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا ہے۔"

2

کرل نے بے بسی سے شانہ اچکا دیا۔ مَرکیتا صحیح کہتی تھی، ماں واقعی بدل گئی تھی۔ وہ ہر چیز سے مطمئن تھی، ہر چیز کے لیے شکرگزار تھی۔ کارل کسی معمولی سی بات پر ٹکراؤ کی توقع کیے بیٹھا تھا، اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔

ایک بار جب وہ باہر سیر کر رہے تھے، ماں نے فاصلے میں گھور کر پوچھا، "اس خوبصورت سفید سے گانو کا کیا نام ہے؟" گانو وانو نہیں تھا، بس سڑک کا پتا دینے والے پتھر کے نشان تھے۔ اس خیال سے کہ ماں کی بینائی کس قدر کمزور ہوگئی ہے، کرل کے دل میں ترحم کی لہر اٹھی۔

لیکن اس کی بینائی کا نقص ایک زیادہ بنیادی حقیقت کو واضح کر رہا تھا: چیزیں جو انھیں بڑی نظر آتی تھیں، اسے چھوٹی؛ جو انھیں راہ کے نشان دکھائی دیتے تھے، اسے گھر گھروندے۔

سچ پوچھیں تو اس کی یہ خصوصیت بالکل ہی نئی نہیں تھی، لیکن ایک زمانے میں اس نے انھیں خاصا پریشان کر دیا تھا۔ مثال کے طور پر، جب ایک رات ہمسایہ ملک کے ٹینک آ کر ان کے ملک پر قابض ہوگئے تھے۔ یہ دھچکا اتنا شدید، اتنا ہولناک تھا کہ طویل مدت تک کوئی

بھی اس کے علاوہ کچھ اور سوچنے سے عاجز رہا۔ اگست کا مہینہ تھا، اور باغ میں ناشپاتیاں تقریباً پک گئی تھیں۔ اس سے پچھلے والے ہفتے ماں نے مقامی فارمیسی والے کو دعوت دی تھی کہ آ کر انھیں چُن لے۔ وہ نہ آیا، بلکہ اس نے تو کبھی معذرت تک نہ کی۔ یہ بات کہ ماں نے اسے اس بات پر معاف کرنے سے انکار کر دیا، تو اس نے کرل اور مَرکیتا دونوں کو باؤلا کر دیا تھا۔ ہر آدمی ٹینکوں کے بارے میں سوچ رہا ہے اور اگر تمھیں کسی چیز کی فکر ہے تو وہ ناشپاتیاں ہیں، دونوں چلّائے۔ اور پھر اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد جب وہ وہاں سے منتقل ہو گئے تو ماں کی کم مائیگی کی یاد بھی اپنے ساتھ لیتے آئے۔

لیکن کیا ٹینک واقعی ناشپاتیوں سے زیادہ اہم ہیں؟ وقت کے ساتھ ساتھ کرل کو یہ احساس ہونے لگا کہ اس کا جواب اتنا واضح نہیں جتنا کبھی اس کے خیال میں تھا، اور اندر ہی اندر ماں کے نقطۂ نظر سے ہمدردی کرنے لگا ــ پیش منظر میں بڑی سی ناشپاتی اور کہیں دور فاصلے میں ٹینک، چتّی دار بھونرے جتنا ننھا منا، کسی لمحے پرواز کر کے نظروں سے غائب ہوجانے کو تیار۔ یعنی ماں بہر حال صحیح تھی: ٹینک فانی ہیں، ناشپاتیاں امر۔

ماں بیٹے کے بارے میں ہر چیز جان لینے پر اصرار کرتی تھی اور اگر وہ اپنی زندگی کا کوئی گوشہ اس سے مخفی رکھنے کی کوشش کرتا تو اِس پر برہم ہوجاتی۔ تو اس بار انھوں نے اسے خوش کرنے کا فیصلہ کر ڈالا، اپنے بارے میں سب کچھ بتا دینے کا، ان کی زندگیوں میں کیا کچھ ہوتا رہا ہے، چیزوں کے بارے میں وہ کیا خیال کرتے ہیں۔ لیکن جلد ہی انھیں اندازہ ہو گیا کہ ماں ان کی باتوں کو محض خوش اخلاقی کی خاطر سن رہی تھی اور ان کی کہانیوں کے جواب میں اپنے پوڈل کتے کی کوئی بات سنا دیتی جسے وہ اپنی عدم موجودگی میں ہمسایے کے پاس چھوڑ آئی تھی۔

کسی زمانے میں اس نے اِسے ماں کی خود پسندی یا تنگ نظری پر محمول کیا ہوتا، لیکن اب اسے بہتر علم تھا۔ سال تیزی سے گزرتے رہے اور انھیں اس کا احساس بھی نہ ہوا۔ ماں نے اپنی اُمومت کی فیلڈ مارشل والی چھڑی رکھ دی تھی اور کسی اور ہی جہان میں منتقل ہو گئی تھی۔ ایک اور سیر کے دوران وہ ایک طوفان میں آ پھنسے تھے۔ انھوں نے بازو ماں کی بغلوں کے نیچے ڈال کر اسے دونوں جانب سے اٹھالیا۔ اگر وہ اس طرح نہ اٹھالائے ہوتے تو جھکڑ

تنکے کی طرح اسے اُڑا لے گیا ہوتا۔ کرل اس بات سے متاثر ہوا کہ اس کے ہاتھوں میں وہ کس قدر مضحکہ خیز طور پر کم وزن معلوم ہوتی تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ ماں کا تعلق کسی اور قسم کی مخلوق سے ہے: نسبتاً چھوٹی، ہلکی پھلکی اور زیادہ آسانی سے ہوا میں اڑ جانے والی۔

3

ایوا دوپہر کے وقت پہنچی۔ مَرکیتا لینے اسٹیشن گئی کیونکہ وہ اسے اپنی دوست سمجھتی تھی، کرل کی نہیں۔ اسے کرل کی زنانہ دوستیں پسند نہیں تھیں۔ ایوا مختلف تھی: وہ ایوا سے پہلے ملی تھی۔

یہ تقریباً چھ سال پہلے کی بات ہے۔ وہ اور کرل آرام کی خاطر ایک اِسپا گئے تھے۔ مَرکیتا ہر روز سَونا (sauna) لیتی۔ ایک دفعہ وہ دوسری عورتوں کے ساتھ لکڑی کی بینچ پر بیٹھی پسینہ بہا رہی تھی کہ اچانک ایک بالا قامت ننگ منگ لڑکی وہاں آئی۔ ایک دوسرے سے ناواقف ہونے کے باوجود دونوں مسکرادیں، اور چند لمحوں بعد وہ لڑکی مَرکیتا سے باتیں کرنے لگی۔ چونکہ وہ اتنی صاف گو تھی اور مَرکیتا اس کی خوش خلقی کے مظاہرے کی اتنی شکر گزار، جلد ہی دونوں دوست بن گئیں۔

اس کے سنکی پن نے مَرکیتا کا دل موہ لیا تھا۔ اس کا یوں خود آگے آنا اور اس طرح باتیں کرنا! یوں جیسے انھوں نے وہاں ملنے کا طے کر رکھا ہو۔ اس نے اس قسم کے پامال تواضعی فقروں پر وقت ضائع نہیں کیا کہ سَونا صحت کے لیے کتنا مفید ہے اور اس کے بعد آدمی کو کتنے زور سے بھوک لگتی ہے۔ نہیں، وہ بغیر کسی تمہید کے اپنے بارے میں بات کرنے لگی، بالکل اسی طرح جس طرح وہ لوگ جو شخصی اشتہاروں کے توسط سے ملاقات کرتے ہیں اور اپنے مستقبل کے ساتھیوں کے نام اپنے پہلے ہی خط میں اپنے بارے میں ہر وہ چیز ٹھونس ٹھانس دیتے ہیں جو کہی جاسکتی ہو۔

اور یہ ایوا کون تھی، خود ایوا ہی کے الفاظ میں؟ ایوا ایک خوش باش، مردوں کا پیچھا کرنے والی عورت تھی۔ لیکن وہ مردوں کا پیچھا ان سے شادی کرنے کی غرض سے نہیں کرتی تھی، بلکہ اس طرح جس طرح مرد عورتوں کا پیچھا کرتے ہیں۔ وہ محبت کی قائل نہیں تھی۔

صرف دوستی اور شہوانیت کی قائل تھی۔ نتیجے کے طور پر، اس کے بہت سے دوست تھے۔ مردوں کو یہ خوف نہیں تھا کہ وہ ان سے شادی کرنا چاہتی ہے، عورتوں کو یہ خوف نہیں تھا کہ وہ ان کے مرد لے اڑے گی۔ علاوہ ازیں، اگر اس نے کبھی شادی کر ہی ڈالی، تو اس کا شوہر اس کا دوست ہوگا۔ وہ اسے جو چاہے کرنے دے گی اور اس سے کسی چیز کا مطالبہ نہیں کرے گی۔

اس کے بعد اس نے مَرکیتا کے خوبصورت سراپے کا ذکر کیا۔ یہ بڑا غیر معمولی تھا، ایوا کے خیال میں۔ بہت کم عورتیں اتنے خوبصورت جسم کی مالک ہوتی ہیں۔ اس کی تحسین کا اظہار اتنی برجستگی سے ہو رہا تھا کہ مَرکیتا کو اس میں مردوں کی گھسی پٹی خوشامد سے کہیں زیادہ لطف آیا۔ مَرکیتا کو یوں محسوس ہوا کہ وہ برجستگی کی ایک نئی اقلیم میں داخل ہو رہی ہے، اور ایوا سے اس کے دو دن بعد ملاقات طے کر لی — ٹھیک اسی وقت، ٹھیک اسی جگہ۔ بعد میں اس نے ایوا کو کرل سے ملوایا، لیکن وہ اس تعلق میں ہمیشہ ہی اَنمل بے جوڑ ثابت ہوا۔

"کرل کی ماں ہمارے ہاں آئی ہوئی ہے،" اسٹیشن سے گھر کے راستے میں مارکیتا نے اس سے معذرت کے انداز میں کہا۔ "میں اپنی کزن کے طور پر تمھیں متعارف کراؤں گی۔ تم برا تو نہیں مانو گی؟"

"ذرا بھی نہیں۔ سچ پوچھو تو، مجھے یہ خیال اچھا لگتا ہے،" ایوا نے کہا، اور مَرکیتا سے اس کے خاندان کے بارے میں چند بنیادی سے حقائق پوچھے۔

4

ماں کو بہو کے گھر والوں سے کبھی کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی تھی، لیکن 'کزن'، 'بھتیجی'، 'چچی'، اور 'دادا نانا' جیسے لفظ اس کے اندر گرمی اور گدازی پیدا کر دیتے تھے۔ یہ قلبی تصورات کے ایک آسودگی بخش دائرے کی تشکیل کرتے تھے۔

اور یہاں ایک اور بات کی تصدیق ہو رہی تھی جو وہ زمانوں سے جانتی تھی: اس کا بیٹا ایک لاعلاج سنکی تھا۔ ماں آخر کیسے ملنے آئی ہوئی رشتے دار کی راہ میں روڑے اٹکا سکتی تھی؟ کہ وہ آپس میں بات چیت کرنا چاہتے تھے، یہ وہ سمجھ سکتی تھی، لیکن صرف اتنی معمولی سی بات

کے لیے اسے ایک دن پہلے گھر بھیج دینا، تو یہ بعید از فہم تھا۔ خوش قسمتی سے، اس نے ان سے نبٹنے کی ترکیب نکال لی تھی۔ اس نے بس انھیں یہ یقین کروایا کہ وہ متفقہ پروگرام میں گڑبڑ کر بیٹھی ہے۔ بے چاری لڑکی جب یہ کوشش کر رہی تھی کہ اس سے اتوار کو لوٹ جانے کے لیے کہے تو اس کا اڑا اڑا رنگ دیکھ کر ماں کو تقریباً مزہ آیا تھا۔

ہاں، اسے اعتراف کرتے ہی بنی کہ ان کا سلوک پہلے سے بہتر تھا۔ چند سال پہلے کرل نے اسے بے رحمی سے کھڑے کھڑے بھگا دیا ہوتا۔ یہ جو کل اس نے چھوٹی سی چال چلی تھی، تو یہ ان دونوں کی بہتری کے لیے ہی تھی۔ ماں کو ایک دن پہلے ہی اپنی تنہائی میں واپس بھیج دینے پر مستقبل میں یہ بات انہیں ضمیر کے کچوکوں سے محفوظ رکھے گی۔

اس کے علاوہ، نئی رشتے دار سے ملنے پر اسے بڑی مسرت محسوس ہوئی تھی۔ وہ بڑی پیاری لڑکی تھی (اور ہو بہو کسی کی طرح لگتی تھی — لیکن کس کی طرح؟)۔ اسے پورے دو گھنٹے وہیں بیٹھے بیٹھے اس کے سوالوں کا جواب دینا پڑا تھا۔ ماں جوانی میں کس انداز سے بال کاڑھتی تھی؟ چوٹیاں باندھتی تھی، ظاہر ہے۔ یہ ہنوز آسٹرو ہنگیرین ملوکیت کا زمانہ تھا۔ ویانا ہنوز ملک کا راج مقام تھا۔ ماں ایک چیک اسکول پڑھنے جاتی تھی، ماں وطن دوست تھی۔ وہ بخوشی انھیں وطن دوستی کے ایک دو نغمے گا کر سنا سکتی ہے، جیسے لوگ اُس زمانے میں گایا کرتے تھے۔ یا چند نظمیں! یقیناً اسے بہت ساری اب بھی یاد ہوں گی۔ جنگ کے فوراً بعد (پہلی جنگِ عظیم کے بعد، 1918 میں، جس سال چیکوسلوواکیہ ریپبلک کا قیام عمل میں آیا تھا — خدا کی پناہ، مَرکیتا کی کزن کو یہ تک معلوم نہیں تھا کہ پہلی ریپبلک کب قائم ہوئی تھی!) ماں نے اسکول کے خاص جلسے میں نظم پڑھ کر سنائی تھی۔ یہ آسٹرین ایمپائر کے خاتمے کے خوشی منانے کے لیے منعقد ہوا تھا۔ ان کی آزادی کی خوشی منانے کے لیے! اور اچانک، ذرا سوچو تو سہی، آخری بند پر پہنچ کر وہ سب کچھ بھول گئی تھی اور قراءت جاری نہ رکھ سکی۔ وہ وہاں خاموش کھڑی تھی، پیشانی سے پسینہ بہے جا رہا تھا۔ اسے لگا کے وہ ندامت سے مر جائے گی۔ لیکن پھر — کون اس کا گمان کر سکتا تھا — سامعین بڑے زور زور سے تالیاں بجانے لگے۔ سب یہی سمجھے کہ نظم ختم ہو گئی ہے، کسی کو بھی آخری بند کے نہ ہونے کا احساس نہ ہوا! لیکن ماں ابھی تک شرمساری سے پانی پانی ہوئی جا رہی تھی۔ وہ اتنی سخت شرمندہ تھی کہ بھاگ کر لڑکیوں کے کمرے میں جا گھسی

اور دروازہ بند کرلیا، اور پرنسپل خود اس کے پیچھے بھاگتا ہوا آیا اور دروازہ دھڑدھڑا کر عاجزی کرنے لگا کہ نہ روئے، خدارا باہر آ جائے، بولا کہ اسے کتنی شاندار کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

مَرکیتا کی کزن ہنس دی، اور ماں اسے دیر تک گھورتی رہی۔ "تمھیں دیکھ کر مجھے کوئی یاد آتا ہے، لیکن خدایا، بھلا کون؟"

"جنگ کے ختم ہونے تک تم اسکول سے جا چکی تھیں،" کرل بیچ میں بول پڑا۔

"تم سمجھتے ہو مجھے نہیں معلوم کہ کب اسکول گئی تھی؟" ماں نے کہا۔

"تم جنگ کے آخری سالوں میں تعلیم مکمل کر چکی تھیں۔ ہم ابھی تک آسٹریا ہنگری کا ہی حصہ تھے۔"

"تو کیا میں نہیں جانتی کہ کس سال تعلیم ختم کی؟" ماں نے غصہ ہوتے ہوئے کہا۔ لیکن یہ کہتے وقت بھی اسے معلوم تھا کہ کرل درست کہہ رہا ہے۔ اس نے جنگ کے دوران ہی تعلیم ختم کی تھی۔ تو پھر وہ اسکول کے جلسے والی یاد کہاں سے در آئی تھی؟ دم کی دم میں اس کی ساری خود اعتمادی پانی ہوگئی اور اس نے بولنا بند کر دیا۔

مَرکیتا کی آواز سے وہ مختصر سی خاموشی ٹوٹی۔ وہ ایوا سے کچھ کہہ رہی تھی، کچھ جس کا ماں کی قراءت یا 1918 سے دور دور کا تعلق بھی نہیں تھا۔

ماں کو لگا وہ اپنی یادوں کے ساتھ اکیلی رہ گئی ہے اور دلچسپی کی اچانک کمی اور حافظے کی فریب کاریاں اس کے ساتھ دغا کر رہی ہیں۔

"اچھا، تو بچّو، مزے کرو،" اس نے ان سے کہا۔ "تم جوان ہو۔ باتیں کرنے کے لیے بہت کچھ ہے۔" اور برجستہ بے چینی سے لبریز ہو کر وہ انھیں چھوڑ کر اپنے پوتے کے کمرے میں چلی آئی۔

5

کرل اس بات سے کافی متاثر ہوا تھا کہ ایوا نے ماں سے اتنے بہت سے سوال کیے۔ اس سے واقفیت کو اب دس سال ہو رہے تھے، اور اس کا انداز ہمیشہ یہی رہا تھا۔ صاف گو

اور بیباک۔ کئی سال پہلے (وہ اور مَرکیتا ہنوز اس کے والدین کے یہاں ہی رہ رہے تھے) اس نے بھی اس سے اتنی ہی جلدی دوستی لگا لی تھی جتنی مَرکیتا نے۔ ایک دن کام پر اسے کسی ناواقف لڑکی کا خط ملا۔ لکھا تھا کہ اس نے اس کی جھلک دیکھی ہے اور اسے خط لکھنے کا فیصلہ کیا ہے کیونکہ اپنی پسند کا آدمی ملنے پر وہ معاشرتی آداب کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتی۔ اسے کرل بھاتا ہے اور وہ خود کو ایک شکاری سمجھتی ہے۔ ناقابلِ فراموش تجربات کی شکاری۔ وہ محبت کی قائل نہیں۔ صرف دوستی اور شہوت پرستی میں اس کا عقیدہ ہے۔ ساتھ ہی اس نے ایک لڑکی کی بڑے ترغیب دلانے والے انداز کی ننگی تصویر رکھ دی تھی۔

شروع میں کرل کو جواب دینے سے خوف آیا۔ ہوسکتا ہے یہ سارا چکر بس عملی مذاق ہی ہو۔ لیکن بعد میں اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس نے لڑکی کے دیے ہوئے پتے پر جواب لکھا اور اسے ایک دوست کے اپارٹ مینٹ میں آکر ملنے کی دعوت دی۔ یہ ایوا نکلی — کشیدہ قامت، دبلی پتلی، اور بدلباس۔ وہ عمر سے زیادہ قد کا ٹین ایج لڑکا نظر آرہی تھی جس نے نانی دادی کے پرانے کپڑے پہن رکھے ہوں۔ وہ اس کے مقابل آ بیٹھی اور بولی کہ اپنی پسند کا آدمی ملنے پر وہ معاشرتی آداب کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتی۔ وہ محبت کی قائل نہیں۔ صرف دوستی اور شہوت پرستی میں اس کا عقیدہ ہے۔ اس کے چہرے سے غیر تیقنی اور کوشش کے آثار ہویدا تھے، اور کرل کو اس کی خواہش سے زیادہ اس کے لیے برادرانہ ہمدردی محسوس ہوئی۔ لیکن پھر اس نے دل ہی دل میں کہا، موقعے کو ہاتھ سے کیوں جانے دے؟ اور اس سے، حوصلہ افزائی کے طور پر، "بالکل ٹھیک۔ دو شکاریوں کی ملاقات۔"

یہ الفاظ، اس کے اعتراف کے بہاؤ کو روکنے والے پہلے الفاظ، انھوں نے ایوا کو نئی طاقت فراہم کردی۔ وہ تقریباً سوا گھنٹے تک تن تنہا سورمائی طریقے پر مورچہ سنبھالے رہی تھی۔

کرل نے ایوا کو بتایا کہ جو تصویر اس نے بھیجی تھی اس میں وہ بڑی خوبصورت لگ رہی تھی اور (ایک شکاری کی ترغیب دلانے والی آواز میں) پوچھا کہ خود کو برہنہ دکھانے سے اس کو جنسی برانگیختگی محسوس ہوتی ہے۔

"میں خودنمائی کرتی ہوں،" وہ بولی، بالکل اسی طرح جیسے اس نے کہا ہوتا کہ وہ زنانہ باسکٹ بال کھیلتی ہے۔

وہ بولا کہ دیکھنا چاہتا ہے۔

وہ جوش میں آ گئی اور پوچھا کہ اپارٹ مینٹ میں کوئی رکارڈ پلیئر ہے۔

ہاں تھا، لیکن اس کے دوست کے پاس صرف کلاسیکی موسیقی ہی تھی: باخ، وِوالڈی، اور واگنر کے چند اوپرا۔ کسی وجہ سے کرل اسے "لیبس ٹوڈ" پر برہنہ ہوتے ہوئے تصور نہیں کرسکتا تھا۔ خود ایوا بھی رکارڈوں پر کرل سے زیادہ خوش نہیں تھی۔ "کوئی رَوک وَوک نہیں؟" نہیں، کوئی رَوک کا رکارڈ نہیں تھا۔ کوئی چارہ نہ تھا: جھک مار کر اس نے باخ کی ایک سویٹ چڑھادی۔ پھر وہ کونے میں پڑی کرسی پر جم کر بیٹھ گیا جہاں سے بہترین نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ ایوا نے آہنگ پر تھرکنے کی کوشش کی، لیکن کچھ دیر بعد ہمت ہار بیٹھی۔ اِس قسم کی موسیقی سے کام نہیں چلے گا۔

"منہ بند کرو اور کپڑے اتارنے شروع کرو" وہ اس پر غرایا۔

کمرے میں باخ کی سماوی موسیقی کی ہنوز اٹھتی ہوئی لہروں پر ایوا پھر سے جسم جھٹکنے اور ٹھمکے مارنے لگی۔ چونکہ یہ موسیقی سرے سے رقص کرنے کے لیے بنی ہی نہیں تھی، ایوا کی کارگزاری خاص طور پر مشقت طلب ہوگئی، اور کرل کو شک ہوا کہ سوئیٹر سے لے کر جو اس نے سب سے پہلے اتارا تھا پینٹیز تک جو اس نے سب سے آخر میں تن سے جدا کی تھیں، ایوا کو وقت غیر مختتم معلوم ہورہا ہے۔ جب تک موسیقی جاری رہی، ایوا رقص کے مختلف پیرایوں میں جسم تھرکاتی اور کپڑوں کو ایک ایک کر کے بدن سے جدا کرتی رہی۔ اس ساری مدت میں کبھی ایک بار اس نے اتنا بھی نہیں کہ کرل کی طرف نگاہِ غلط انداز ہی ڈال لی ہوتی۔ وہ اتنے ہی بھرپور طریقے پر صرف اپنی ذات اور جنبشوں پر مرتکز رہی جتنے پر کوئی وائلن نواز موسیقی کے کسی دقت طلب پارے کو محض یاد سے بجاتے وقت ہوتا ہے، اس سے خوفزدہ کہ اوپر سامعین کی طرف دیکھنے سے کہیں اس کی توجہ نہ بٹ جائے۔ جب وہ بالآخر الف ننگی ہوگئی، تو مڑی، پیشانی دیوار سے ٹکائی، اور دونوں ٹانگوں کے بیچ ہاتھ ڈال دیا۔ کرل نے اپنے کپڑے اُتار پھینکے اور نگاہ کو جلق لگاتی لڑکی کی تھرتھراتی ہوئی پشت سے جدا نہ ہونے دیا۔ وہ عالمِ وجد میں تھا۔ یہ طرفہ تھا۔ اب اس میں حیرت کی کیا بات کہ وہ اس دن کے بعد سے ایوا پر نظر رکھنے لگا۔

اس کے علاوہ، وہ اس کی عورتوں میں واحد عورت تھی جسے مَرکیتا سے اس کی محبت پر

ذرہ برابر پریشانی نہیں تھی۔ "تمھاری بیوی کو یہ جان لینا چاہیے کہ تم چاہے اس سے کتنی ہی محبت کیوں نہ کرو، بہر حال تم شکاری ہی ہو، اور تمھاری شکار بازی سے اسے کوئی خطرہ لاحق نہیں۔ لیکن بھلا یہ بات کوئی بیوی کبھی سمجھ سکی ہے؟ نہیں،" اس نے اضافہ کیا، "کوئی عورت کبھی اپنے مرد کو نہیں سمجھ سکتی،" یوں جیسے وہ مذکورہ نا فہمیدہ شوہر ہو۔

پھر ایوا نے بساط بھر اس کی مدد کرنے کی پیشکش کی۔

6

ماں جس کمرے میں گئی، اپنے پوتے کے، وہ بیس فٹ اور دو پتلی سی دیواروں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ماں کا سایہ ابھی تک ان کے پاس منڈلا رہا تھا، اور مَرکیتا کو اس بات سے بے چینی محسوس ہوئی۔

خوش قسمتی سے ایوا باتونی موڈ میں تھی۔ ان کی آخری ملاقات کے بعد سے بہت کچھ پیش آیا تھا: وہ کسی اور شہر منتقل ہو گئی تھی اور اہم تر یہ کہ وہاں ایک عمر رسیدہ آدمی سے شادی کر لی تھی، عقل مند آدمی جو اسے بے بدل دوست سمجھتا تھا۔ اور جیسا کہ ہمیں معلوم ہے، ایوا اچھی صحبت کا بڑا نایاب ملکہ رکھتی تھی، لیکن محبت میں اسے یقین وقین نہیں تھا، جو انانیت کے دوروں اور ہسٹریا کے ہمرکاب آتی ہے۔

اس نے ایک نئی ملازمت بھی شروع کر دی تھی۔ اچھی خاصی تنخواہ مل رہی تھی، لیکن اس کے حصول کے لیے اسے کام بھی خوب کرنا پڑتا تھا۔ اگلی صبح اسے نوکری پر لوٹنا تھا۔

"واقعی؟" مَرکیتا نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "کب جانا ہوگا؟"

"صبح پانچ بجے ایک ایکسپریس جاتی ہے۔"

"جس کا مطلب ہے صبح چار بجے اٹھنا ہوگا! خدایا، یہ بڑا برا ہوا!" اور معاً اسے محسوس ہوا — اچھا، غصہ نہ بھی سہی، پھر بھی کم از کم جھنجھلاہٹ کہ کرل کی ماں ٹھہری ہوئی ہے۔ ایوا بڑی دور رہتی تھی اور بے حد مصروف تھی، اور یہاں اس نے اتوار کا دن مَرکیتا کے لیے بچا رکھا تھا، اور اب وہ اسے اپنے منصوبے کے مطابق ساتھ ساتھ گزارنے سے معذور تھیں کیونکہ کرل

کی ماں کا بھوت اب بھی ان کے سروں پر منڈلا رہا تھا۔

مَرکیتا بڑے خراب موڈ میں تھی، اور چونکہ پانی ٹپکتا نہیں بلکہ دھواں دھار برستا ہے، فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ کرل نے چونگا اٹھایا۔ اس کی آواز میں ہچکچاہٹ تھی، جواب مشتبہ طور پر بچے تلے اور رمزیہ تھے۔ مَرکیتا کو لگا کہ وہ الفاظ کا انتخاب بہت احتیاط کے ساتھ کر رہا ہے اور جو کہہ رہا ہے اس کی نوعیت پر پردہ ڈالنے کی کوشش۔ اسے یقین تھا کہ وہ کسی عورت سے ملاقات کا طے کر رہا ہے۔

"کون تھا؟" اس نے پوچھا۔ کرل نے بتایا کہ برابر کے شہر میں رہنے والی ایک ہم کار عورت تھی جسے اُس ہفتے آ کر اس سے ملنا تھا۔ اس کے بعد سے مَرکیتا نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

کیا واقعی وہ اتنی زیادہ رقابت محسوس کرتی تھی؟

ایک زمانے میں کرتی تھی۔ ہاں، جب وہ پہلے پہل ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہوئے تھے۔ لیکن یہ برسوں پہلے کی بات ہے۔ اب محسوس ہونے والی رقابت حقیقت میں صرف عادت تھی۔

دوسری طرح کہیں تو، ہر عشقیہ تعلق کی بنیاد غیر نوشتہ معاہدوں پر ہوتی ہے جو عاشقین محبت کے اولین ہفتوں میں بلا سوچے سمجھے قبول کر لیتے ہیں۔ ایک طرف تو وہ ایک طرح کے خواب میں زندگی گزار رہے ہوتے ہیں؛ دوسری طرف، اس کا احساس کیے بغیر، وہ اپنے معاہدے کی تفصیلات کسی بیش از بیش سیانے وکیل کی طرح مرتب کر رہے ہوتے ہیں۔ اے عاشقو! ان خطرناک اولین دنوں سے ہوشیار رہو! اگر تم دوسرے فریق کو بستر میں ناشتہ پیش کرو گے، تو یہ تمھیں قیامت تک کرنا پڑے گا ورنہ دشمنی اور غداری کے الزامات سے سامنا ہوگا۔

اُن اولین ہفتوں میں کرل اور مَرکیتا کے درمیان یہ طے پایا تھا کہ کرل جنسی بے وفائی کرے گا اور مَرکیتا کو سپر انداز ہونا پڑے گا، لیکن مَرکیتا کو جوڑے میں بہتر ہونے کا امتیاز حاصل رہے گا اور کرل ہمیشہ خود کو مجرم محسوس کرے گا۔ مَرکیتا سے زیادہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ بہتر ہونا دل بجھے ہونے کی کتنی بری حالت کا نام ہے۔ کسی بہتر چیز کی کمی ہی بہتر ہونے کی واحد وجہ تھی۔

اندر گہرائی میں، ظاہر ہے، مَرکیتا جانتی تھی کہ ٹیلی فونی رابطے کی بذاتہٖ کوئی اہمیت نہیں تھی۔ لیکن یہ کیا 'تھا' اس کی اتنی اہمیت نہیں تھی جتنی اس چیز کی جس کی یہ 'نمائندگی' کر رہا تھا: اس کی پوری زندگی کی صورتِ حال کا فصیح و بلیغ نچوڑ۔ اس کا ہر عمل کرل کی خاطر تھا۔ اس نے اس کی ماں کی دیکھ بھال کی تھی۔ کرل کو اپنی بہترین دوست سے متعارف کرایا تھا؛ حقیقت میں اس دوست کو اس نے کرل کے حوالے کر دیا تھا۔ تاکہ وہ اس کی اپنی بن جائے، اس کے عیش و عشرت کے لیے۔ آخر اسے اتنا زیادہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اتنی سخت کوشش کرنے کی؟ سسی فس کی طرح اس نے چٹان کو اوپر چوٹی کی طرف کیوں دھکیلا تھا؟ چاہے وہ کچھ بھی کرے، روحانی طور پر کرل کہیں اور ہی متمکن تھا۔ وہ دوسری عورتوں سے ملاقاتیں طے کرتا اور مسلسل اس سے کنّی کاٹ جاتا۔

اسکول کے زمانے میں وہ قابو سے باہر، باغی، تقریباً بہت زیادہ زندہ دل تھی۔ "کوئی بھی تمھیں تمھاری ناک پکڑ کر نہیں چلا سکتا" اس کا بوڑھا ریاضی کا استاد اس سے مذاق میں کہا کرتا تھا۔ "مجھے تمھارے شوہر پر پیشگی رحم آتا ہے۔" وہ فخر سے ہنس پڑتی۔ اس کے خیال میں یہ لفظ خوش شگون تھے۔ لیکن پھر اچانک، بغیر کسی تہدید کے، اس کی مرضی اور فیصلے کے برخلاف، اس نے خود کو ایک بالکل ہی مختلف کردار ادا کرتے ہوئے پایا۔ اور یہ سب صرف اس لیے کہ نادانستہ معاہدہ مرتب کرنے والے ہفتے وہ حزم و احتیاط کا دامن چھوڑ بیٹھی تھی۔

ہمیشہ بہتر ہونا مزے کی بات نہیں تھی۔ شادی کے سارے سال اس پر ٹن بھر اینٹوں کی طرح اچانک آ پڑے۔

7

مَرکیتا کے طرزِ عمل میں زیادہ سے زیادہ اضطراب آ گیا تھا، اور کرل کے چہرے پر برہمی کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ ایوا سٹپٹا گئی۔ جوڑے کی حیثیت سے وہ تنہا خود کو ان کی مسرت کا ذمے دار سمجھتی تھی اور ایک میل فی منٹ کی رفتار سے باتیں کر کے ان بادلوں کو جن سے کمرا بھر گیا تھا ہٹانے کی اپنی سی کوشش کرنے لگی۔

لیکن یہ اس کی بساط سے کہیں زیادہ تھا۔ کرل نے، جو ان ساری باتوں کی ناانصافی سے — اس بار یہ بالکل صاف اور ظاہر تھی — مشتعل ہوگیا تھا، منہ کھولنے سے انکار کردیا۔ مَرکیتا، جو نہ اپنی تلخی پر غالب آ سکی تھی نہ شوہر کی برہمی سے نپٹنے کی اہل تھی، اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔

اس درمیان میں ایوا نے کرل کو سمجھایا کہ اس شام کو برباد نہ کرے جسے منانے کا وہ اتنے دنوں سے انتظار کرتے رہے ہیں۔ لیکن کرل پر کوئی اثر نہ ہوا۔ "ایک وقت آتا ہے جب آدمی اور زیادہ برداشت نہیں کرسکتا۔ جب دیکھو کسی نہ کسی جرم کا الزام لگایا جارہا ہے۔ میں اس سے تنگ آ گیا ہوں۔ یہ کوئی مذاق نہیں، یہ اس کا مجھے روز روز الزام دینا۔ اور وہ بھی فضول سی باتوں پر، فضول سی باتیں! نہیں، میں اب اور اسے دیکھنا برداشت نہیں کرسکتا۔ میں اسے دیکھنا برداشت نہیں کرسکتا!" جب ایک بار چل پڑا تو اس کا رکنا ناممکن تھا۔ ایوا نے عاجزی کی کہ وہ جو مَرکیتا کے دفاع میں کہنا چاہتی ہے اسے سن تو لے، لیکن اس نے انکار کردیا۔

سو اس نے کرل کو اپنے حال پر چھوڑ دیا اور مَرکیتا کو دیکھنے اندر چل دی، جو کچن میں سر نہوڑائے بیٹھی تھی۔ مَرکیتا کو احساس تھا کہ کچھ ہوا ہے جسے نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ایوا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ ٹیلی فون کال کسی طرح بھی اس کے شبہات کا جواز نہیں۔ "خیر، میں اب اور برداشت نہیں کرسکتی،" مَرکیتا نے کہا، گو اپنی گہرائیوں میں اسے معلوم تھا کہ اس مرتبہ وہ غلطی پر ہے۔ "ہمیشہ یہی ہوتا ہے: ہر سال۔ ہر مہینے۔ وہی عورت اور وہی جھوٹ۔ بس، میں عاجز آ گئی ہوں۔ عاجز! میں بھر پائی!"

ایوا کو اندازہ ہوگیا کہ وہ دونوں میں سے کسی کو قائل نہیں کر سکے گی، سو اگرچہ وہ اپنے مبہم سے منصوبے کی صداقت کے بارے میں ڈھل مل یقین تھی، اس نے بالآخر اسے آزمانے کا فیصلہ کر ہی ڈالا۔ اگر اس کا مقصد ان کی مدد کرنا تھا، تو اسے پیش قدمی لازم تھی اور عمل کو خود اپنی ایما پر بجالانا تھا۔ کرل اور مَرکیتا کو ایک دوسرے سے محبت تھی، لیکن انھیں کسی ایسے کی ضرورت تھی جو اس بوجھ کو ان سے اٹھا دے جس کے نیچے وہ جدوجہد کررہے تھے۔ کسی کی جو انھیں آزاد کردے۔ چنانچہ جو منصوبہ اس نے بنایا تھا وہ صرف اس کی دلچسپی کے لیے ہی نہیں تھا (گو اس میں شک نہیں تھا کہ وہ اولیت اور اہمیت کے حساب سے اس کی دلچسپی کے لیے ہی

تھا، اور اس پر اسے کچھ تردد سا تھا کیونکہ اس کا یہ منشا کبھی نہیں رہا تھا کہ اپنے دوستوں کے ساتھ خود غرضی سے پیش آئے)، یہ ان کے حق میں بھی تھا۔

"بتاؤ میں کیا کروں؟" مَرکیتا نے پوچھا۔

"اس کے پاس جاؤ۔ کہو کہ پریشان نہ ہو۔"

"لیکن مجھے اس کی صورت دیکھنا بھی گوارا نہیں!"

"تو اس صورت میں نگاہیں نیچی کر لینا۔ اس سے اور بھی اثر پڑے گا"۔

8

شام بچ گئی۔ مَرکیتا نے بڑے نمائشی انداز میں ایک بوتل نکالی۔ کرل کے حوالے کی، یعنی وہی اسے کھولے، یوں جیسے اولمپکس کی آخری دوڑ کا افتتاح کر رہا ہو۔ اِدھر شراب ان کے تین گلاسوں میں انڈل رہی تھی، اُدھر ایوا رقص کرتی ہوئی رکارڈ پلییَر کے پاس پہنچی، ایک رکارڈ کا انتخاب کیا، اور موسیقی کے ساتھ ساتھ سارے کمرے میں ناچنے لگی (باخ کے بجائے اس بار ایلنگٹن)۔

"تمھارے خیال میں ماں اس وقت تک سو چکی ہوگی؟" مَرکیتا نے پوچھا۔

"بہتر ہوگا کہ اندر جا کر اسے شب بخیر کہہ آؤ" کرل نے مشورہ دیا۔

"اگر ہم لوگ اندر جا کر شب بخیر کہیں گے تو وہ پھر اپنی کوئی کہانی سنانے بیٹھ جائے گی اور ہمارا ایک گھنٹا اور ضائع جائے گا۔ یاد ہے، ایوا کو صبح تڑکے اٹھنا ہے۔"

مَرکیتا کو لگا کہ ایک دن کے حساب سے انھوں نے پہلے ہی بہت زیادہ وقت ضائع کر دیا ہے۔ اس نے اپنی دوست کا ہاتھ تھاما اور، ماں کے پاس جانے کے بجائے، اسے غسل خانے کی سمت لے چلی۔

کرل پیچھے اپنے ایلنگٹن کے ساتھ رہ گیا۔ اسے اطمینان ہوا کہ بادل چھٹ چکا ہے، لیکن وہ شام کی مہم جوئی کے لیے شوق نہیں محسوس کر رہا تھا۔ ٹیلی فون والا معاملہ کسی چیز کے بارے میں ایک ناگہانی الہام بن گیا جس کے اعتراف سے وہ منکر تھا: وہ تھکا ہوا تھا اس کی

کوئی خواہش نہیں محسوس ہو رہی تھی۔

کئی سال پہلے مَرکیتا نے اسے اس پر تیار کرلیا تھا کہ وہ اس کے اور اپنی داشتہ کے ساتھ سہ طرفہ جفتی کرے، وہ داشتہ جس سے وہ رقابت محسوس کرتی تھی۔ جب پہلی بار اس نے اس کا ذکر کیا تو مارے جوش کے کرل کا سر چکرانے لگا! لیکن وہ کوئی بہت پُر لطف شام نہیں ثابت ہوئی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ بے حد تھکا دینے والی نکلی ــ اس کی موجودگی میں دو عورتیں بوس و کنار کر رہی ہیں، لیکن ایک لمحے کے لیے بھی اس سے غافل نہیں کہ وہ ایک دوسرے کی رقیب ہیں اور مسلسل اس ٹوہ میں لگی ہوئی کہ وہ کس پر زیادہ توجہ صرف کر رہا ہے، کس کے ساتھ زیادہ گدازی سے پیش آ رہا ہے۔ اسے اپنے ہر ہر لفظ، ہر ہر لمس کو تولنے میں بڑی احتیاط سے کام لینا پڑا تھا، اور خود کو عاشق سے زیادہ ڈپلومیٹ محسوس کر رہا تھا ــ پوری دیانتداری کے ساتھ باتوجہ، بالحاظ، باتواضع، اور انصاف پسند۔ اور اس کے باوجود وہ ناکام رہا تھا۔ پہلے اس کی داشتہ ہر چیز کے بیچ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی؛ پھر مَرکیتا چپ سادھ کر بیٹھ گئی۔

اگر وہ کبھی اس پر یقین کرتا کہ مَرکیتا نے ان کی ان چھوٹی موٹی عیاشانہ رنگ رلیوں کی درخواست خالص شہوت پرستی کے ناتے کی تھی ــ جو، آخر کار، جوڑے میں سب سے بدتر تھی ــ تو اس نے یقیناً ان سے لطف اٹھایا ہوتا۔ لیکن چونکہ کھیل کے آغاز ہی میں یہ مقرر کرلیا گیا تھا کہ وہ 'بدتر' ہے، مَرکیتا کی عیاشی میں اسے اگر کچھ نظر آ رہا تھا تو یہ ذات کی بڑی درد ناک نفی تھی اور اس کی کثیر زوجی لغزشوں سے کسی حد تک سمجھوتا کر لینے کی عالی ظرف کوشش، انھیں ازدواجی سعادت کے لازمی جز میں تبدیل کر دینا۔ مَرکیتا کی رقابت کا منظر ہمیشہ کے لیے اس پر نقش ہو گیا تھا، ایک زخم جسے ان کے تعلق کے اولین مرحلے میں خود اسی نے تازہ کر دیا تھا۔ جب اس نے مَرکیتا کو ایک اور عورت کی آغوش میں دیکھا، تو اس کا جی چاہا کہ دوزانو ہو کر اس سے گڑگڑا کر معافی مانگے۔

کیا یہ ہوسکتا ہے کہ عیاشی کے وہ بے محابا کھیل ایک کفارہ ہوں؟

کسی وقت اسے خیال آیا کہ سہ طرفی مباشرت سے لطف اندوزی مقصود ہے تو بہتر ہوگا مَرکیتا اس احساس کو جھٹک دے کہ وہ بستر میں ایک رقیب کے ساتھ ہے۔ اسے از خود

کسی کو تلاش کرنا ہوگا، کوئی جس سے کرل آشنا نہ ہو اور نہ جس میں کوئی دلچسپی رکھتا ہو۔ اسی لیے کرل نے یہ ترکیب نکالی کہ بڑی چالاکی کے ساتھ سَونا میں مَرکیتا اور ایوا کی مڈ بھیڑ کرادی۔ اور یہ کامیاب بھی رہی۔ دونوں دوست بن گئی تھیں، یہی نہیں بلکہ ایک دوسرے کی معاون اور ہم سازشی بھی ــ مِل کر اس کے ساتھ زبردستی جنسی فعل کر رہی تھیں، کھیل رہی تھیں، اس کے خرچے پر مزہ اڑا رہی تھیں، اس کی ہوس کر رہی تھیں۔ کرل کو یہ امید تھی کہ ایوا مَرکیتا کو اس تشویش سے نجات دلا دے گی جسے وہ محبت سے متلازم سمجھتی تھی، تاکہ بالآخر وہ ان تہمتوں سے آزاد ہو جائے جو وہ اسے اٹھتے بیٹھتے دیتی رہتی تھی۔ آزاد، بس۔

لیکن اب اسے یہ احساس ہونے لگا کہ ان تمام سالوں میں وہ چیز جو ایک قانون سا بن گئی تھی اسے بدلنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ مَرکیتا وہی پہلے جیسی تھی، اور وہ خود اب بھی حسبِ سابق متہم۔

تو پھر اسے مَرکیتا کو ایوا سے ملوانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اس نے ان کے ساتھ مباشرت کیوں کی تھی؟ کوئی بھی مَرکیتا کو مدتوں پہلے ایک خوش باش، شہوت پرست، اور پُر مسرت عورت بنا چکا ہوتا۔ کرل کے سوا کوئی بھی۔ وہ اپنے کو سسی فس کی طرح محسوس کر رہا تھا۔

سسی فس؟ لیکن کیا مَرکیتا نے ابھی ابھی خود اپنے کو سسی فس سے تشبیہ نہیں دی تھی؟

ہاں، اپنی ہم زیستی کے سالوں میں زن و شو توام بن گئے تھے۔ ان کا ذخیرۂ الفاظ بھی ایک جیسا تھا، خیالات میں بھی یکسانیت تھی، اور قسمت بھی ایک۔ ہر نے دوسرے کو ایوا کا تحفہ دیا تھا، اور ہر دوسرے کو خوشی پہنچانا چاہتا تھا۔ دونوں میں سے ہر ایک بھاری چٹان کو اوپر پہاڑی پر دھکیل رہا تھا۔ دونوں تھک کر چور ہو گئے تھے۔

غسل خانے میں پانی کے چھپاکوں اور دونوں عورتوں کے غرارہ کرنے کی آواز سن کر اسے خیال آیا کہ وہ کبھی اس طرح زندگی نہیں گزار سکتا جس طرح گزارنا چاہتا ہے، نہ مختلف عورتوں سے اس طرح متمتع ہو سکتا ہے جس طرح ہونے کا خواہش مند ہے۔ اس کا جی کہیں بھاگ جانے کو چاہا جہاں اپنی کہانی خود مرتب کر سکے، اور جس طرح چاہتا ہے مرتب کر سکے، اس طرح کہ محبت بھری نگاہیں نگراں نہ ہوں۔

سچ بات تو یہ ہے کہ اسے ایسی کسی کہانی کو مرتب کرنے کی پروا نہیں تھی۔ وہ تو بس

تنہائی چاہتا تھا۔

9

مَرکیتا کے ماں کو محوِ خواب فرض کر لینے اور اسے شب بخیر کہنے سے محترز ہونے کی کوئی تک نہیں تھی۔ اس بے احتیاطی کی وجہ صرف بے صبری تھی۔ بیٹے کے یہاں قیام کے دوران نت نئے خیالات ماں کے ذہن میں بجبجانے لگے تھے، اور اِس شام تو وہ خاص طور پر بے قابو ہو گئے تھے۔ اور یہ سب مَرکیتا کی اس بھلی سی کزن کی وجہ سے جو اسے مسلسل اپنی جوانی کے دنوں کی کسی عورت کی یاد دلا رہی تھی۔ اچھا تو بھلا وہ کون ہو سکتی تھی؟

آخر کار اسے یاد آ ہی گیا: نورا! ظاہر ہے۔ عین مین وہی کاٹھی، وہی چال ڈھال، ویسی ہی لمبی لمبی خوبصورت ٹانگیں۔

نورا کبھی خاص طور پر رحمدل یا باحیا نہیں رہی تھی، اور اس کی باتوں نے اکثر ماں کا دل دُکھایا تھا۔ لیکن اِس وقت اسے ان باتوں کا خیال نہیں آ رہا تھا۔ نسبتاً زیادہ اہم بات یہ تھی کہ ماں اچانک اتفاقیہ طور پر اپنی جوانی کے ایک حصے سے دوچار ہو گئی تھی، ایک تہنیت جو آدھی صدی پار سے اس تک پہنچ رہی تھی۔ اسے یہ سوچنا بھلا لگا کہ تمام چیزیں جن سے اس کا زندگی میں سابقہ پڑا ہے ابھی تک وہیں موجود ہیں، اس کے اِرد گرد، اور اس سے محوِ تکلم ہیں۔ اگرچہ اسے نورا حقیقت میں کبھی پسند نہیں آئی تھی، اسے اس کی خوشی تھی کہ اس سے ایک مکملاً سدھے ہوئے قالب میں ملاقات ہو رہی ہے اور ایسے شخص کے روپ میں جو اس کا مناسب احترام کر رہی تھی۔ یاد کی بازآوری کے ساتھ ہی اس کا جی چاہا کہ دوڑ کر ان کے پاس جائے اور بتائے۔ لیکن اس نے ضبط سے کام لیا۔ اسے خوب معلوم تھا کہ وہ ایک چھوٹی سی چال کی بدولت ہی ابھی تک یہیں تھی اور کہ وہ دو گاوَدی اپنی کزن کے ساتھ تنہائی میں وقت گزارنا چاہتے تھے۔ ٹھیک ہے، گزاریں، اپنے راز و نیاز میں مگن رہیں۔ پوتے کے کمرے میں اس کا دل اوبھ نہیں رہا تھا۔ اس کے پاس بُننے کا سامان تھا، پڑھنے پڑھانے کی چیزیں تھیں، اور ان سے بڑھ کر یہ کہ اسے کچھ غور و فکر بھی کرنا تھا۔ کرل نے واقعی اسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

ظاہر ہے، وہ بالکل درست کہہ رہا تھا: اس نے جنگ کے زمانے ہی میں تعلیم سے فراغت پالی تھی۔ وہ گڑبڑا گئی تھی۔ نظم گانے اور آخری بند بھول جانے والا واقعہ اس سے کم از کم پانچ سال پہلے پیش آیا تھا۔ پرنسپل واقعی لڑکیوں کے کمرے کا دروازہ زور زور سے کھٹکھٹا رہا تھا جہاں وہ اپنے کو بند کیے بیٹھی تھی تاکہ خوب رو سکے۔ لیکن اُس وقت اس کی عمر تیرہ سال سے بیش نہیں ہوسکتی تھی، اور وہ کرسمس کا اجتماع تھا۔ اسٹیج پر کرسمس کا خوب سجا سجایا درخت تھا، اور بچوں کے کرسمس کیرول گا چکنے کے بعد اس نے نظم گا کر سنائی تھی۔ اور آخری بند سے ذرا پہلے اس کے دماغ سے سب کچھ غائب ہوگیا تھا اور وہ گانا جاری نہیں رکھ سکی تھی۔

ماں کو اپنی یادداشت پر ندامت تھی۔ وہ کرل سے کیا کہے؟ کیا وہ اعتراف کرے کہ اس نے چیزوں کو خلط ملط کر دیا تھا؟ وہ پہلے ہی اسے بوڑھی عورت سمجھتا تھا۔ اوہ، وہ اس سے اچھی طرح پیش آئے تھے، ٹھیک ہے، لیکن ماں سے یہ بات مخفی نہیں تھی کہ وہ اس کے ساتھ کسی بچی کا سا سلوک کررہے تھے، ایک طرح کی کرمفرمائی کا مظاہرہ کررہے تھے جو اسے ناگوار گزری۔ اگر وہ اعتراف کر لے اور کرل سے برملا کہہ دے کہ وہ درست کہہ رہا تھا اور اس نے واقعی کرسمس کے اجتماع کو ایک سیاسی جلسے سے گڈ مڈ کر دیا تھا، تو وہ لوگ قد میں چند انچ اور اونچے ہو جائیں گے اور وہ کچھ اور سکڑ جائے گی۔ نہیں، نہیں، وہ انھیں یہ اطمینان کبھی نہیں ہونے دے گی۔

وہ ان سے کہے گی کہ اس نے واقعی وہ نظم جنگ کے بعد سنائی تھی۔ ٹھیک ہے، اس وقت تک وہ اسکول کو خیر باد کہہ چکی تھی، لیکن پرنسپل نے اسے یاد رکھا تھا کیونکہ وہ خوش بیانی میں سب سے بہتر تھی اور اس نے اسے وہاں آ کر نظم پڑھ کر سند یافتگان کی نمائندگی کرنے کی دعوت دی تھی۔ یہ بڑی عزت کی بات تھی! وہ وطن دوست تھی! ان لوگوں کو کچھ پتا نہیں تھا کہ جنگ کے بعد جب آسٹریا ہنگری کا شیرازہ بکھرا تو اس وقت کیا صورتِ حال تھی۔ فخر و شادمانی کی وہ کیفیت! گیت گانے! پرچم! اور ایک بار پھر اس کا جی چاہا کے دوڑ کر ان کے پاس جائے اور بیٹے اور بہو کو اپنی جوانی کی دنیا سے آگاہ کرے۔

حقیقت میں ان سے جا کر یہ سب کہنا اسے اپنے اوپر 'فرض' معلوم ہوا۔ ٹھیک ہے، اس نے ان کی محفل میں مخل نہ ہونے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن یہ بس نصف صداقت ہی تھی۔ بقیہ

نصف یہ تھی کہ کرل یہ سمجھنے کا انکاری تھا کہ آخر وہ کیسے جنگ کے بعد اسکول کے ایک اجتماع میں نظم سنا سکتی تھی۔ ماں کی عمر بڑھتی جا رہی تھی، اور اس کا حافظہ پہلے جیسا نہیں رہا تھا، اس لیے وہ کرل سے اس بات کی وضاحت برجستگی کے ساتھ نہیں کرسکتی تھی، لیکن اب جبکہ اسے یاد آ گیا ہے کہ یہ سب ٹھیک کیسے پیش آیا تھا، وہ بھلا کیسے بیٹے کا سوال بھلا سکتی ہے۔ یہ اچھی بات نہیں ہوتی۔ سو اب وہ ان کے پاس جائے گی (انھیں چاہے اپنے سے کچھ بھی کہنا کہلانا ہو، وہ اتنا اہم تو نہیں ہوسکتا) اور معذرت کے ساتھ کہے گی کہ اس کا منشا ان کی گفتگو میں مخل ہونا نہیں ہے اور وہ کبھی وہاں دوبارہ نہ آئی ہوتی اگر کرل نے اس سے یہ نہ پوچھا ہوتا کہ آخر اس نے تعلیم ختم کر لینے کے بعد اسکول کے اجتماع میں نظم کیسے پڑھی تھی۔

اس موقعے پر اس نے درواز کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی۔ اسے دو عورتوں کی آوازیں سنائی دیں، پھر دروازہ دوبارہ کھلنے کی۔ پھر ہنسی اور پانی بہنے کی آواز۔ دونوں لڑکیاں سونے کی تیاری کر رہی ہوں گی، ماں نے اپنے سے کہا۔ اگر وہ اپنی بات کرنے کا موقع چاہتی ہے تو اسے جلدی کرنی چاہیے۔

10

ماں کی آمد ایک زندہ دل، کھیسیں نکال کر ہنستے ہوئے خدا کا کرل کی جانب بڑھایا ہوا ہاتھ تھا۔ یہ آمد اتنی بے وقت تھی کہ نہایت اطمینان بخش ثابت ہوئی۔ ماں کو معذرت کی سرے سے کوئی ضرورت پیش نہ آئی۔ کرل نے اس پر سوالوں کی بھرمار کردی کہ وہ ساری دوپہر کیا کرتی رہی ہے، کیا طبیعت مندی تو نہیں، اور اس نے آ کر حال وال کیوں نہیں پوچھا۔

ماں نے جتایا کہ جوان لوگوں کے پاس ایک دوسرے سے کرنے کے لیے ہمیشہ بہت سی باتیں ہوتی ہیں اور ایک سن رسیدہ کو یہ بات سمجھنی چاہیے اور ان سے دور رہنا چاہیے۔

اب کرل کو بعجلت دروازے کی طرف بڑھتی ہوئی دونوں لڑکیوں کی کان پھاڑتی ہوئی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پہلے ایوا اپنی نیلے رنگ کی نائٹی میں ملبوس اندر آئی جو ٹھیک وہاں تک آ کر ختم ہو رہی تھی جہاں سے اس کے سیاہ موئے زہار شروع ہو رہے تھے۔ ماں کو

دیکھتے ہی اس کی سٹی گم ہوگئی، لیکن اب چونکہ واپس لوٹنا ممکن نہ تھا، اس نے ماں کی طرف مسکراہٹ اچھالی اور تیزی سے آرام کرسی کی طرف جھپٹی، اس امید میں کہ وہ اس کی بدسلیقہ برہنگی کو چھپا سکے گی۔

کرل کو اندازہ تھا کہ مَرکیتا بس پیچھے ہی آ رہی ہوگی، اور وہ بھی اپنے رات کے لباس میں، جس کا مطلب ان کی نجی زبان میں یہ نکلتا تھا کہ گردن میں مالا پڑی ہوگی اور کمر کے گرد سرخ مخمل کا پٹکا۔ اسے کچھ کرنا ہی ہوگا کہ وہ اندر نہ آئے اور ماں زرد نہ پڑ جائے۔ لیکن کرے بھی تو کیا؟ کیا چلا کر کہے، "اندر مت آؤ!" یا، "جلدی سے کپڑے پہن لو۔ ماں یہاں ہے!"؟ ہوسکتا ہے مَرکیتا کو داخل ہونے سے روکنے کا کوئی اس سے زیادہ ہوشیار ذریعہ رہا ہو لیکن کرل کے پاس کوئی تدبیر ڈھونڈ نکالنے کے لیے یہی بس دو ایک لمحے تھے اور اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ایک نوع کے وفورِ بشاشت سے شل ہو کر رہ گیا تھا جس کے باعث اس کی ساری حاضر دماغی رخصت ہوگئی تھی۔ سو اس نے کچھ بھی نہیں کیا، اور مَرکیتا سوائے اپنی مالا اور سرخ مخملیں پٹکے کے کمرے کی دہلیز پر الف ننگی نمودار ہوئی۔

ٹھیک اسی لمحے ماں ایوا کی طرف مڑی اور بڑی پیار بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہا، "تم بس سونے جا ہی رہی ہوگی، اور میں یہاں تمھیں الجھائے بیٹھی ہوں۔" ایوا، جس نے اپنے گوشۂ چشم سے مَرکیتا کو دیکھ لیا تھا، کہا، یا بلکہ چلا کر کہا کہ نہیں، جیسے آواز کے ذریعے اپنی دوست کی برہنگی کو ڈھانپنے کی کوشش کر رہی ہو۔ دریں اثنا، مَرکیتا ہوش میں آ کر پیچھے ہال میں کھسک چکی تھی۔

جب وہ چند لمحوں بعد ایک لمبا سا ہاؤس کوٹ پہنے کمرے میں دوبارہ داخل ہوئی، تو ماں نے جو ابھی ابھی ایوا سے کہا تھا وہی دہرا دیا، "میں اب تمھیں اور جگائے نہیں رکھنا چاہتی ہوں۔ تم سونے جا رہی ہوگی۔"

مَرکیتا اثبات میں سر ہلانے کو تیار تھی کہ کرل نے بڑی بشاشت کے ساتھ انکار میں گردن ہلا دی۔ "بالکل نہیں، ماں۔ ہم یہاں تمھاری موجودگی سے بہت خوش ہیں۔" سو بالآخر ماں کو دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کی خوشی کے اجتماع میں اپنے نظم پڑھنے کی صفائی کا موقع مل ہی گیا، جب آسٹریا ہنگری ایک دوسرے سے ٹوٹ گئے تھے اور پرنسپل نے اسکول کی ایک

فارغ التحصیل کو آ کر وطن دوستی کی نظم سنانے کے لیے مدعو کیا تھا۔

دونوں میں سے کسی عورت کو کچھ نہیں معلوم تھا کہ ماں کیا کہہ رہی ہے، لیکن کرل بڑی دلچسپی سے سنتا رہا۔ میں بالکل صاف صاف کہتا ہوں: بھولے ہوئے بند کے قصے میں اسے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ یہ پہلے بھی کئی بار سن چکا تھا، اور اتنی ہی بار فراموش بھی۔ جو بات اسے دلچسپ لگ رہی تھی وہ قصہ نہیں تھا جسے ماں بیان کر رہی تھی بلکہ قصہ بیان کرتی ہوئی ماں — ماں اور اس کی بڑی سی ناشپاتی دنیا جس پر ایک روسی ٹینک کسی چتی دار بھنورے کی طرح براجمان تھا۔ لڑکیوں کے کمرے کا دروازہ اور اس پر زور زور سے برستی ہوئی پرنسپل کی کریمانہ مٹھیاں، تو اِس نے دونوں جوان عورتوں کی مشتاقانہ بے چینی کو بالکل ایک طرف ڈال دیا تھا۔

معاملے کے اس رنگ ڈھنگ سے کرل کو بہت آسودگی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ایوا اور مرکیتا کو بڑے لطف سے دیکھنے لگا۔ ان کی برہنگی نائٹی اور ہاؤس کوٹ کے نیچے بے صبری سے لرز رہی تھی۔ اس نے تازہ جوش کے ساتھ پرنسپل، اسکول، اور پہلی جنگِ عظیم کے بارے میں بارِ دگر سوالوں کے ایک اور سلسلے کی بوچھاڑ شروع کر دی، اور طرّہ یہ کہ ماں سے اسی وطن پرستانہ نظم کی تلاوت کی درخواست کی جس کا آخری بند اسے یاد نہیں رہا تھا۔

ماں نے لمحے بھر کے لیے ارتکاز کیا۔ پھر، پورے انہماک کے ساتھ، نظم سنانی شروع کی جو اس نے تیرہ سال کی عمر میں اسکول کے اجتماع میں گائی تھی: ذرا وطن پرستانہ نہیں تھی، بلکہ یہ کرسمس ٹری اور ستارۂ بیت اللحم کے بارے میں چند شعر تھے۔ کسی کو بھی فرق کا اندازہ نہ ہوا، خود ماں کو بھی نہیں۔ وہ تو بس اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ اسے آخری بند یاد آ جائے گا یا نہیں۔ اور یہ اسے یاد تھا۔ بیت اللحم کا تارہ خوب چمک رہا تھا اور تینوں بادشاہوں کی چارے کی ناند تک رہ نمائی کر رہا تھا۔ وہ اپنی کامیابی سے جوش میں آ گئی تھی، ہنس رہی تھی اور سر فخر کے ساتھ جھٹک رہی تھی۔

ایوا تالیاں بجانے لگی۔ جب ماں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا، تو اسے وہ خاص الخاص بات یاد آ گئی جو وہ ان سے کہنے آئی تھی۔ "پتا ہے، کرل، تمھاری کزن مجھے کس کی یاد دلاتی ہے؟ نورا!"

کرل نے ایوا کو غور سے دیکھا، اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ "نورا؟ تمھاری دوست نورا؟"

اسے ماں کی دوست بچپن سے اچھی طرح یاد تھی۔ وہ بڑی غیر معمولی حسین عورت تھی — کشیدہ قامت اور پرتمکنت، اور چہرہ کسی شاہ بانو کی طرح شاندار۔ کرل کو وہ کبھی پسند نہیں آئی تھی — وہ گھمنڈی اور سرد مہر تھی — لیکن وہ کبھی اس سے آنکھیں نہیں جدا کر سکا تھا۔ اس میں اور لااُبالی ایوا میں بھلا کیا مشابہت ہو سکتی ہے؟

"بالکل ٹھیک،" ماں نے جواب دیا۔ "نورا! ذرا اسے دیکھو تو سہی۔ وہی پروقار ڈیل ڈول۔ اور وہی چال ڈھال۔ وہی ناک نقشا۔"

"ایوا، ذرا کھڑی تو ہو،" کرل بولا۔

ایوا کھڑے ہوتے ہوئے گھبرا رہی تھی۔ اسے یہ اطمینان نہیں تھا کہ اس کی مختصر سی نائٹی اس کے نسوانی اعضا کی پردہ پوشی کے لیے کافی ہوگی۔ لیکن کرل اتنے اصرار سے کہہ رہا تھا کہ اسے بالآخر حکم بجا لانا پڑا۔ وہاں کھڑے ہوئے، اس طرح کہ بازو پہلوؤں سے لگے ہوئے تھے، اس نے نائٹی کو جس قدر ممکن ہوسکے دوسروں کی توجہ میں لائے بغیر اپنے سامنے کھینچا تانا۔ اس درمیان میں کرل مذکورہ مشابہت تلاش کرتا رہا۔ اور اچانک وہ نظر آ ہی گئی — کھوج لگانے میں دور اور دشوار، لیکن بہرحال موجود۔ یہ مختصر سی جھلکیوں میں نظر آتی، جو تقریباً نظر آتے ہی زائل ہوجاتیں، تاہم کرل نے ان پر نظریں جمانے کی کوشش کی۔ وہ ایوا میں حسین نورا کا ایک دیرپا، پائیدار نقش زندہ کرنے کا آرزومند تھا۔

"مڑو،" اس نے حکم صادر کیا۔

ایوا مڑنا نہیں چاہتی تھی: اسے اگر کچھ خیال آ رہا تھا تو بس یہی کہ وہ اپنی نائٹی کے اندر کتنی برہنہ ہے۔ خود ماں بھی احتجاج کرنے لگی۔ "تم اس لڑکی کو کسی سپاہی کی طرح پریڈ نہیں کرا سکتے!" لیکن کرل گھٹنے ٹیکنے والا نہیں تھا۔

"نہیں، نہیں، میں بس چاہتا ہوں کے یہ مڑ کر دکھائے،" اس نے اصرار کیا، اور ایوا کو

آخر کار یہی کرنا پڑا۔

چلیے یہ نہ بھولیں کہ ماں کی بینائی خاصی خراب تھی۔ اسے پتھروں کی جگہ گانو دکھائی دیتے تھے، اور ایوا میں نورا۔ بس کرل کو اتنا ہی تو کرنا تھا کہ آنکھ مچکا کر دیکھے، اور اسے بھی پتھروں کی جگہ جھونپڑیاں نظر آ جاتیں۔ کیا وہ تمام ہفتہ ماں کے نقطۂ نظر پر رشک نہیں کرتا رہا تھا؟ سو اس نے آنکھ مچکائی، اور دریں چہ شک، اسے ایوا کے بجائے اپنے ماضی کی حسینہ نظر آئی۔

نورا کی ایک نا قابل فراموش خفیہ یاد اس کے حافظے میں جاگزیں تھی۔ جب وہ چار سال کا تھا تو ایک بار وہ ماں اور نورا ساتھ ساتھ اِسپا گئے تھے (اسے بالکل پتا نہیں تھا کہ یہ کہاں تھا)۔ انھوں نے اس سے کپڑے بدلنے کے کمرے میں انتظار کرنے کے لیے کہا اور اسے عورتوں کے کپڑوں کے انبار کے پاس چھوڑ کر چل دیں۔ وہ وہاں دیر تک کھڑا رہا۔ اتنے میں وہاں ایک کشیدہ قامت، شاندار، ننگی عورت در آئی — عورت کی پیٹھ بچے کی طرف تھی — اور دیوار میں لگے آنکڑے کی طرف ہاتھ بڑھایا جہاں اس کی باتھ روب ٹنگی ہوئی تھی۔ یہ نورا تھی۔

پیچھے سے نظر آنے والے اس تنے ہوئے ننگے جسم کا پیکر کبھی اس کی یاد سے محو نہ ہو سکا۔ اُس وقت وہ چھوٹا سا بالک تھا اور بہت نیچے سے اوپر نورا کی طرف دیکھا تھا۔ اپنے موجودہ قد کے لحاظ سے، اس نوع کی مسخ شدگی کے لیے، اسے اوپر پندرہ فٹ کے مجسمے کو دیکھنا پڑا ہوگا۔ وہ اس جسم سے اس قدر قریب تھا، اس کے باوجود اس قدر دور۔ دگنا دور۔ زمان اور مکان دونوں میں۔ وہ بلندیوں میں اس کے اوپر اٹھا ہوا تھا اور بے شمار برسوں کے فاصلے پر تھا۔ اس دہرے فاصلے نے چار سالہ بچے کا سر چکرا دیا تھا۔ اور اِس وقت ایک بار پھر اس کا سر چکرا رہا تھا، بڑی شدت سے۔

ایوا کو دیکھتے ہوئے (جو ابھی تک اس کی طرف پیٹھ کیے کھڑی تھی) اسے نورا نظر آئی۔ ان کے درمیان پانچ فٹ اور منٹ دو منٹ کا فاصلہ تھا۔

"ماں،" وہ بولا، "یہ تم نے بہت اچھا کیا کہ اس طرف آ نکلیں اور ہم سے باتیں کیں۔ لیکن اب لڑکیاں سونا چاہتی ہیں۔"

ماں انکسار اور تابعداری کے ساتھ اپنے کمرے لوٹ گئی، اور کرل فوراً دونوں عورتوں سے نورا کی بابت اپنی یادداشت کا ذکر کرنے لگا۔ وہ ایوا کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھ

گیا اور اسے یوں گھمایا کہ اس کی پیٹھ دوبارہ اس کے سامنے ہوگئی اور اس کی نگاہیں پھر سے اسی راہ پر گامزن ہوگئیں جس پر مدتوں پہلے بچپن میں ان کا اتفاق ہوا تھا۔

دم کی دم میں اس کا سارا تساہل غائب ہوگیا۔ اس نے ایوا کو فرش پر گھسیٹ لیا۔ جب وہ پیٹ کے بل ہوگئی تو کرل پھر اس کے پیروں کے پاس اکڑوں بیٹھ گیا اور نگاہیں اوپر اس کی ٹانگوں اور کولھوں پر رینگنے دیں۔ پھر وہ اس کے اوپر گر پڑا اور جفتی کرنے لگا۔

اسے محسوس ہوا کہ وہ جست جو اس نے ابھی ابھی لگائی تھی، غیر مختتم وقت کے دوسرے کنارے پر لگائی گئی تھی، ایک کودک کی زقند جو لڑکپن سے بلوغت کا راستہ لڑھکتے پڑھکتے طے کر رہا ہو۔ اور جب وہ اس کے جسم میں آگے پیچھے ہونے لگا، ہر بار اسے محسوس ہوا کہ وہ وقت میں آگے پیچھے آ جا رہا ہے، جیسے وہ طفولت سے بلوغت اور پھر واپس طفولت کی طرف حرکت کا خاکا کھینچ رہا ہو، وہ حرکت جو بہت بڑے نسوانی جسم کو بے بسی سے گھورتے ہوئے بچّے سے شروع ہو کر اس آدمی تک جا رہی ہو جو اس جسم کو گرفت میں لیے ہوئے ہو اور اسے سدھا رہا ہو۔ وہ حرکت، جو ناپ میں عام طور پر چھ انچ سے زیادہ لمبی نہیں ہوتی ہے، اتنی ہی طویل تھی جتنی تین دہائیاں۔

جلدی ہی دونوں عورتیں اس کے جنون میں شریک ہوگئیں۔ نورا سے وہ مَرکیتا کی طرف منتقل ہوا، اور واپس نورا کی طرف، اور ایک بار پھر مَرکیتا کی طرف۔ وہ خاصی دیر تک اسی کارروائی میں جُتے رہے تھے کہ اسے تھوڑے سے توقف کی ضرورت محسوس ہوئی۔ وہ بڑی زوردار حالت میں تھا اور پہلے کبھی خود کو اتنا توانا محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ آرام کرسی میں دھنس کر بیٹھ گیا اور دونوں عورتوں کو غور سے دیکھتا رہا جو اس کے سامنے صوفے پر پسری ہوئی تھیں۔ اس مختصر وقفے میں جو عورت اسے نظر آ رہی تھی وہ نورا نہیں تھی، یہ تو اس کی دو پرانی دوستیں تھیں، مَرکیتا اور ایوا، جو اس کی زندگی کی گواہی دے رہی تھیں۔ وہ اسے ایک استادِ فن کا سا احساس بخش رہی تھیں جس نے ایک دوسرے کے سامنے دھری شطرنج کی بساطوں پر اپنے دومدِ مقابل کو شکست دی ہو۔ اس تشبیہ سے اسے اتنی فرحت محسوس ہوئی کہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکا، "میں بوبی فشر ہوں۔" پھر وہ زور زور سے ہنسنے لگا اور خوب چلّا کر کہا، "میں بوبی فشر ہوں! میں بوبی فشر ہوں!"

12

جب کرل بوبی فشر ہونے کا نعرہ لگا رہا تھا (جس نے ٹھیک اسی زمانے میں آئس لینڈ میں ورلڈ چیمپین شپ جیت لی تھی)، ایوا اور مَرکیتا صوفے پر ایک دوسرے کی آغوش میں مدغم تھیں۔ ”ٹھیک ہے؟“ ایوا نے اپنی دوست کے کان میں سرگوشی کی۔

”ٹھیک ہے،“ مَرکیتا نے جواب میں کہا اور اپنے ہونٹ مضبوطی سے ایوا کے ہونٹوں پر جما دیے۔

گھنٹا بھر پہلے ایوا نے غسل خانے میں اس سے کہا تھا کہ وہ بھی اس کے یہاں آئے۔ اس نے کرل کو بھی مدعو کرنا چاہا ہوتا لیکن ایوا کا شوہر اور کرل دونوں ہی رقابت کا شکار تھے اور کبھی ایک دوسرے کی موجودگی کو برداشت نہ کر پاتے۔

شروع میں مَرکیتا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر وہ کیسے ہاں کر سکتی ہے، سو وہ صرف ہنس پڑی اور کچھ بھی نہ کہا۔ لیکن چند منٹ بعد، جب وہ لونگ روم میں بیٹھے تھے اور ساس کی بے مصرف چیں چیں اس کے کانوں کے پاس سے گزر رہی تھی، ایوا کی دعوت اسے اتنی ہی ناقابلِ انکار نظر آئی جتنی شروع میں ناقابلِ قبول معلوم ہوئی تھی۔ اس کا ایک سبب ایوا کے شوہر کا بھوت تھا۔ اور بعد میں، جب کرل نے چلّا کر اعلان کیا کہ وہ چار سالہ ہے اور اکڑوں بیٹھ کر ایوا کا جائزہ لینے لگا، تو مَرکیتا کو محسوس ہوا کہ وہ واقعی چار سالہ بچّے میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے اور اس سے بھی زیادہ سمٹ کر اپنے بچپن میں لوٹتا جا رہا ہے، دونوں عورتوں کو پیچھے ایک غیر معمولی فعّال مردانہ جسم کے ساتھ تنہا چھوڑ کر، ایک جسم جو اپنے کارگزار اور چاق و چوبند ہونے میں بالکل غیر شخصی معلوم ہو رہا تھا، خالی، کسی بھی روح کو جو وہ مہیّا کر سکیں قبول کرنے کے لیے تیار — مثلاً، ایوا کے شوہر کی روح، یا یوں کہیں، اس کے لیے کامل اجنبی، بے چہرہ اور بے ہیئت۔

مَرکیتا نے اس مشینی بدن کو اپنے ساتھ جفتی کرنے دی اور بعد میں اسے ایوا کی ٹانگوں کے بیچ گھستے ہوئے دیکھا، لیکن اس نے کوشش کی کہ اس کے چہرے کی طرف نہ دیکھے۔ وہ چاہتی تھی کہ اسے کسی اجنبی کا جسم سمجھے۔ یہ بہروپ کی محفل تھی۔ کرل نے ایوا پر نورا کا نقاب

منڈھ دیا تھا اور خود پر چار سالہ بچّے کا؛ مَرکیتا نے اس کا سر اس کے تن سے جدا کر دیا تھا۔ وہ بغیر سر کا مردانہ جسم تھا، کرل غائب ہو چکا تھا، اور ایک معجزہ رونما ہو رہا تھا۔ مَرکیتا بالکل آزاد اور من موجی تھی۔

کیا میں کرل کے اس شبہے کی تصدیق کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ مَرکیتا کے واسطے ان کی یہ سادہ شہوانی رنگ رلیاں درد و حرماں اور نفس کشی کی مشقوں سے زیادہ کچھ نہیں تھیں؟

نہیں، یہ معاملے کی غیر معمولی تسہیل ہوگی۔ مَرکیتا واقعی ان عورتوں کی خواہش مند تھی جن کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ کرل کی داشتائیں رہی ہیں۔ وہ اپنے جسم اور حواس دونوں ہی کے ساتھ ان کی خواہاں تھی۔ لیکن وہ عقل و فہم کے ساتھ بھی ان کی خواہاں تھی۔ ریاضی کے استاد کی پیش گوئی کے مطابق، وہ خود ہی پہل کرنے کی شیدائی تھی، چیزوں کو جاری رکھنے کی خواہش مند تھی، کرل کو انجانے میں پکڑ لینا چاہتی تھی — اور یہ سب، ظاہر ہے، اسی ناہنجار معاہدے کی حدود میں رہتے ہوئے۔

مصیبت صرف یہ تھی کہ کشادہ صوفے پر ان کے ساتھ لیٹتے ہی، سارے پرفریب شہوانی تصورات ذہن سے کوچ کر گئے۔ شوہر کو دیکھتے ہی وہ اپنے عادی کردار میں لوٹ آئی، جوڑے میں بہتر فریق ہونے کا کردار، وہی جسے جراحت پہنچتی ہے۔ اگرچہ وہ ایوا کے ساتھ تھی — جسے وہ بہت زیادہ پسند کرتی تھی اور کوئی رقابت محسوس کیے بغیر — تاہم اس آدمی کی موجودگی جسے وہ بے حد چاہتی تھی ایک بھاری بوجھ سی لگی جس نے حواس کی ساری لذت آفرینی پر پانی پھیر دیا۔

ٹھیک جس لمحے اس نے کرل کے سر کو اس کے جسم سے جدا کیا، اسے آزادی کا تازہ اور نشہ آور لمس محسوس ہوا۔ ان کے جسموں کی بے نامی ایک فوری بہشت کی طرح تھی، بازیافتہ بہشت۔ بھید بھری لذت کے ساتھ اس نے اپنی زخم خوردہ، ضرورت سے زیادہ چوکس روح کو محو کر دیا اور محض جسم بن گئی، وہ جسم جس کا نہ کوئی ماضی تھا اور نہ کوئی حافظہ اور، اسی لیے، جو اور بھی زیادہ خواہش مند اور قبولیت آمادہ تھا۔ اس نے پیار سے ایوا کا چہرہ تھپتھپایا، دریں اثنا کرل کا سر بریدہ جسم اس کے اوپر نہایت تندی سے حرکت کرتا رہا۔

لیکن یکبارگی بے سر کا جسم ٹھپ ہو گیا، اور ایک آواز نے، جو اسے ناگواری سے کرل

کی یاد دلا رہی تھی، ناقابلِ یقین طور پر "میں بوبی فشر ہوں! میں بوبی فشر ہوں!" کی مضحکہ خیز ہانک لگائی۔

یہ ایسا تھا جیسے الارم کلاک کی دخل اندازی کے باعث آدمی خوابوں سے جگا دیا جائے۔ اور ٹھیک جب مَرکیتا ایوا کو بھینچے ہوئے تھی (جس طرح لوگ صبح کے وقت دن کی افسردہ روشنی کو اپنے سے دور رکھنے کے لیے تکیوں کو بھینچ لیتے ہیں)، ایوا نے پوچھا تھا، "ٹھیک ہے؟" اور اس نے جواب میں کہا تھا "ہاں،" اور ایوا کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ ثبت کر دیے تھے۔ وہ اسے ہمیشہ اچھی لگتی تھی، لیکن آج پہلی بار وہ اپنے تمام حواس کے ساتھ اس کی شکرگزار تھی — اُس کی ذات کی، اس کے جسم کی، اس کی جلد کی — اور وہ جسمانی محبت کے اس برجستہ الہام سے مدہوش تھی۔

پیٹ کے بل، پہلو بہ پہلو پڑے پڑے، اس طرح کہ ان کی پیٹھیں تھوڑی سی بلند ہو رہی تھیں، مَرکیتا اس غیر معمولی طور پر فعّال جسم کی آنکھیں اپنی جلد پر محسوس کر سکتی تھی۔ جلد ہی یہ جسم ان کے ساتھ دوبارہ جفتی کر رہا ہوگا۔ اس نے اس آواز کو نظرانداز کرنے کی کوشش کی جو مسلسل حسین نورا کو دیکھنے کا ورد کر رہی تھی؛ اس نے مکمل جسم بن جانے کی کوشش کی، وہ جسم جو ایک پیاری دوست اور ایک بے سرے آدمی کو بھینچ رہا تھا۔

یہ سب ختم ہوتے ہی اس کی دوست فوراً سو گئی۔ مَرکیتا کو اس کی اس حیوانی نیند پر رشک آیا؛ وہ چاہتی تھی کہ اپنے تنفس کے ذریعے اس نیند کو اس کے لبوں سے اپنے میں جذب کر لے، اور اس کی لَے پر خود بھی سو جائے۔ وہ اس کے ساتھ خوب آرام سے چمٹ گئی اور کرل کو خیال دلانے کے لیے کہ دونوں ہی سو گئی ہیں آنکھیں موند لیں۔ جلد ہی کرل بھی برابر والے کمرے میں سونے کے لیے چلا گیا۔

صبح ساڑھے بجے مَرکیتا نے اس کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ کرل نے نیند میں ڈوبی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"واپس سو رہو۔ میں ایوا کا انتظام کر لوں گی،" وہ بولی اور نرمی سے اس کا بوسہ لیا۔ وہ پہلو بدلنے سے پہلے ہی پھر سو چکا تھا۔

"ہاں تو طے ہے نا؟" کار میں ایوا نے اس سے دوبارہ پوچھا۔

مَرکیتا کا ارادہ اب اتنا مصمّم نہیں رہا تھا جتنا گذشتہ رات تھا: ہاں، وہ ان کہنہ، غیر نوشتہ اقرار ناموں کو منسوخ کردینا چاہتی تھی۔ ہاں، وہ جوڑے کی بہتر فریق نہیں رہنا چاہتی تھی۔ لیکن یہ ان کی محبت کو تباہ کیے بغیر کیسے انجام دیا جاسکتا تھا؟ وہ کرل سے جس طرح محبت کرتی تھی اس کے ہوتے ہوئے یہ کیسے ممکن تھا؟

"فکر نہ کرو،" ایوا نے کہا۔ "اسے کبھی اس کی بھنک بھی نہیں لگے گی۔ تم دونوں نے جو ضابطہ طے کر رکھا ہے، اس کے حساب سے شک وشبہ تم کرسکتی ہو، وہ نہیں۔ اس میں خوف کی کوئی بات نہیں۔ یہ بات بھول کر بھی اس کے گمان میں نہیں آئے گی۔"

13

جب ایوا جھٹکے کھاتے ہوئے ڈبّے میں بیٹھی اونگھ رہی تھی، مَرکیتا اسٹیشن سے لوٹ کر دوبارہ سو گئی (اسے گھنٹا بھر بعد پھر اٹھنا تھا تاکہ وقت پر کام پر جاسکے)۔ اب کرل کی باری تھی۔ ماں کو ریل گاڑی میں پہنچانا اس کے ذمّے تھا۔ یہ میاں بیوی کی ریل گاڑیوں کے چکر لگانے والی صبح تھی۔ اگلے چند گھنٹوں میں (جب دونوں اپنے اپنے کام پر ہوں گے) ان کا لڑکا پلیٹ فارم پر اترے گا اور اِس سلسلۂ واقعات کو قطعی طور پر انتہا آشنا کردے گا۔

کرل ابھی تک شبِ رفتہ کے حسنِ بے پایاں سے لبریز تھا۔ اسے یہ بات بہت اچھی طرح معلوم تھی کہ ان دو یا تین ہزار جفتیوں میں سے جو اس نے کی تھیں (اس نے زندگی میں کل کتنی بار جفتی کی تھی؟) صرف دو تین ہی ایسی تھیں جنھیں اصلی اور ناقابلِ فراموش کہا جاسکتا ہو۔ بقیہ محض بازگشت تھیں، نقالی، تکرار، یا پرانی یادوں کی بازخوانی۔ اور اس سے بخوبی آگاہ کہ کل کی بیٹھک ان واقعی عظیم الشان دو تین میں سے ایک تھی، کرل بے حد وحساب ممنونیت سے لبریز تھا۔

اسٹیشن کے راستے میں ماں نے ایک لمحے کے لیے بھی اپنی بولتی بند نہ کی۔

اس نے کیا کہا؟

اول، اس نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ بیٹے اور بہو کے ساتھ بڑا اچھا وقت گزرا تھا۔

دوم، اس نے کرل کو وعظ دے ڈالا۔ انھوں نے اس کے ساتھ بڑی ناانصافی کی تھی:

جب وہ اور مَرکیتا اس کے یہاں مقیم تھے تو اس کے ساتھ کرل کا رویّہ برہمی کا رہا تھا۔ حتیٰ کہ اجڈ — اور اس میں لحاظ کی کمی تھی۔ ماں کو بہت زیادہ تکلیف پہنچی تھی۔ ہاں، اس نے اعتراف کیا، اِس بار وہ بہت اچھی طرح پیش آئے تھے، پہلے سے مختلف۔ ان میں تبدیلی آ گئی تھی۔ ہاں۔ لیکن انھیں اس میں اتنی تاخیر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

اس طویل فردِ جرم کو سنتے ہوئے (یہ اسے منہ زبانی یاد ہوگئی تھی)، وہ بالکل پراگندہ خاطر نہیں ہوا تھا۔ وہ گوشۂ چشم سے ماں کو دیکھتا رہا تھا اور اس پر دوبارہ تعجب محسوس کیا تھا کہ وہ کتنی چھوٹی سی نظر آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی ساری زندگی بتدریج سکڑنے کا عمل رہی ہو۔

لیکن اس سکڑنے کے عمل سے کیا نتیجہ نکلتا تھا؟

کیا یہ ایک شخص کا واقعی سکڑنا تھا جب وہ اپنی بلوغت کے تناسبات کو چھوڑنے اور اس طویل راہ پر گامزن ہونے لگا ہو جو بڑھاپے اور موت سے گزرتی ہوئی اس دور پار مقام کی طرف رواں ہو جہاں سب کچھ خلا اور تناسبات سے عاری ہے؟

یا یہ محض اس حقیقت کا زائیدہ بصری واہمہ تھا کہ ماں فاصلے میں ڈوبتی جا رہی ہے، کہ وہ کسی اور زمان و مکان میں پہنچ گئی ہے، کہ وہ اسے ایک چراغ، ایک گڑیا، ایک تتلی کی طرح نظر آنے لگی ہے۔

"ارے ہاں، نورا کیا ہوئی؟" ماں کے وعظ کے ایک درمیانی وقفے میں کرل نے پوچھا۔

"وہ اب بوڑھی عورت ہے، ظاہر ہے۔ تقریباً بالکل اندھی ہوگئی ہے۔"

"کیا کبھی اس سے ملاقات ولاقات ہوتی ہے؟"

"تمھیں پتا نہیں؟" ماں نے کافی جھلّا کے پوچھا۔ زمانہ ہوا دونوں عورتیں تعلق توڑ چکی تھیں۔ ان کی بڑی شدید تو تو میں میں ہوئی تھی اور کبھی دوبارہ مصلحت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ کرل کو یہ ضرور یاد رکھنا چاہیے تھا۔

"تمھیں وہ جگہ یاد ہے جہاں میرے بچپن میں ہم اس کے ساتھ چھٹیاں گزارنے گئے تھے؟"

"واہ، کیوں نہیں،" ماں نے کہا، اور ایک چیک اِسپا کا نام لے دیا۔ کرل اس سے

خوب واقف تھا، لیکن یہ اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ یہ وہی اِسپا تھا جہاں اس نے نورا کو برہنہ دیکھا تھا۔

اس نے وہاں کے خوبصورت دیہاتی علاقے کا تصور کیا، اس کے مسقف چوبی ستونوں کی قطار اور منقش ستونوں کا، اطراف و اکناف میں پھیلی ہوئی پہاڑیوں اور مرغزاروں کا جو چرتی ہوئی بھیڑوں کی گھنٹیوں کی آواز سے گونج رہے تھے۔ اور پھر اس نے نورا کے جسم کو اٹھا کر (کسی کولاژ کے فن کار کی طرح، جو ایک کندہ کاری کے نقش کا کچھ حصّہ کاٹ کر دوسرے نقش پر چسپاں کر رہا ہو) ٹھیک اسی خوابناک منظر کے بیچوں بیچ نصب کر دیا۔ اور یہ خیال اس کے ذہن سے گزرا کہ حسن وہ چنگاری ہے جو وقت کے پلّے پار دو عمروں کی ملاقات پر بھڑک اٹھتی ہے، کہ حسن سلسلہ وار وقت کا یکسر خاتمہ ہے، وقت کے خلاف ایک شورش۔

اور وہ اُس حسن، اور اس حسن پر احساسِ تشکّر سے سرتا سر لبریز ہو گیا۔ "ماں،" اس نے ناگہانی کہا، "مَرکیتا اور میں چاہتے ہیں کہ تم آ کر ہمارے ساتھ کیوں نہ رہو۔ ایک زیادہ کشادہ اپارٹ مینٹ ڈھونڈنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔"

"کرل، تمھاری بڑی مہربانی" وہ اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے بولی، "بڑی مہربانی۔ تمھیں یہ کہتے ہوئے سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔ لیکن، تم جانو، میرا پُوڈل پرانے گھر کا عادی ہو گیا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ آس پڑوس کی عورتوں سے میرا اچھا خاصا دوستانہ ہے۔"

اب وہ گاڑی پر سوار ہو چکے ہیں، اور کرل اس کے لیے ڈبا تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ سارے ڈبّے ٹھنسا ٹھس بھرے ہوئے اور خاصے غیر آرام دہ نظر آ رہے ہیں۔ بالآخر وہ اسے درجۂ اول کے ڈبّے میں بٹھا دیتا ہے اور کنڈکٹر کو زائد کرایا چکانے بھاگتا ہے۔ اور چونکہ بٹوہ تیار ہی ہے، وہ ایک سو کراؤن کا نوٹ نکال کر ماں کے ہاتھ میں یوں رکھ دیتا ہے جیسے وہ کوئی چھوٹی سی بچّی ہو جو کسی دور دراز کے سفر پر جا رہی ہو، اور ماں، کسی تعجب کا اظہار کیے بغیر، بڑے سرسری سے انداز میں نقد قبول کر لیتی ہے، اسکول کی کسی بچّی کی طرح جو بڑوں سے پیسوں کا تحفہ قبول کرنے کی عادی ہو۔

اور پھر گاڑی حرکت کرنے لگتی ہے — ماں کھڑکی سے لگی بیٹھی ہے، کرل پلیٹ فارم پر کھڑا ہے — اور دیر تک، آخری ممکنہ لمحے تک، ہاتھ لہراتا رہتا ہے۔

تیسرا حصہ

ملائک

1

رائنوسورس (*Rhinoceros*) [گینڈا] یوجین آئینسکو (Eugène Ionesco) کا کھیل ہے جس میں لوگ ایک دوسرے جیسے نظر آنے کی خواہش سے مغلوب ہوکر گینڈوں میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔ دو امریکی لڑکیاں، گیبرئیل (Gabrielle) اور مشیل (Michelle)، ریویرا کے ایک چھوٹے سے شہر میں غیر ملکیوں کو دیے جانے والے گرمیوں کی میقات کے کورس میں اس کھیل کا تجزیہ کررہی تھیں۔ وہ مادام رفائیل (Raphael) کی، جو ان کی استاد تھی، مرغوب ترین شاگرد تھیں، کیونکہ وہ ہمیشہ نظریں اس پر جمائے رکھتیں اور اس کے کہے ہوئے ہر ہر لفظ کو بڑی احتیاط سے نقل کرلیتیں۔ آج کے دن مادام نے انھیں ایک خاص کام سپرد کیا تھا: اگلی کلاس میں اس کھیل کی زبانی رپورٹ پیش کریں۔

"مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں کہ ان تمام لوگوں کی گینڈوں میں کایا کلپ کا کیا مطلب ہے؟" گیبرئیل نے کہا۔

"اسے ایک علامت کی طرح سمجھو،" مشیل نے جواباً کہا۔

"ٹھیک کہا،" گیبرئیل بولی۔ "ادب علامات کا ایک نظام ہے۔"

"اور گینڈا اولاً اور خاص طور پر ایک علامت ہے،" مشیل بولی۔

"خیر یہ تو ٹھیک ہے، لیکن اگر ہم یہ قبول کربھی لیں کہ وہ علامتوں کے بجائے گینڈوں میں تبدیل ہوگئے ہیں، تو وہ یہ فیصلہ کیسے کرتے ہیں کہ انھیں کن علامتوں میں تبدیل ہونا چاہیے؟"

"ہاں بھئی، یہ مسئلہ تو ہے،" مشیل نے افسردگی سے کہا۔ وہ واپس ڈورمیٹری جارہی تھیں

اور کچھ دیر تک خاموش خاموش چلتی رہیں۔

بالآخر گیبرئیل بول پڑی۔ "کیوں تمھارا کیا خیال ہے، یہ لِنگ کی علامت ہوسکتا ہے؟"

"کیا؟" مشیل نے پوچھا۔

"سینگ،" گیبرئیل نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے،" گیبرئیل نے کہا، پھر کچھ ہچکچائی۔ "لیکن سوال یہ ہے کہ وہ سب کے سب — مرد بھی اور عورتیں بھی — لِنگ کی علامتیں کیوں بن جاتے ہیں؟"

اب پھر وہ کچھ دیر خاموشی سے چلتی رہیں۔

"ابھی ابھی ایک خیال آیا ہے،" مشیل نے یکبارگی کہا۔

"کیا؟" گیبرئیل نے تجسّس کے ساتھ پوچھا۔

"مادام رفائیل نے اس کی طرف اشارہ بھی کیا تھا،" مشیل نے گیبرئیل کے تجسّس کو کچھ اور بھڑکانے کے لیے کہا۔

"تو بتاؤنا، وہ کیا ہے؟" گیبرئیل نے بے صبری سے پوچھا۔

"مصنف ایک فکاہی تاثر پیدا کرنا چاہتا تھا!"

گیبرئیل اپنی دوست کے بتائے ہوئے خیال میں اتنی جذب ہوگئی، جو اُدھیڑ بن اس کے ذہن میں ہورہی تھی اس میں اتنی منہمک ہوگئی کہ نادانستہ اس کی رفتار میں بتدریج سستی آگئی۔ دونوں لڑکیاں تقریباً ٹھہر گئی تھیں۔

"تم یہی کہنا چاہتی ہو نا کہ گینڈے کی علامت فکاہی تاثر پیدا کرنے کے لیے ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں،" مشیل نے جواب دیا، ایسی فخریہ مسکراہٹ کے ساتھ جیسے الہام ہوا ہو۔

دونوں لڑکیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، اپنی جرأت پر سحر زدہ، اور ان کے دہن کے گوشے فخر سے پھڑکنے لگے۔ پھر اچانک ان کے لبوں سے مختصر، تیز، سانس بھری آوازیں نکلنے لگیں جنھیں الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔

"ہنسی؟ کیا کوئی کبھی ہنسی کی پروا کرتا ہے؟ میرا مطلب ہے اصلی ہنسی کی — مذاق، استہزا، تمسخر سے پرے۔ ہنسی — ناپیدا کنار اہتزاز، فرحت انگیز اہتزاز، اہتزازوں کا اہتزاز...

"میں نے اپنی بہن سے کہا یا اس نے مجھ سے کہا، آؤ، مل کر ہنسی کا کھیل کھیلیں۔ ہم بستر پر برابر برابر پھیل گئے اور کھیل شروع کر دیا۔ پہلے پہل ہم اس کا سوانگ ہی رچاتے رہے، ظاہر ہے۔ زبردستی کے قہقہے۔ باعثِ خندہ قہقہے۔ اتنے قابلِ قہقہہ قہقہے کہ ہمارے قہقہے چھوٹ گئے۔ اور پھر وہ وارد ہوئی، سچ مچ کی ہنسی، مطلق ہنسی اور ہمیں لامنتہا وفور میں بہا لے گئی۔ ہنسی کے ٹھٹھے، نئے سرے سے ڈھنکی ہوئی پرانی ہنسی، کہنی مار ہنسی، گوشت اتری ہنسی، شاندار ہنسی، پُرتعیش اور وحشیانہ۔ ... اور ہم اپنے قہقہوں کی لامنتہا قہقہہ زنی پر ہنستے رہے۔ ...اے ہنسی! سرور بخش ہنسی، ہنسی کا سرور۔ خوب گہرا ہنسنا خوب گہرا زندہ رہنا ہے۔"

میں یہ متن عورتوں کی دنیا ("Woman's World") نامی کتاب سے نقل کر رہا ہوں۔ یہ 1974 میں ان پرجوش تانیثیت کی حامیوں میں سے ایک نے لکھی تھی جنھوں نے ہمارے عہد پر اپنا نشان چھوڑا ہے۔ یہ بہجت کا سرّی منشور ہے۔ استادگی کی آنی جانی نوعیت پر منحصر مرد کی جنسی خواہش پر لعن طعن کرنے کے بعد جو تشدّد، انہدام، اور دہشتناک انجام سے ہلاکت خیز طریقے پر منتہی ہے، مصنّف اس کی مثبت ضد کو سراہتی ہے — نسوانی نشاط، لذت، سرور — جس کا اظہار فرانسیسی کے لفظ jouisance سے ہوتا ہے — جو تسکین آور، ہمہ جائی، اور مسلسل ہوتا ہے۔ ہر عورت جو اپنی باطنی ذات سے سچّی ہوتی ہے ہر چیز میں مزہ لیتی ہے: "کھانے، پینے، موتنے، ہگنے، چھونے، سننے، یا محض سیدھے سادے ہونے میں۔" جنسی لذتوں کی یہ گنتی ایک ورد کی طرح پوری کتاب میں رواں دواں رہتی ہے۔ "زندہ رہنا مسرت ہے۔ دیکھنا، سننا، چھونا، پینا، کھانا، موتنا، ہگنا، پانی میں چھلانگ لگانا اور آسمان کا نظارہ کرنا، ہنسنا اور رونا۔" اور اگر جفتی خوبصورت ہے، تو یہ اس لیے کہ یہ تمام انفرادی حسیاتی لذتوں کا حاصل جمع ہے: "لمس، بصارت، سماعت، کلام، اور شامّہ، اور ساتھ ہی ساتھ پینا، کھانا، ہگنا، ملنا، اور رقص کرنا۔" چوسنا لذت آور ہے، جنم دینا لذت آور ہے، حیض کا سیلان لذت آور

ہے، "خون کا" وہ "معتدل، تقریباً میٹھا بہاؤ، وہ پیٹ کا کنکنا لعاب، وہ پراسرار دودھ، وہ درد جس میں مسرت کا جلتا ہوا مزہ ہو۔"

لذتوں کے اس منشور کا مذاق کوئی ٹھوٹھ ہی اڑا سکتا ہے۔ باطنیت (mysticism) اور مبالغے کا ساتھ چولی دامن کا ہے۔ ایک باطنی کو تمسخر کا خوف نہ ہونا چاہیے اگر اس کا منشا انکسار کی انتہا تک پہنچنا ہے، یا لذت کی انتہا تک۔ سینٹ تریسا (St. Theresa) اپنے کرب کے دوران مسکراتی تھی، اور سینٹ اینی لکلیر (St. Anni Leclerc) (اور یہ اس مصنّفہ کا نام ہے جس کی کتاب سے میں نقل کرتا رہا ہوں) یہ دعویٰ کرتی ہے کہ موت بہجت کا اٹوٹ جز ہے جس سے صرف مردوں کو ہی خوف آتا ہے، چونکہ وہ بڑے دردناک طریقے پر "اپنی گھٹیا اناؤں اور گھٹیا طاقت" پر تکیہ کرتے ہیں۔

قہقہے کی آواز معبدِ مسرت کی قبہ دار چھت کی طرح ہے، "وہ مسرت کی نشاط آور بے خودی، وہ قطعی اوجِ لذت۔ قہقہہٗ بہجت، بہجتِ قہقہہ۔" اس میں کوئی شک نہیں: یہ قہقہہ زنی "مذاق، تمسخر اور مضحکہ اڑانے سے کہیں دور" جاتی ہے۔ بستر میں پسری ہوئی دو بہنیں کسی ٹھوس چیز پر نہیں ہنس رہی ہیں، ان کی ہنسی کا کوئی موضوع نہیں؛ یہ تو وجود کا وجود پر اظہارِ مسرت ہے۔ کراہتے میں آدمی اپنے دکھی جسم کے فوری حال سے خود کو پیوست کر لیتا ہے (اور کاملاً ماضی اور مستقبل کے باہر ہوتا ہے)، اور اس وجدی قہقہے میں وہ سارا حافظہ کھو بیٹھتا ہے، ساری خواہش، اور دنیا کے فوری حال کو پکارتا ہے، اور کسی اور علم کا محتاج نہیں ہوتا۔

آپ یقیناً دوسرے درجے کی فلموں کے اس منظر سے واقف ہوں گے جس میں لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے بہار (یا گرما) کے منظرے سے دوڑے جا رہے ہیں۔ دوڑے جا رہے ہیں، دوڑے جا رہے ہیں، دوڑے جا رہے ہیں، اور ہنس رہے ہیں۔ پریمی اپنی ہنسی کے ذریعے ساری دنیا سے، ہر جگہ فلم کے تماش بینوں سے کہہ رہے ہیں، "دیکھو، ہم کتنے خوش ہیں، زندہ ہونا کتنا مسرت آگیں ہے، ہم وجود کے عظیم سلسلے سے کتنے کامل طور پر ہم آہنگ ہیں!" یہ احمقانہ منظر ہے، کچ زدہ منظر، اس کے باوجود یہ انسانی صورتوں کی سب سے زیادہ بنیادی صورت کا حامل ضرور ہے: "سنجیدہ ہنسی، مذاق سے بالا ہنسی۔"

تمام گرجے، زیر جامے بنانے والے تمام صنعت کار، تمام جرنیل، تمام سیاسی

جماعتیں، ان سب میں یہ ہنسی مشترک ہے؛ یہ سب کے سب اپنے مذہب، اپنی مصنوعات، اپنی آئیڈیالوجی، اپنی قوم، اپنی جنس، اپنے برتن دھونے کے مرکّبات کی تشہیر کے لیے اِن ہنستے ہوئے پریمیوں کا پیکر استعمال کرتے ہیں۔

اور یہی وہ ہنسی ہے جو اسٹیشنری اسٹور سے باہر آتی ہوئی مشیل اور گیبریئل ہنس رہی ہیں، ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، اور خالی ہاتھوں میں رنگین کاغذ، گوند، اور ربر بینڈز کے پیکٹ جھلاتے۔

"مادام رفائیل کو یہ بہت پسند آئے گا" گیبریئل کہتی ہے۔"تم دیکھنا۔" اور وہ ایک تیز آواز نکالتی ہے جس میں اس کی پھولی پھولی سانسوں کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔ مشیل قبولیت کا اظہار کرتی ہے اور جواب میں خود بھی یہی کرتی ہے۔

3

1968 میں میرے ملک پر روسیوں کے قبضے کے بعد جلد ہی (دوسرے ہزاروں لاکھوں چیک شہریوں کی طرح) مجھے بھی ملازمت کے حق سے محروم کردیا گیا۔ مجھے نوکری دینے کی کسی کو اجازت نہیں تھی۔ اس زمانے میں چند نوجوان رفیق باقاعدگی کے ساتھ مجھ سے ملنے آنے لگے۔ یہ اتنے نوعمر تھے کہ روسیوں نے ابھی انھیں اپنی فہرستوں میں شامل نہیں کیا تھا اور وہ اخباروں کے ادارتی دفتروں، اسکولوں، اور فلم اسٹوڈیوز میں قائم رہ سکتے تھے۔ ان نفیس نوجوانوں نے، میں جن کے ساتھ کبھی غدّاری نہیں کروں گا، مشورہ دیا کہ ریڈیو اور ٹیلی وژن اسکرپٹ، ڈرامے، مضامین، کالم، اور فلمی تنقید لکھنے کے لیے — یعنی روزی کمانے کے لیے — میں ان کے نام کی آڑ کیوں نہیں لے لیتا۔ میں نے ان کی چند ایک پیشکشوں کو قبول، لیکن زیادہ تر کو رد کردیا۔ اول تو یہی کہ ان سب سے عہدہ برا ہونا قابلِ عمل تھا ہی نہیں، پھر معاملہ بھی خطرناک تھا۔ میرے لیے نہیں، بلکہ ان کے لیے۔ خفیہ پولیس ہمیں بھوکا ماردینا چاہتی تھی، کفالت کے سارے ذرائع منقطع کردینا چاہتی تھی، ہمیں گھٹنے ٹیکنے اور علی الاعلان اعتراف کرنے پر مجبور کرنا چاہتی تھی۔ یہ فرار کی تمام حقیر اور ادنیٰ ترین راہوں کی کڑی نگرانی کررہی تھی جو ہم ان کے حصار سے بچ نکلنے کے لیے استعمال کرتے تھے، اور انھوں نے ان دوستوں

کو بڑی سخت سزائیں دیں جنھوں نے اپنے نام مجھے مستعار دیے تھے۔

انھیں فراخ دل عطیہ دینے والوں میں آر۔ نام کی لڑکی بھی تھی۔ (چونکہ ہر بات اب سامنے آ چکی ہے، اس کے معاملے میں مجھے کچھ مخفی رکھنے کی ضرورت نہیں۔) شرمیلی، نازک اندام، اور ذہین، وہ نوجوانوں کے بھاری تعداد میں بکنے والے مصوّر رسالے کی مدیر تھی۔ چونکہ اس زمانے میں رسالہ سوچ بچار سے عاری سیاسی خرافات کی کثیر مقدار شائع کرنے پر مجبور تھا جس میں ہمارے روسی بھائیوں پر تحسین کے ڈونگرے برسائے جاتے تھے، مدیران ہجوم کے لیے پرکشش مواد کی تلاش میں مسلسل سرگرداں رہتے تھے۔ بالآخر انھوں نے استثنائی طور پر جوتش سے متعلق کالم چھاپ کر مارکسی آیڈیولوجی کی پاکیزگی کی بے حرمتی کرنے کا فیصلہ کر ڈالا۔

اخراج و انقطاع کے ان دنوں میں مَیں نے کئی ہزار زائچے لکھ مارے۔ اگر عظیم یاروسلاف ہاشِک (Jaroslav Hasek) کتّوں کا کاروبار کر سکتا تھا (اس نے بہت سے چرائے ہوئے کتّے بیچے اور دوغلے کتّوں کو عالی نسب کہہ کر بھاری قیمتیں وصول کیں)، تو میں کیوں جوتشی نہیں بن سکتا تھا۔ ایک مرتبہ میرے پیرس کے دوستوں نے مجھے فرانسیسی نجومی آندرے باربول (André Barbault) کی کتابوں کا ایک پورا مجموعہ دیا تھا۔ پہلے صفحے پر اس کے نام کے ساتھ "نائب صدر، بین الاقوامی مرکزِ نجومیات" کا فاخرانہ خطاب جگمگا رہا تھا۔ ٹھیک اس کے نیچے، اپنے طرزِ تحریر کو چھپا کر، میں نے یہ رقم کر دیا تھا، "میلان کنڈیرا کے لیے، احترام کے ساتھ، آندرے باربول،" اور انتساب کردہ کتابوں کو اپنی ڈیسک پر غیر نمایاں طور پر ڈالے ہوئے میں اپنے پھٹی پھٹی آنکھوں والے پراگ کے سرپرستوں سے یہ وضاحت کرتا کہ ایک زمانے میں مَیں پیرس میں کئی ماہ تک باربول کا معاون رہ چکا تھا۔

جب آر۔ نے مجھ سے فرضی نام کے تحت اس کے رسالے میں جوتش کا کالم لکھنے کے لیے کہا تو، ظاہر ہے، مجھے فرحت محسوس ہوئی، اور میں نے اسے ہدایت کی کہ اپنے ایڈیٹوریل بورڈ کو متنبہ کر دے کہ کالم کا متن ایک اہم نیوکلیئر فزی سسٹ لکھے گا جس نے درخواست کی ہے کہ وہ اس کا اصلی نام ظاہر نہ کرے مبادا اس کے ہم کار اس کا مذاق اڑانے لگیں۔ اس سے ہماری کارروائی کو دہری آڑ میسر آ گئی: معدوم سائنس داں اور اس کا فرضی نام۔

سو اس طرح میرا فرضی نام سے نجومیات پر ایک طویل تعارفی مضمون لکھنے کا اتفاق ہوا

اور اس کے بعد مختصر، تقریباً احمقانہ ماہانہ کالم جن میں فرداً فرداً ہر برج کا ذکر ہوتا، اور ان کے ساتھ میری بنائی ہوئی 'ثور'، 'حمل'، 'سنبلہ'، 'حوت' کی ڈرائنگز ہوتیں۔ معاوضہ بے حد قلیل، اور کام بھی کوئی خاص تفریحی یا قابلِ ذکر نہیں۔ اس کا تفریحی حصہ بس میرا وجود ہی تھا، اُس آدمی کا وجود جسے تاریخ، ادبی حوالہ جاتی کتابوں، حتیٰ کہ ٹیلی فون کی کتاب سے بھی مٹا دیا گیا ہو، ایک مردہ جس کا حیرت انگیز آواگون مبلّغ کے روپ میں ہوا ہو جو ہزاروں لاکھوں نوجوان سوشلسٹوں کو نجومیات کی عظیم صداقتوں پر وعظ کر رہا ہو۔

ایک دن آر۔ نے بتایا کہ مدیرِ اعلیٰ اپنے جوتشی سے بہت جوش میں آ گیا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ اس کا ذاتی زائچہ نکال کر دے۔ یہ بات مجھے پرکشش لگی۔ رسالے میں مدیرِ اعلیٰ کی نوکری تمام تر روسیوں کی رہینِ منت تھی۔ اس نے آدھی زندگی مارکسزم۔ لینزم پر پراگ اور موسکو دونوں ہی میں کورس لیتے لیتے گزاری تھی!

"وہ مجھ سے یہ کہتے ہوئے کچھ شرم سی محسوس کر رہا تھا" آر۔ ہنسی۔ "وہ یقیناً یہ نہیں چاہتا کہ بات پھیل جائے، یہی کہ وہ اس قسم کے فرسودہ توہّمات یا اس قسم کی لغویات میں اعتقاد رکھتا ہے۔ بس اسے کریدسی ہے۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے،" میں نے کہا۔ میں خوش تھا۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ آر۔ کا بوس ہونے کے علاوہ، وہ جماعت کی سب سے بڑی کمیٹی کا رکن بھی تھا جس کا تعلق نوکری دینے اور نوکری سے برطرف کر دینے سے تھا، اور اس نے میرے بہت سے رفیقوں کی زندگیاں برباد کر ڈالی تھیں۔

"وہ بالکل گمنام رہنا چاہتا ہے۔ مجھے صرف اس کی تاریخِ ولادت بہم پہنچانے کی اجازت ہے۔ تمھیں بالکل پتا نہیں کہ وہ کون ہے۔"

"یہ اور بھی اچھا ہے۔" میں بالکل یہی تو سننا چاہتا تھا۔

"کہا ہے کہ تمھیں سو کراؤن معاوضہ دے گا۔"

"سو کراؤن؟" میں ہنس دیا۔ "وہ مجھے کیا سمجھتا ہے، کمینہ!"

اس نے مجھے ایک ہزار کراؤن بھجوائے۔ میں نے اس کے کردار، اس کے ماضی کے وقائع (جن سے میں بہت اچھی طرح واقف تھا)، اور اس کے مستقبل کے بارے میں دس

صفحے بھر دیے۔ اس تخلیق پر پورا ہفتہ لگایا اور آر۔ سے مسلسل صلاح مشورہ کرتا رہا۔ ظاہر ہے، زائچہ لوگوں پر بری طرح اثر انداز، حتیٰ کہ ان کے طریقِ کار پر مسلّط ہوسکتا ہے۔ وہ انھیں بعض باتوں کے کرنے کی تجویز دے سکتا ہے، بعض دوسری باتوں کو نہ کرنے کی تنبیہ، اور مستقبل کی تباہیوں کا حوالہ دے کر ان سے گھٹنے ٹکوا سکتا ہے۔

بعد میں آر۔ اور میں اس پر خوب دل کھول کر ہنسے۔ اس کا دعویٰ تھا کہ بوس کا برتاؤ بہتر ہوگیا ہے۔ اب وہ کم کم چلّانے لگا ہے۔ اپنے میں لچک کی کمی پر خلش محسوس کرنے لگا ہے ۔ اس کے زائچے نے ان کمزوریوں سے دامن بچانے کی ہدایت جو کی تھی۔ اس نے رحم کے بچے کھچے ذرے کو جس قدر ہوسکا استعمال کیا، اور خلا میں گھورتے ہوئے اس کی آنکھوں سے افسردگی کی علامات ہویدا ہونے لگیں، اس آدمی کی افسردگی جسے یہ احساس ہونے لگا ہو کہ اس کے نجوم کے پاس اسے دینے کے لیے سوائے بدبختی کے کچھ اور نہیں ہے۔

4

(دو قسم کی ہنسی کی بابت)

شیطان کو بدی کا حامی اور ملائک کو بھلائی کے جنگجو سمجھنے والے ملائک کی فتنہ انگیز خطابت (demagogy) کو قبول کرتے ہیں۔ لیکن اصل میں معاملہ کافی گنجلک ہے۔

ملائک بھلائی نہیں بلکہ خدا کی تخلیق کردہ کائنات کے حمایتی ہیں۔ دوسری طرف شیطان خدا کی کائنات میں کسی بھی معقول معنی کے وجود کا انکار کرتا ہے۔

عالمی غلبہ آوری، جیسا کہ سب جانتے ہیں، شیطانوں اور فرشتوں کے درمیان تقسیم ہوئی ہے۔ لیکن دنیا کی بھلائی کے لیے اس کی ضرورت نہیں کہ موخر الذکر اول الذکر پر افضلیت رکھیں (جیسا کہ میں اپنے لڑکپن میں خیال کرتا تھا)؛ بس طاقت میں ایک نوع کے توازن کی ضرورت ہے۔ اگر دنیا میں بہت زیادہ غیر متعارض معنی پائے جائیں گے (ملائک کی فرماں روائی)، تو آدمی بوجھ کے نیچے کچل کر رہ جائے گا؛ اور اگر دنیا اپنے سارے معنی سے تہی

ہوجائے (شیاطین کی فرماں روائی)، تو اس صورت میں بھی زندگی اتنی ہی ناممکن ہوگی۔

اشیا کی اپنے مفروضہ معنی اور نظامِ کائنات میں اپنے مبیّنہ مقام سے اچانک محرومی (موسکو میں تربیت حاصل کرنے والا مارکسی جو زائچوں میں اعتقاد رکھتا ہے)، ہمیں خندہ زن کردیتی ہے۔ چنانچہ، ابتداً، ہنسی شیطان کے دائرۂ عمل میں آتی ہے۔ اس میں ایک نوع کی خباثت داخل ہے (انجامِ کار اشیا اس سے مختلف نکلیں جو وہ نظر آنے کی کوشاں تھیں)، لیکن ایک نوع کی مخیّر آسودگی بھی (اشیا جیسی نظر آرہی تھیں اس سے زیادہ ڈھیلی ڈھالی نکلیں، ان کے ساتھ آسانی سے گزارہ کیا جاسکتا ہے، ان کی گمبھیرتا ہم پر جور و ستم نہیں کرتی)۔

جب ایک فرشتے نے پہلی بار شیطان کا قہقہہ سنا تو ہیبت زدہ رہ گیا۔ یہ ایک ضیافت کے درمیان پیش آیا جس میں بہت سارے لوگ موجود تھے، اور یکے بعد دیگرے شیطان کے قہقہے میں شامل ہوگئے۔ قہقہہ سخت متعدّی ثابت ہوا۔ فرشتہ اس سے بھی خوب آگاہ تھا کہ قہقہے کا ہدف خدا اور اس کے کارناموں کا نرالا پن ہے۔ اسے معلوم تھا کہ اسے فوری عمل کرنا ہے، لیکن اپنے کو کمزور اور بے کس پایا۔ اور اپنے طور پر خود کچھ اختراع کرنے سے معذور، اس نے بس اپنے غنیم کی حکمت عملی کو خود اسی کے خلاف استعمال کرڈالا۔ اس نے منہ کھولا اور صوتی آلے کے اوپری حصے سے ایک لڑکھڑاتی ہوئی سانس دار آواز نکالی (اس سے کافی ملتی جلتی جو گیبرئیل اور مشیل نے ریویرا کے اس چھوٹے سے شہر کی سڑکوں پر نکالی تھی) اور اسے مخالف معنی بخش دیے۔ جہاں شیطان کا قہقہہ اشیا کی لا معنویت کی طرف اشارہ کناں تھا، فرشتے کا چیخنا چلانا اس پر خوشی کے شادیانے بجانا تھا کہ روئے زمین پر ہر شے عقلی طور پر کتنی منظّم، سوچ بچار کی ہوئی، زیبا، اچھی، اور معقولیت پسند ہے۔

سو وہ وہاں کھڑے ہوئے تھے، شیطان اور فرشتہ، رو برو، منہ کھولے، دونوں ایک جیسی آوازیں نکالتے ہوئے، لیکن ہر ایک انفرادی طنین میں اپنا اظہار کرتا ہوا — ایک دوسرے کی مطلق ضد۔ اور خندہ بہ لب فرشتے کو دیکھتے ہوئے، شیطان اور زیادہ ہنسنے لگا، اور زیادہ بلند آواز میں ہنسنے لگا، اور زیادہ منہ کھول کر، کیونکہ ہنستا ہوا فرشتہ کہیں زیادہ قابل خندہ تھا۔

قابلِ خندہ ہنسی طوفانی ہوتی ہے۔ اور اس کے باوجود، ملائک نے اس سے کچھ نہ کچھ فائدہ اٹھایا ہے۔ انھوں نے ہم سب کو اپنے معنیاتی جعل سے جُل دیا ہے۔ ان کی نقلی ہنسی اور

اس کی اصل (شیطانی ہنسی) دونوں کا ایک ہی نام ہے۔ آج کل لوگوں کو اس کا احساس نہیں رہا کہ بالکل ایک ہی خارجی مظہر دو مکمل متضاد باطنی رویے اپنائے ہوئے ہے۔ دنیا میں دو طرح کی ہنسی ہے، اور ہمارے پاس ان میں فرق کرنے کے لیے الفاظ نہیں۔

5

خبروں کے ایک ہفتہ وار رسالے نے قطار لگائے ہوئے وردی پوش آدمیوں کی تصویر چھاپی جس میں وہ کندھوں پر بندوقیں لیے اور سروں پر پیکسی گلاس کے چھجے دار خود لگائے دکھائے گئے تھے۔ وہ ٹی شرٹ اور جینز ڈانٹے نوجوانوں کے گروہ کی سمت میں دیکھ رہے ہیں جو ہاتھ پکڑے دائرے میں رقص کر رہے ہیں۔

پولیس سے جو جھڑپ ہوئی تھی یہ بظاہر اس سے فوراً پہلے کا دور ہے اور پولیس والے کسی نیوکلئیر پلانٹ، ملٹری کی مشقوں کے کیمپ، سیاسی جماعت کے ہیڈکوارٹر، یا کسی سفارت خانے کی کھڑکیوں کی نگہبانی کر رہے ہیں۔ نوجوانوں نے اس مردہ وقت سے فائدہ اٹھانے کی خاطر دائرہ بنالیا ہے اور اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے دو قدم اٹھاتے ہیں، ایک قدم آگے، پہلے ایک ٹانگ اٹھتی ہے پھر دوسری — یہ سب کچھ ایک سادہ سی لوک دھن پر۔

میرا خیال ہے کہ میں انھیں سمجھتا ہوں۔ ان کی دانست میں یہ جو دائرہ انھوں نے زمین پر کھینچا ہے وہ طلسماتی ہے اور انھیں ایک حلقے میں مربوط کر رہا ہے۔ ان کے دل معصومیت کے شدید احساس سے چھلک رہے ہیں: انھیں کوئی 'مارچ' متحد نہیں کر رہی ہے، سپاہیوں یا فاشسٹ کمانڈوز کی طرح؛ ان کو تو ایک 'رقص' متحد کر رہا ہے، بچوں کی طرح۔ اور وہ سپاہیوں کے منہ پر اپنی معصومیت تھوک دینے پر بے صبرے ہو رہے ہیں۔

فوٹوگرافر نے بھی انھیں اسی طرح دیکھا تھا، اور اپنے مشاہدے کو رنگوں کے بڑے فصیح و بلیغ فرق کے ساتھ نمایاں کیا ہے: ایک جانب پولیس اپنے مراتب کے جھوٹے (مسلّط کیے ہوئے، حکم دادہ) اتحاد کے ساتھ، دوسری جانب نوجوان اپنے حلقے کے بخشے ہوئے حقیقی (مخلص اور نامیاتی) اتحاد میں؛ ایک طرف پولیس اپنی کمیں گاہ کی 'اداسی' میں، دوسری طرف

نوجوان اپنے کھیل کی 'مسرّت' میں۔

دائرے کا رقص جادوئی ہے۔ یہ ہم سے زمانوں پار انسانی حافظے کی گہرائیوں سے کلام کرتا ہے۔ مادام رفائیل نے تصویر رسالے سے تراشی تھی اور اسے گھورتے ہوئے خواب دیکھا کرتی۔ وہ بھی ایک حلقے میں رقص کرنا چاہتی تھی۔ ساری زندگی وہ ایسے گروہ کی جستجو میں رہی تھی جس کے ہاتھ پکڑ کر دائرے میں رقص کرے۔ اول اول اس نے انھیں میتھوڈسٹ گرجے میں تلاش کیا (اس کا باپ کٹّر مذہبی تھا)، پھر کمیونسٹ پارٹی میں، پھر ٹراٹسکیوں کے غول میں، پھر اسقاط کی مخالفت کرنے والی تحریک میں (ایک بچّے کو زندگی کا حق ہے!)، پھر اسقاط کی حمایت کرنے والی تحریک میں (ایک عورت کو حسبِ خواہش اپنا جسم استعمال کرنے کا حق ہے!)؛ اس نے انھیں مارکسیوں کے درمیان تلاش کیا، نفسیاتی تجزیہ کرنے والوں کے یہاں، اور ساختیات کے مدعیان کے یہاں؛ اس نے انھیں لینن میں تلاش کیا، زین بدھوں میں، ماؤزے تنگ، یوگیوں، نئ کہانی، بریختی (Brechetian) تھیٹر، سراسیمگی کے تھیٹر میں؛ اور آخر میں یہ تمنا کی کہ اور کچھ نہیں تو اپنے طالبِ علموں ہی میں گھل مل سکے، جس کا مطلب تھا کہ وہ انھیں وہی سوچنے اور کہنے پر مجبور کرتی تھی جو خود سوچتی اور کہتی تھی، اور یوں وہ باہم واحد جسم اور واحد روح بن جاتے تھے، واحد حلقہ اور واحد رقص۔

اس کی دو امریکی شاگردائیں ڈورمیٹری کے کمرے میں آئینسکو کے رائنوسورس کے متن کے مطالعے میں غرق تھیں۔ مشیل بہ آواز بلند پڑھ رہی تھی:

"منطقی (بوڑھے آدمی سے): کاغذ لو اور یہ قضیہ حل کرو۔ اگر ہم دو بلّیوں سے دو پنجے لیں، تو ہر بلّی کے کتنے پنجے باقی رہیں گے؟

"بوڑھا آدمی (منطقی سے): متعدّد حل ممکن ہیں۔ ... ایک بلّی کے چار پنجے ہوسکتے ہیں، بقیہ کے دو۔ ... ایک بلّی کے پانچ پنجے ہوسکتے ہیں ... اور دوسری کا ایک۔ ... اگر ہم آٹھ سے دو پنجے منہا کردیں، ... تو ہمارے پاس چھ پنجوں والی ایک بلّی ہوسکتی ہے ... اور ایک ایسی جس کا سرے سے کوئی پنجہ نہ ہو۔"

"میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی کیسے بلّی کے پنجے کاٹ سکتا ہے،" مشیل نے اپنی قراءت میں مخل ہوتے ہوئے کہا۔ "تمھارا کیا خیال ہے، 'وہ' کاٹ سکتا ہے؟"

"مشیل!" گیبرئیل نے زور سے کہا۔

"اور ایک بلّی کے چھ پنجے کیسے ہو سکتے ہیں؟"

"مشیل!" گیبرئیل نے پھر کہا۔

"کیا؟" مشیل نے پوچھا۔

"اتنی جلدی بھول گئیں؟ تمھیں نے تو کہا تھا!"

"کیا؟" مشیل نے دوبارہ پوچھا۔

"مکالمہ فکاہی تاثر پیدا کرنے کے لیے ہے۔"

"اوہ، ہاں، یہ ٹھیک ہے،" مشیل بولی، گیبرئیل کی طرف ایک خورسند نظر ڈالتے ہوئے۔ دونوں لڑکیوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا، پھر ان کے منہ کے گوشے فخر سے پھڑ پھڑانے لگے، اور آخر میں انھوں نے اپنے اپنے صوتی آلے کے اوپری حصے سے ایک مختصر سی سانس دار آواز نکالی۔ اور پھر ایسی ہی ایک اور، اور پھر ایک اور۔ زبردستی کی ہنسی۔ قابل ہنسی ہنسی۔ ہنسی اتنی قابلِ ہنسی کہ انھیں ہنسی آ گئی۔ اور پھر وہ وارد ہوئی — سچ مچ کی ہنسی، مطلق ہنسی — اور انھیں ایک لا منتہا وفور میں بہا لے گئی۔ ہنسی کے ٹھٹھے، نئے سرے سے دُھنکی ہوئی پرانی ہنسی، کہنی مار ہنسی، گوشت اتری ہنسی، شاندار ہنسی، پُرتعیّش اور وحشیانہ۔ ... اور وہ اپنے قہقہوں کی لامنتہا قہقہہ زنی پر ہنستی رہیں۔ ... اے ہنسی! سرور بخش ہنسی، ہنسی کا سرور ..."

دریں اثنا مادام رفائیل ریویرا کے چھوٹے سے شہر کی سڑکیں ناپتی رہی، بالکل اکیلی۔ اچانک اس نے سر اوپر اٹھایا جیسے ہوا کے دوش پر کسی نغمے کا شائبہ محسوس ہوا ہو، دور افتادہ سرزمینوں سے آتی ہوئی کوئی آوارہ مہک۔ وہ رک گئی اور روح کی گہرائیوں میں کسی خلا کی باغیانہ چیخ سنی جو بھر جانے کی تمنا کر رہا ہو۔ اسے یوں لگا جیسے کہیں قریب ہی کسی عظیم قہقہے کی لوٹمار ہی ہو اور شاید کہیں، بہت زیادہ دور نہیں، لوگوں کا ایک گروہ ایک دوسرے سے ہاتھ جوڑے دائرے میں رقص کر رہا ہو۔ ...

وہ وہاں کچھ دیر کھڑی رہی، اپنے گردوپیش پر مضطربانہ نظر ڈالی۔ وہ پُراسرار موسیقی آناً فاناً معدوم ہو گئی (مشیل اور گیبرئیل نے اچانک ہنسنا بند کر دیا تھا؛ اور محبت سے عاری اکیلی رات کے خیال پر ان کے چہروں پر افسردگی چھا گئی)، اور مادام رفائیل، جو عجیب سی بے چینی اور جھنجلاہٹ محسوس کر رہی تھی، ریویرا کے اس چھوٹے سے شہر کی گرم سڑکوں سے ہوتی ہوئی گھر لوٹ گئی۔

6

میں نے بھی کبھی ایک دائرے میں رقص کیا تھا۔ یہ 1948 کی بہار کا موسم تھا۔ کمیونسٹوں نے ابھی ابھی میرے ملک کا اختیار سنبھالا تھا، سوشلسٹ اور کرسچن ڈیموکریٹ وزیر باہر بھاگ گئے تھے، اور میں نے دوسرے کمیونسٹ طلبہ کے ہاتھ پکڑے، بانہیں ان کے شانوں پر ڈالیں، اور وہیں کھڑے کھڑے ہم نے دو قدم اٹھائے، ایک قدم آگے، پہلے ایک ٹانگ اٹھائی، پھر دوسری، اور ہم نے یہ عمل تقریباً ہر ماہ دہرایا، کیونکہ منانے کے لیے کچھ نہ کچھ رونما ہوجاتا تھا، یہاں ایک برسی، وہاں کوئی خاص موقع، پرانی غلطیوں کا ازالہ کیا گیا، نئی غلطیوں کے مرتکب ہوئے، کارخانوں کو قومیایا گیا، ہزاروں کو جیل خانے کی ہوا کھلائی گئی، طبّی امداد مفت ہوگئی، چھوٹے موٹے دکاندار اپنی دکانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے، عمر رسیدہ کام کاروں نے زندگی میں پہلی بار ضبط شدہ مضافاتی گھروں میں چھٹیاں منائیں، اور ہم خوشی کی مسکراہٹ مسکرائے۔ ایک دن میں نے کچھ کہا جو بہتر ہوتا کہ ناگفتنی چھوڑ دیا ہوتا۔ مجھے جماعت سے نکال دیا گیا اور دائرے کو چھوڑنا پڑا۔

اُسی وقت میں دائرے کی طلسماتی خوبیوں سے آگاہ ہوا۔ قطار سے نکلو تو ہمیشہ اس میں واپس شامل ہو سکتے ہو۔ قطار ایسی تشکیل ہے جو ہر طرف سے کھلی ہوتی ہے۔ لیکن ایک بار جب حلقہ بند ہوجائے، تو واپسی کا کوئی امکان نہیں رہتا۔ یہ کوئی اتفاقی امر نہیں کہ سیّارے دائرے میں حرکت کرتے ہیں اور جب کبھی ایک پتھر ان میں سے کسی سے ٹوٹ کر گر پڑتا ہے تو مرکز گریز قوت کے باعث ناگزیراً اس سے دور ہوتا جاتا ہے۔ کسی شہابِ ثاقب کی

طرح جو اپنے سیّارے سے ٹوٹ گیا ہو، میں بھی اپنے حلقے سے گر پڑا اور ٹھیک اُس وقت سے مسلسل گرتا جارہا ہوں۔ بعضے جب تک مر نہیں جاتے حلقے میں رہتے ہیں، بعض دوسرے ایک طویل ہبوط کی انتہا پر پاش پاش ہوجاتے ہیں۔ موخر الذکر (میرے گروہ والوں) میں مدوّر رقص کی بابت ایک دبا دبا سا ناسٹلجیا ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ ظاہر ہے، ہم میں سے ہر فردِ واحد اس کائنات کا باشندہ ہے جہاں ہر شے دائرے میں گردش کرتی ہے۔

ان خدا جانے کس بات کی برسیوں میں سے کسی کے موقعے پر پراگ کی سڑکوں پر بارِ دگر نوجوانوں کا ہجوم تھا جو دائرے میں رقص کررہے تھے۔ میں ایک حلقے سے دوسرے میں گھومتا رہا، جس قدر ہوسکا ان کے قریب کھڑا ہوگیا، لیکن مجھے داخلے کی ممانعت تھی۔ یہ 1950 کی جون کا مہینہ تھا، ملادا ہراکووا (Milada Horakova) کی پھانسی کے بعد والا دن۔ وہ قومی مجلس میں سوشلسٹ پارٹی کی نمائندہ تھی، اور ایک کمیونسٹ عدالت نے اسے حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کا مجرم قرار دیا تھا۔ اسے چیک سُرئیلسٹ اور آندرے بریتوں (André Breton) اور پول ایلوار9 کے دوست زاوش کلندرا (Zavis Kalandra) کے ساتھ پھانسی دی گئی۔ اور یہ بخوبی جانتے ہوئے کہ ان کے شہرِ زیبا میں ٹھیک ایک دن پہلے ایک عورت اور ایک سُرئیلسٹ تختۂ دار پر چڑھایا گیا ہے، یہ نوجوان چیک دنادن رقص کرتے رہے، اور کچھ اور زیادہ جنون کے ساتھ کیونکہ ان کا رقص ان کی معصومیت کا مظہر تھا، وہ پاکیزگی جو دو عوامی دشمنوں کی سیاہ کمینگی کے خلاف اتنی تابناکی سے چمک رہی تھی جنھوں نے اپنے ہم وطنوں اور ان کی امیدوں سے غداری کی تھی۔

آندرے بریتوں کو یقین نہیں تھا کہ کلندرا نے لوگوں اور ان کی امیدوں سے غداری کی تھی، اور ایلوار سے (ایک کھلے خط میں جو پیرس میں 13 جون 1950 کو لکھا گیا تھا) مطالبہ کیا کہ وہ اس واہیات الزام کے خلاف احتجاج کرے اور ان کے پرانے پراگی رفیق کو بچانے کی کوشش۔ لیکن ایلوار اس وقت اُس دیوہیکل دائرے میں لاتحاشا مصروفِ رقص تھا — جس نے پیرس، موسکو، وارسا، پراگ، سوفیا، اور ایتھنز کو اپنے حلقے میں لیا ہوا تھا، تمام سوشلسٹ ممالک اور ساری دنیا کی کمیونسٹ جماعتوں کو اپنے حلقے میں لیا ہوا تھا — اور بہجت اور اخوت کی مدح میں خوبصورت نظمیں سنانے میں بہت زیادہ منہمک۔ بریتوں کا خط پڑھنے

کے بعد، ایلوار نے اپنی جگہ پر دو قدم اٹھائے، ایک قدم آگے، سر ہلایا، اور اس آدمی کی حمایت سے انکار کردیا جس نے عوام سے غداری کی تھی (رسالہ ایکشن کی 19 جون 1950 کی اشاعت میں)، اور اس کے بجائے، ٹھن ٹھناتی آواز میں قراءت فرمائی:

We shall fill innocence
With the strength we have
So long been lacking
We shall never again be alone.

اور پراگ کی سڑکوں پر ہنستے اور رقص کرتے ہوئے چیک باشندوں کے حلقوں کے پاس سے گزرتے ہوئے مجھے پتا تھا کہ میرا تعلق کلندرا سے ہے، اِن سے نہیں، اس کلندرا سے جو خود بھی اِن کے مدوّر خطِ پرواز سے ٹوٹ کر گر پڑا ہے، گر پڑا ہے، گر پڑا ہے، ٹھیک ایک ملزم کے تابوت میں، لیکن اس کے باوجود کہ میرا ان سے کوئی رشتہ نہ تھا، میں انھیں رشک اور ناسٹلجیا کے ساتھ دیکھنے سے باز نہ رہ سکا، ان سے نگاہیں نہ ہٹا سکا۔ اور تبھی وہ مجھے دکھائی دیا، ٹھیک میرے سامنے!

وہ بانہیں ان کے شانوں پر رکھے وہی سادہ سے دو تین بول گا رہا تھا اور پہلے ایک ٹانگ اٹھاتا، پھر دوسری۔ ہاں، اس میں کوئی شک نہیں تھا۔ پراگ کو پیش کی جانے والی تہنیت۔ پول ایلوار! یکبارگی اس کے ہم رقصوں نے گانا بند کردیا اور مکمل خاموشی میں اپنی حرکات جاری رکھیں جبکہ وہ ان کے پانو کی تھاپ پر اپنی نظم گنگناتا رہا:

We shall flee rest, we shall flee sleep
We shall outstrip dawn and spring
And we shall fashion days and seasons
To the measure of our dreams.

اور پھر یکلخت وہ سب کے سب وہی تین یا چار سادہ سے بول الاپ رہے تھے، رقص کی رفتار میں تیزی آ گئی تھی، آرام اور نیند سے بھاگ رہے تھے، وقت سے آگے نکلے جارہے تھے، اور اپنی معصومیت کو طاقت سے پُر کیے دے رہے تھے۔ ہر شخص مسکرا رہا تھا اور

ایلوار نیچے ایک لڑکی کی طرف جھکا جس کے گرد اس کی بانہیں تھیں اور بولا۔

A man possessed by peace never stops smiling.

اور لڑکی مسکرائی ،اور زور زور سے اپنے پیر زمین پر مارنے لگی اور فٹ پاتھ سے چند انچ اوپر اٹھ گئی، اور دوسروں کو بھی اپنے ساتھ کھینچ لیا، اور جلد ہی ان میں سے ایک بھی زمین کو نہیں چھور ہا تھا، وہ اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے دو قدم اٹھا رہے تھے اور ایک قدم آگے بغیر زمین چھوئے ہوئے، ہاں، ہاں وہ وین سسشلوس چوک کے اوپر بلند ہو رہے تھے، ان کا حلقہ بالکل ایک دیو قامت گول ہار کا پیکر نظر آ رہا تھا جو مائلِ پرواز ہو، اور میں ان کے پیچھے زمین پر دوڑ پڑا، اوپر ان کی طرف دیکھتا رہا، اور وہ پرواز کرتے رہے، پہلے ایک ٹانگ اٹھاتے، پھر دوسری، اور نیچے — پراگ اپنے شاعروں سے بھرے قہوہ خانوں اور غداروں سے اَٹے جیل خانوں سمیت، اور وہ بھٹی میں ایک سوشلسٹ نمائندے اور ایک سُریلسٹ کا قصہ پاک کر رہے تھے، اور دھواں کسی اچھے شگون کی طرح آسمان کی بلندیوں کی طرف محوِ پرواز تھا، اور میں نے ایلوار کی کھن کھناتی آواز سنی جو گا رہی تھی،

Love is at work it is tireless

اور میں اس امید میں سڑکوں پر اس آواز کے تعاقب میں بھاگا کہ جسموں کے اس دل بھاونے گول ہار کا ساتھ دوں جو شہر کے اوپر بلند ہو رہا تھا، اور میں نے دل میں کرب کے ساتھ محسوس کیا کہ وہ پرندوں کی طرح پرواز کر رہے تھے اور میں پتھر کی طرح نیچے گرتا جا رہا تھا، اور ان کے پر تھے اور یہ مجھے کبھی میسّر نہ ہوں گے۔

7

پھانسی کے سترہ سال بعد کلندرا مکمل بحال ہو گیا تھا، لیکن چند ماہ بعد ہی روسی ٹینک بوہیمیا پر

چڑھ آئے، اور دیکھتے دیکھتے ہزاروں نئے لوگوں پر عوام اور ان کی امیدوں سے غداری کرنے کا الزام لگایا گیا، اقلیت کو جیل خانے پہنچا دیا گیا، اکثریت کو روزگار سے برطرف، اور دو سال بعد (دوسرے لفظوں میں، وین سسٹلوس چوک پر ایلوار کے بلند ہونے کے ٹھیک بیس سال بعد) ایک تازہ متّہم (میں) چیک نوجوانوں کے لیے نکلنے والے مصوّر رسالے میں جوتش کا کالم لکھ رہا تھا۔ 'قنطور' (جس کے حساب سے دسمبر 1972 کی تاریخ نکلتی ہے) پر میرے کالم کے سال بھر بعد، ایک جوان آدمی مجھ سے ملنے آیا جس سے میں ناواقف تھا۔ اس نے ایک لفظ کہے بغیر مجھے ایک لفافہ تھما دیا۔ میں نے چاک کر کے خط پڑھا، لیکن یہ اندازہ کرنے میں کچھ دیر لگی کہ یہ آر۔ کی جانب سے تھا۔ اس کا خطِ تحریر بالکل مختلف تھا۔ اسے لکھتے وقت وہ بہت زیادہ پریشان رہی ہوگی۔ اس نے جملے کچھ اس طرح مرتّب کیے تھے کہ صرف میں ہی انھیں سمجھ سکتا تھا، نتیجے میں خود میں بھی بہت کچھ سمجھنے سے رہ گیا۔ حقیقت میں، جتنا بھی سمجھ میں آیا اس کا لبِ لباب یہ تھا کہ اب، واقعے پر پورا سال گزرنے کے بعد، میری شناخت کر لی گئی ہے۔

اس زمانے میں میری رہائش ایک یک نفری اپارٹ مینٹ میں پراگ کی کوتاہ لیکن مشہور سڑک بارتھولومسکا (Bartolomejska) میں تھی۔ دو عمارتوں کو چھوڑ کر (جن میں سے ایک میں میرا قیام تھا) باقی سب پولیس کی ہیں۔ چوتھی منزل کی بڑی سی کھڑکی سے دیکھنے پر مجھے چھتوں کے اوپر پراگ کے قلعے کی برجیاں اور نیچے پولیس کے صحن نظر آتے تھے۔ وہ سب کے سب ان برآمدوں سے گزر چکے تھے: کلندرا، ہوراکووا، کلےمینتس، اور میرے دوست سبتا (Sabata) اور ہبل (Hubl)۔

جوان آدمی نے (ہر چیز سے مجھے یہی قیاس ہوا کہ وہ آر۔ کا منگیتر ہے) گرد و نواح پر بڑی چوکنّی نظر ڈالی۔ ظاہر ہے اسے اندیشہ تھا کہ پولیس نے میرے اپارٹ مینٹ میں نگرانی کے خفیہ آلات لگا رکھے ہوں گے۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر سر ہلایا — ہم نے ابھی تک ایک لفظ کا تبادلہ بھی نہیں کیا تھا — اور باہر سڑک پر نکل آئے۔ کچھ دیر تک خاموش خاموش چلتے رہے، اور جب تک پرشور خیابانِ نارودنی (Narodni) نہ پہنچ گئے اس نے بتا کر نہ دیا کہ آر۔ مجھ سے ملنے کی خواہش مند ہے۔ اس کا ایک دوست، جس سے میں واقف نہیں

تھا، ہمیں پراگ کے مضافات میں اپنا اپارٹ مینٹ خفیہ ملاقات کے لیے استعمال کرنے پر راضی تھا۔

سو اگلے دن میں ٹرام پر خاصا لمبا سفر کر کے پراگ کے سواد میں جا پہنچا۔ میرے ہاتھ منجمد ہو گئے تھے، اور وسطِ صبح کی ساعتوں میں ایک جیسے اپارٹ مینٹوں کی قطاریں بالکل ویران پڑی تھیں۔ بالآخر میں نے صحیح عمارت ڈھونڈ نکالی، لفٹ سے تیسری منزل پر پہنچا، دروازے پر چسپاں ناموں پر نظر ڈالی اور گھنٹی بجائی۔ اپارٹ مینٹ پُرسکوت تھا۔ دوبارہ گھنٹی بجائی، لیکن کوئی دروازے پر نہیں آیا۔ میں واپس نیچے سڑک پر آیا اور کوئی گھنٹا بھر عمارت کے گرد چکّر لگاتا رہا، یہ خیال کر کے کہ آر۔ کو آنے میں دیر ہو گئی ہے اور جب وہ پہنچے گی تو میں اسے ٹرام سے اتر کر فٹ پاتھ کی جانب آتا ہوا دیکھ لوں گا۔ لیکن کوئی آ کر نہ دیا۔ میں پھر لفٹ سے تیسری منزل پر آیا اور دوبارہ گھنٹی بجائی۔ چند لمحوں کے بعد مجھے اپارٹ مینٹ کے اندر پانی کے بہنے کی آواز سنائی دی۔ یکلخت مجھے احساس ہوا جیسے فکر کا ایک برفانی ڈلا ٹھیک میرے جوفِ شکم میں گھسیڑ دیا گیا ہو۔ خود میرے جسم کی گہرائیوں میں مجھے اس لڑکی کا خوف محسوس ہوا جو اپنے اضطرابِ شکم کے باعث دروازہ کھولنے سے معذور رہی تھی۔

اس نے دروازہ کھولا۔ زرد پڑی ہوئی تھی لیکن مسکرا رہی تھی، اور اس نے ہمیشہ جیسے تپاک کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اس نوع کا بے تکا ہنسی مذاق کیا جیسے، خیر، سو ہم یہاں ہیں، بالآخر تنہا، ایک خالی اپارٹ مینٹ میں۔ ہم بیٹھ گئے اور اس نے بتایا کہ ابھی حال ہی میں پولیس نے اسے جرح کے لیے بلایا تھا۔ انھوں نے پورا دن اس سے پوچھ تاچھ کی۔ پہلے دو گھنٹے غیر اہم چیزوں کی بابت پوچھتے رہے، اور اسے محسوس ہوا تھا کہ صورتِ حال مکملاً اس کے قابو میں ہے۔ وہ ان سے ہنسی مذاق کرتی رہی اور ان سے چلبلے پن کے ساتھ پوچھا کہیں ان کا یہ خیال تو نہیں تھا کہ وہ اس قسم کی مہمل گفتگو کے لیے اپنا لنچ ناغہ کرے گی۔ یہ اُس وقت جب انھوں نے اس سے پوچھا تھا، تمھارے جوتش کے کالم کون لکھتا ہے؟ وہ سرخ پڑ گئی اور مشہور فزسسٹ کے بارے میں کچھ کہنے کی کوشش کی جس کے نام کا انکشاف کرنے کی اسے آزادی نہیں تھی۔ تم میلان کنڈیرا سے واقف ہو؟ انھوں نے پوچھا۔ اس نے بتایا کہ واقف ہے۔ کیا اس میں کوئی عیب کی بات ہے؟ کچھ بھی عیب کی بات نہیں، انھوں نے جواب

دیا۔ لیکن کیا تم جانتی ہو کہ مسٹر میلان کنڈیرا کو نجومیات سے دلچسپی ہے؟ نہیں، وہ یہ نہیں جانتی تھی۔ تو تمھیں اس کی بابت کچھ علم نہیں، وہ ہنسے۔ سارا پراگ اس کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے اور تم کچھ بھی نہیں جانتیں؟ وہ تھوڑی دیر کے لیے پھر اپنے نیوکلیئر فرسٹ کی طرف لوٹ گئی، لیکن ان میں سے ایک اس پر چیخنے چلّانے لگا اور بولا کہ جھوٹ مت بولو۔

اس نے انھیں حقیقت بتادی۔ رسالے نے جوتش کا ایک اچھا سا قابلِ خواندہ کالم لکھوانے کا فیصلہ کیا تھا لیکن لکھنے والا کوئی مل نہیں رہا تھا، اور چونکہ وہ مجھ سے واقف تھی، مجھ سے مدد کرنے کے لیے کہا۔ اسے یقین تھا کہ اس نے کوئی قانون نہیں توڑا ہے۔ وہ درست کہہ رہی تھی، انہوں نے اتفاق کیا، اس نے کوئی قانون نہیں توڑا تھا۔ لیکن اس نے ادارے کے نجی قواعد کی خلاف ورزی ضرور کی تھی جن کی رو سے بعض ایسے اشخاص سے معاملہ کرنے کی ممانعت تھی جو نہ جماعت کے اعتماد کے مستحق تھے، نہ ملک کے۔ اس نے توجہ دلائی کہ یہ کوئی ایسی سنگین بات نہیں تھی: مسٹر کنڈیرا کا نام ایک فرضی نام کے پیچھے پوشیدہ رہا تھا اور ممکن نہیں کہ اس سے کسی کو گزند پہنچی ہو۔ باقی رہا اس کو ملنے والا معاوضہ، خیر، تو وہ اتنا حقیر تھا کہ اس کا ذکر ہی کیا۔ انھوں نے ایک بار پھر اس سے اتفاق کیا: نہیں، کوئی سنگین بات نہیں تھی، اور اب وہ ان سب باتوں کو رقم کریں گے اور اس سے دستخط کرنے کے لیے کہیں گے، اور اسے کسی چیز کے بارے میں ذرا تردّد نہیں کرنا چاہیے۔

اس نے دستخط کر دیے، اور دو دن بعد مدیرِ اعلیٰ نے اسے بلا بھیجا اور کہا کہ اس کی فوری چھٹی کر دی گئی ہے۔ وہ اسی روز 'چیکوسلوواک ریڈیو' گئی، جہاں اس کے کچھ دوست تھے جو زمانے سے اسے اپنے یہاں بلا رہے تھے۔ انھوں نے اس کا بڑی خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا، لیکن اگلے دن جب وہ رسمی معاملات نبٹانے آئی، عملے کا سربراہ، جو اسے بہت پسند کرتا تھا، اترے چہرے کے ساتھ اس سے ملا۔ "آخر تم ایسی حرکت کیسے کر بیٹھیں؟ تمھاری زندگی تباہ ہو گئی ہے۔ میں تمھارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔"

پہلے پہلے وہ مجھ سے گفتگو کرنے سے ڈر رہی تھی۔ پولیس نے اس سے وعدہ کروایا تھا کہ وہ کسی کو جرح کی سن گن نہیں ہونے دے گی۔ لیکن جب اسے ان کی جانب سے دوبارہ طلبی کا پروانہ ملا (اس کا اگلے دن ان سے ملنا مقرر تھا)، تو اس نے فیصلہ کیا کہ اب مجھ سے

چوری چھپے ملنا ناگزیر ہوگیا ہے تاکہ اگر ہم یکساں بیان پر اتفاق کر لیں اور اگر مجھے بھی طلب کر لیا جائے تو متضاد باتیں نہ کریں۔

براہِ کرم آر۔ کو غلط نہ سمجھیں۔ وہ کوئی رونی بچّی نہیں۔ بس نوخیز تھی اور دنیا کے طور و طریق سے بہت زیادہ آگاہ نہیں تھی۔ پہلی ضرب نے اسے انجانے میں آلیا تھا، اور وہ اسے کبھی نہیں بھولنے والی تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ مجھے وہ ڈاکیا منتخب کیا گیا ہے جس کا کام لوگوں کو خبردار کرنا اور عقوبتیں پہنچانا تھا؛ مجھے اپنے سے خوف آنے لگا۔

"تمھارا کیا خیال ہے، انھیں معلوم ہے تمھیں زائچہ بنانے کے ہزار کراؤن ملے تھے؟"

"پریشان مت ہو۔ کوئی بھی جس نے مارکسزم ۔لیننزم پڑھنے میں تین سال گزارے ہوں اپنی جنم پتری بنوانے کا اقرار نہیں کرے گا۔"

وہ ہنس دی، اور اگرچہ ہنسی بمشکل آدھا لمحہ قائم رہی ہوگی، میں نے اسے نجات کی واجبی سی امید فرض کرلیا۔ یہ بالکل ویسی ہی ہنسی تھی جس کی خواہش میں نے 'حوت'، 'سنبلہ'، اور 'حمل' کے متعلق وہ احمقانہ سے مضامین لکھ کر کی تھی، ٹھیک ویسی ہی ہنسی جسے میں اپنا اجر سمجھتا تھا، اور جو کبھی ملا نہیں۔ دریں اثنا دنیا کے تمام اہم عُہدوں، تمام عمومی عملوں پر ملائک قبضہ کیے بیٹھے تھے؛ انھوں نے دایاں بھی ہتھیا لیا تھا اور بایاں بھی، عرب بھی اور یہودی بھی، روسی جرنیل بھی اور روسی اختلافی بھی۔ وہ ہر جانب سے ہمیں حقارت کے ساتھ یخ بستہ نگاہوں سے گھور رہے تھے اور ہمارا مسخروں کا رنگ برنگا لباس تن سے جدا کیے دے رہے تھے جو ہم لاابالی پن کا سوانگ رچانے کے لیے پہنے ہوئے تھے اور ہمیں وہ عام سے چالباز بنائے دے رہے تھے جو سوشلسٹ نوجوانوں کے لیے شائع کیے جانے والے رسالوں میں کام کرتے ہیں، حالانکہ ہمارا ایمان نہ جوانوں میں ہے نہ سوشلزم میں، جو مدیرانِ اعلیٰ کے لیے جنم پتریاں بناتے پھرتے ہیں، حالانکہ ہم مدیرِ اعلیٰ اور زائچہ دونوں ہی کو مضحکہ خیز سمجھتے ہیں، جو فضول چیزوں میں ہمارا وقت برباد کرتے ہیں جبکہ دوسرے تمام لوگ (یساری اور یمینی، عرب اور یہودی، روسی جرنیل اور روسی اختلافی) انسان کے مستقبل کے لیے برسرِ پیکار ہیں۔ ہمیں محسوس ہوا کہ ان کی گھورتی ہوئی نگاہوں کا بوجھ ہمیں ان کیڑے مکوڑوں میں تبدیل کیے دے رہا ہے جن کا مقسوم پانو کے نیچے کچلا جانا ہے۔

میں نے اپنے تردّد پر قابو پایا اور آر۔کے لیے اگلے دن پولیس کے یہاں عمل کرنے کے لیے غایت درجے کا معقول منصوبہ برآمد کرنے کی کوشش کی۔ ہماری گفتگو کے درمیان وہ متعدد بار اٹھ کر غسل خانے گئی۔ ہر بار پانی بہنے کی آواز اور ندامت آمیز سراسیمگی کے ساتھ لوٹی۔ وہ بہادر لڑکی اپنے خوف پر شرمسار تھی۔ وہ خوش اسلوب عورت ایک اجنبی کے سامنے اپنے پیٹ کے گڑبڑ ہونے پر شرمندہ تھی۔

8

مختلف قومیت کے کوئی پچیس کے لگ بھگ طلبہ اپنی اپنی ڈیسکوں کے پیچھے بیٹھے ہوئے جوش میں آئی ہوئی مشیل اور گیبرئیل کو حیرت زدہ دیکھ رہے تھے۔ وہ پوڈیم کے سامنے کھڑی ہوئی تھیں، جہاں مادام رفائیل بیٹھی ہوئی تھی، اور دونوں کے ہاتھوں میں کاغذوں کے کئی کئی صفحے تھے — ان کی لکھی ہوئی روداد کا متن — اور عجیب سی گتّے کی چیز جس سے ربر بینڈ لٹک رہی تھی۔

"ہم آئینسکو کے رائنوسورس کے متعلق گفتگو کریں گی،" مشیل نے کہا، اور سر نیچے جھکایا تاکہ گتّے کی تکون کو جو رنگ برنگے کے کاغذوں کی کترنوں سے مزیّن تھی سرکا کر ناک پر جمائے اور سر کے پیچھے ربر بینڈ سے مضبوط کر لے۔ گیبرئیل نے بھی یہی کیا۔ پھر دونوں مڑیں، ایک دوسرے کو دیکھا اور چھوٹی چھوٹی بڑی باریک اور بلند، سانس دار آوازیں نکالنے لگیں۔

جماعت کو یہ سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی کہ لڑکیاں دو باتوں کی وضاحت کر رہی تھیں: (1) کہ گینڈے کی ناک پر ایک سینگ ہے اور (2) کہ آئینسکو کے ڈرامے کا مدعا ظرافت ہے۔ انھوں نے دونوں نکتوں کی وضاحت صرف الفاظ کر ذریعے ہی نہیں بلکہ اپنے جسموں کے استعمال سے بھی کی تھی۔

ان کی گفتگو کے دوران لمبے لمبے تکون ان کے چہروں پر اوپر نیچے ڈولتے رہے، اور جماعت ایک نوع کی ہمدردانہ سراسیمگی میں گم صُم ہوگئی۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی شخص جماعت

کے سامنے کھڑا ہوا اپنے کٹے ہوئے بازو کی نمائش کر رہا ہو۔

اس حکمتِ عملی کی داد دینے والی صرف مادام رفائیل تھی، جس نے اپنی مرغوب شاگرداؤں کی تیز، بلند اور سانس دار آوازوں کا جواب ایسی ہی آوازیں خود بھی نکال کر دیا۔

لڑکیوں نے اپنی آگے کو نکلی ہوئی ناکوں کو خوشی سے ہلایا، اور مشیل اپنے حصے کی روداد پڑھنے لگی۔

وہاں سارہ نامی ایک نوجوان اسرائیلی لڑکی بھی موجود تھی۔ چند دن پہلے اس نے دونوں امریکی لڑکیوں سے پوچھا تھا کہ کیا وہ ان کے لیے ہوئے نوٹس دیکھ سکتی ہے (سب کو معلوم تھا کہ وہ دونوں مادام رفائیل کا کہا ہوا ہر لفظ نقل کر لیتی ہیں)، لیکن انھوں نے انکار کر دیا تھا۔ "بیچ پر جانے کے لیے کلاس گول نہ کیا کرو۔" بس تبھی سے وہ ان سے سخت متنفر ہو گئی تھی، اور اسے یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی تھی کہ دونوں اپنی بھد اُڑوا رہی ہیں۔

مشیل اور گیبرئیل نے باری باری رئنوسورس پر اپنا تجزیہ پڑھا، ان کے گتے کے تکون لاحاصل دعاؤں کی طرح آگے کو نکلے رہے۔ سارہ کو لگا کہ اس قسم کے موقعے کو ہاتھ سے نکل جانے دینا بڑی افسوسناک بات ہوگی۔ مختصر سے وقفے کے دوران جب مشیل، گیبرئیل کی طرف متوجہ ہو کر بتا رہی تھی کہ اب اس کی باری ہے، سارہ اپنی نشست سے اٹھی اور دونوں لڑکیوں کی طرف چل دی۔ اپنا حصہ پڑھنے کے بجائے گیبرئیل نے اپنی حیرت زدہ گتے کی ناک کا سوراخ ٹھیک سارہ کی جانب کر دیا۔ سارہ ان کے قریب آئی، چل کر ان کے پیچھے گئی (زائد ناکوں کے بوجھ سے ان کے سر اتنے جھکے ہوئے تھے کہ وہ یہ دیکھنے سے معذور تھیں کہ ان کے پیچھے کیا ہو رہا ہے)، نشانہ لیا، اور مشیل کے کولھے پر لات ماردی، پھر نشانہ لیا، اور گیبرئیل کو بھی ایک لات رسید کر دی۔ اس کے بعد وہ بڑے سکون — نہیں، بڑے وقار — کے ساتھ اپنی نشست پر لوٹ گئی۔

ایک لمحے تک مطلق خاموشی رہی۔

پھر مشیل کی آنکھوں سے آنسو نکل کر اس کے گالوں پر بہنے لگے اور، لمحہ بھر بعد، گیبرئیل کے گالوں پر بھی۔

پھر جماعت بے قابو ہو کر ٹھٹھے مارنے لگی۔

پھر سارہ دوبارہ بیٹھ گئی۔

پھر مادام رفائیل، جسے پہلے تعجب اور صدمہ ہوا تھا، بات سمجھ گئی: سارہ کی بد اطواری طلبہ کے بڑی احتیاط سے مرتب کیے ہوئے مذاق کا ایک پہلے سے طے شدہ حصہ تھی جو ڈرامے کی معنویت سے قریب آنے کے لیے تھا (فنی کاموں کی تدریس کے لیے ہمیں ترسیل کے پرانے نظری ذریعوں سے آگے جا کر عملی انطباق، غیر صوتی تجزیہ، درونِ جماعت واردات جیسی جدید عملیات سے کام لینا چاہیے!)، اور چونکہ وہ اپنی پیاریوں کے آنسو دیکھنے سے قاصر تھی (اس لیے کہ وہ جماعت کے رخ کھڑی ہوئی تھیں اور ان کی پیٹھ اس کی طرف تھی)، سر پیچھے جھٹک کر پرمسرت رضامندگی کا قہقہہ لگانے لگی۔

اپنے پیچھے محبوب استانی کو ہنستے ہوئے سن کر، مشیل اور گیبرئیل کو یوں محسوس ہوا جیسے ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی گئی ہو۔ ان کی آنکھوں سے آنسو یوں ٹپکنے لگے جیسے ٹونٹی سے پانی۔ سبک سری کا احساس اتنا زیادہ تکلیف دہ تھا کہ دونوں یوں تڑپنے لگیں جیسے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہی ہو۔

مادام رفائیل نے اپنی پیاریوں کے تڑپنے کو رقص سمجھا، اور کسی قوتِ محرّکہ کے باعث، جو اس کے پیشہ ورانہ وقار سے کہیں زیادہ طاقتور تھی، یکلخت کرسی سے پھسل گئی۔ وہ اتنی شدت سے ہنس رہی تھی کہ آنسو نکل آئے، اور جسم پھڑکنے لگا۔ وہ بانہیں پھیلا کر سر آگے پیچھے یوں جُھلانے لگی جیسے کوئی اُلٹائی ہوئی گھنٹی ہو جسے گرجے کا چوکیدار لوگوں کو فوری عبادت کے واسطے بلانے کے لیے بجا رہا ہو۔ وہ تڑپتی ہوئی لڑکیوں کے پاس آئی اور مشیل کا ہاتھ تھام لیا۔ اب وہ تینوں جماعت کے سامنے کھڑی لوٹ پوٹ رہی تھیں اور گالوں پر آنسو بہہ رہے تھے۔ مادام رفائیل نے مطلوبہ قدم اٹھائے، پہلے ایک ٹانگ، پھر دوسری۔ ابھی تک روتی ہوئی دونوں لڑکیوں نے جھجکتے ہوئے اس کے اتباع کی کوشش کی۔ اب ان کی گتّے کی ناکیں پانی سے شرابور ہو گئی تھیں، لیکن وہ اپنی جگہ پر کھڑی بل کھاتی اور کودتی پھاندتی رہیں۔ پھر مادام رفائیل نے گیبرئیل کا ہاتھ پکڑ کے جماعت کے سامنے ایک چھوٹا سا حلقہ بنالیا۔ اب وہ تینوں ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑے ہوئے تھیں، قدم اٹھا رہی تھیں اور پیر جھٹک رہی تھیں، اور کمرے میں گول گول گھوم رہی تھیں۔ پہلے ایک ٹانگ اٹھاتیں، پھر دوسری، اور نامحسوس طور

پر ان کے گریہ سے مسخ شدہ چہرے قہقہوں سے مسخ شدہ چہروں میں بدل گئے۔

جب وہ قہقہے لگاتی ہوئی رقص کر رہی تھیں اور ان کی ناکیں تلملا رہی تھیں، جماعت گونگی دہشت میں انھیں دیکھتی رہی۔ لیکن اب رقص کرتی ہوئی عورتیں کسی کی طرف متوجہ نہیں تھیں، وہ بس کلی طور پر اپنے اور اپنی بے خودی میں مگن تھیں۔ اچانک مادام رفائیل نے پہلے سے زیادہ زور سے پیر مارا اور کمرے کے فرش سے چند انچ اوپر بلند ہوگئی۔ اس کے اگلے قدم کو فرش چھونا میسّر نہ ہوا۔ اس نے دونوں دوستوں کو اپنے ساتھ اوپر کھینچا اور جلد ہی تینوں کی تینوں فرش کے گرد گھوم رہی تھیں اور چکر کی طرح ہولے ہولے اوپر کی طرف حرکت کر رہی تھیں۔ جوں ہی ان کے بال چھت سے ٹکرائے، چھت کھل گئی اور وہ شگاف سے ہو کر اوپر نکل گئیں۔ پہلے ان کی گتّے کی ناکیں غائب ہوئیں، پھر جوتوں کی تین جوڑیاں باقی رہ گئیں، اور پھر جوتے بھی معدوم ہو گئے، اور دم بخود طلبہ صرف تین اعلیٰ منصب فرشتوں کے شاندار، معدوم ہوتے ہوئے قہقہے کے ساتھ رہ گئے۔

9

مانگے تانگے کے اپارٹ مینٹ میں میری آر۔ سے ملاقات فیصلہ کن تبدیلی ثابت ہوئی۔ یہ بات تبھی ٹھیک سے میری گرفت میں آئی کہ میں بدشگونیوں کا پیامبر تھا اور اگر چاہتا تھا کہ میرے پیاروں کو ضرر نہ پہنچے تو ان کے درمیان اور نہیں رہ سکتا تھا۔ بس اب صرف یہی کر سکتا تھا کہ ملک چھوڑ کر چلا جاؤں۔

لیکن آر۔ سے اپنی آخری ملاقات کو یاد رکھنے کی میرے پاس ایک وجہ اور ہے۔ میں ہمیشہ ہی اس کا شیفتہ رہا تھا، لیکن غایت درجہ معصومانہ انداز میں جس میں جنس کا کوئی گزر نہیں تھا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے اس کا جسم ہمیشہ اس کے تابدار ذہن، اس کے باحیا طور وطریق، اور کپڑوں کے انتخاب میں اس کے بے حد نفیس ذوق کے پیچھے مکملاً چھپا ہوا ہو۔ اس نے کبھی ایک ادنیٰ سی درز مجھے پیش نہیں کی تھی کہ جس سے اس کی برہنگی کی ضوفشانی کا نظارہ کر سکوں۔ اور اب یکلخت خوف کی چھری نے اسے چاک کر کے رکھ دیا ہے۔ وہ میرے سامنے اتنی کھلی

ہوئی تھی جیسے کسی بچھیا کا مردہ جسم جسے بیچ سے کاٹ کر آنکڑے سے ٹانگ دیا گیا ہو۔ اب ہم ایک مستعار لیے ہوئے اپارٹ مینٹ میں صوفے پر ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھے ہوئے تھے، پس منظر میں خالی ٹوائلیٹ کے بھرنے کی کلکلاتی ہوئی آواز تھی، اور اچانک اس سے جفتی کرنے کی شدید خواہش نے مجھے آلیا۔ یا یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا، اس سے جبریہ جفتی کرنے کی خواہش نے۔ خود کو اس پر ڈال دوں اور اس کے تمام ناقابلِ برداشت اشتعال انگیز تضادات، اس کے بے عیب پہناووں، اس کے باغی شکم، اس کی عقل اور اس کے خوف، اس کے فخر اور اس کی زبونی کے ساتھ اس پر قابض ہوجاؤں۔ یہ اس قسم کے تضادات ہی تھے، مجھے محسوس ہوا، جو اس کا حقیقی جوہر تخلیق کرتے تھے — وہ خزانہ، وہ سونے کا ڈلا، وہ ہیرا جو اس کی گہرائیوں میں کہیں دبا پڑا تھا۔ میرا جی چاہا کہ اس پر کود پڑوں اور اسے چیر کر نکال لاؤں۔ میرا جی چاہا کے اسے اپنے حلقے میں لے لوں — اس کے فُضلے اور اس کی کم آمیز روح کو۔

لیکن مجھے اپنے پر جمی دو مشوش آنکھوں کا احساس بھی ہوا (ایک دانا چہرے میں دو مشوش آنکھیں)، اور یہ آنکھیں جتنی زیادہ مشوش تھیں، اسی تناسب سے میری خواہش بھی تند و تیز تھی، جتنی زیادہ مشوش وہ آنکھیں تھیں، اتنا ہی زیادہ یہ سب مضحکہ خیز، مہمل، باعثِ رسوائی، ناقابلِ فہم، ناقابلِ تصوّر ہوگیا۔

اس دن جب میں اس مانگے کے اپارٹ مینٹ سے رخصت ہوا اور باہر ہاؤزنگ ڈیویلپمینٹ کی سنسان سڑک پر نکل آیا (وہ، اس خوف سے کہ کوئی ہمیں ساتھ نہ دیکھ لے، کچھ دیر تک اوپر ہی ٹھہر رہی)، اس نفیس لڑکی، اپنی دوست کے ساتھ جبریہ جفتی کرنے کی بے پایاں خواہش کے علاوہ کسی اور چیز کی بابت نہ سوچ سکا۔ وہ خواہش ہنوز مجھ میں جاگزیں ہے، جھولی میں پھنسی ہوئی کسی چڑیا کی طرح، چڑیا جو گاہے بگاہے بیدار ہوکر پر پھڑ پھڑانے لگتی ہے۔

آر۔ سے جبریہ جفتی کرنے کی وہ وحشیانہ خواہش شاید محض گرتے ہوئے کسی چیز کو پکڑ لینے کی ایک بے جگرانہ کوشش تھی۔ کیونکہ اس دن کے بعد سے جب انھوں نے مجھے اپنے حلقے سے نکال دیا میں مسلسل گرتا ہی جارہا ہوں، ہنوز گر رہا ہوں، انھوں نے بس اتنا ہی کیا ہے کہ مجھے ایک اور دھکا دے دیں تاکہ اپنے ملک سے اور دور، اور زیادہ گہرائی میں جا پڑوں، اور

ایسی دنیا کے خلا میں جو فرشتوں کے دہشت ناک قہقہے سے گونج رہی ہے اور جو اپنے شور سے میرے ہر لفظ کو ڈھانپ لیتا ہے۔

سارہ، میری یہودی بہن سارہ، وہیں کہیں ہے، یہ مجھے معلوم ہے۔ لیکن میں اسے کہاں پا سکتا ہوں؟

[اوپر دیے گئے اقتباسات Annie Leclerc کی کتاب *Parole de femme* (1976)؛ Paul Éluard کی (1951) *Le Visage de la paix*؛ اور Eugène Ionesco کی (1959) *Rhinocéros* سے لیے گئے ہیں۔]

چوتھا حصہ

گمشدہ خطوط

1

میرے حساب کتاب کے مطابق روئے زمین پر ہر لحظہ دو یا تین افسانوی کرداروں کا بپتسمہ ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ جب بھی ان بپتسمہ دینے والے یوحناؤں کے جمِ غفیر میں داخل ہونے کی نوبت آتی ہے، میرا سارا اعتماد لڑکھڑا جاتا ہے۔ لیکن میں کر بھی کیا سکتا ہوں؟ مجھے اپنے کرداروں کو کوئی نہ کوئی نام تو بہر حال دینا ہی ہے — ٹھیک ہے نا؟ لیکن اس بار یہ واضح کردینے کے لیے کہ میری ہیروئن کا واسطہ مجھ، اور خاص مجھی سے ہے (اور مجھے اس سے جو اُنس ہے وہ کبھی کسی اور سے نہیں رہا)، میں اسے جو نام دے رہا ہوں، اس نام کی عورت اس سے پہلے کوئی اور نہیں ہوئی ہے: تمینا (Tamina)۔ میں اسے دراز قامت، حسین، پینتیس سالہ، اور اصلاً پراگ کی باشندہ تصوّر کرتا ہوں۔

اس وقت میں اسے مغربی یورپ کے کسی صوبائی شہر کی سڑک پر جاتا ہوا دیکھ سکتا ہوں۔ جی ہاں، آپ کا خیال بالکل درست ہے۔ میں پراگ کو تو، جو یہاں سے کوسوں دور ہے، اُس کے نام سے پکار رہا ہوں، لیکن اِس شہر کو گمنام رہنے دیا ہے جو میری کہانی کا محلِ وقوع ہے۔ یہ بات تناظر کے تمام اصولوں کے خلاف جاتی ہے۔ لیکن صاحب، یہ تو اب آپ کو برداشت کرنا ہی ہوگا۔

تمینا ایک چھوٹے سے کیفے میں ویٹرس کی حیثیت سے کام کرتی ہے۔ یہ کیفے شادی شدہ جوڑے کی ملکیت ہے۔ کیفے سے اتنی کم آمدنی ہوتی تھی کہ شوہر صاحب نے کہیں اور ملازمت کرلی اور ان کی جگہ تمینا کو رکھ لیا گیا۔ اپنی نئی جگہ پر جو حقیر تنخواہ شوہر کو ملتی تھی، اور اس سے زیادہ حقیر تنخواہ جو وہ تمینا کو دیتے تھے، تو ان کا فرق ہی بس ان کی کل واحد نفع بخش

آمدنی تھی۔ تمینا گاہکوں کو کافی اور کلوادوس[1] لالا کر پیش کرتی ہے (گاہکوں کی تعداد کبھی زیادہ نہیں ہوتی، کیفے ہمیشہ آدھا خالی ہوتا ہے)، اور پھر بار کے کاؤنٹر کے پیچھے اپنی جگہ سنبھال لیتی ہے۔ کاؤنٹر کے دوسری طرف اسٹول پر ہمیشہ کوئی نہ کوئی شخص بیٹھا ہوتا ہے، سارے گاہک اسے پسند کرتے ہیں: وہ بڑی اچھی سامع جو ٹھہری!

لیکن کیا وہ سچ مچ ان کی لن ترانی سنتی بھی ہے؟ یا صرف خاموشی سے، خیالات میں محو، ان کی طرف دیکھے جاتی ہے؟ یہ میں وثوق سے نہیں بتا سکتا۔ پھر اس کے جان لینے سے کوئی لمبا چوڑا فرق بھی نہیں پڑتا۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ کبھی کسی کی بات نہیں کاٹتی۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ جب دو آدمیوں میں سلسلۂ کلام چل نکلتا ہے تو کس طرح پہلے ایک آدمی مسلسل بات کیے جاتا ہے اور کس طرح دوسرا یہ کہہ کر قطع کلام کرتا ہے، "یہ تو بالکل میری طرح ہوا۔ میں ..." اور پھر اپنے بارے میں رواں ہوجاتا ہے، تا آنکہ اس کے رفیق کو بھی بیچ میں کہیں "یہ تو بالکل میری طرح ہوا۔ میں ..." کہنے کا موقع مل جاتا ہے۔

یہ دونوں "یہ تو بالکل میری طرح ہوا۔ میں ..." بظاہر ایک قسم کا اتفاق ہی معلوم ہوتے ہیں، یعنی طرفین میں سے دوسرے کی بات کو ایک قدم آگے بڑھانے کا ذریعہ، لیکن ایسا سوچنا محض خام خیالی ہے۔ اصل میں یہ ایک سفاک قوت کے خلاف اتنی ہی سفاک بے زاری کا اظہار ہوتے ہیں۔ اپنے کان کو غلامی کی بندش سے چھڑانے کی کوشش؛ ایک طرح کا سامنے کا وار جس کا واحد مقصد دوسرے کے سامعے پر حاوی آنا ہوتا ہے۔ خلق و بشر کے درمیان آدمی کی ساری زندگی کا مقصد دوسرے کی سماعت پر قابض ہوجانے سے زیادہ کچھ اور نہیں۔ تمینا کی ہر دل عزیزی کا راز صرف اتنا ہے کہ اسے اپنے بارے میں بات چیت کرنے کی ذرا خواہش نہیں۔ اپنی سماعت پر قابض ہونے والی قوتوں کی وہ ادنیٰ سی مزاحمت بھی نہیں کرتی۔ وہ کبھی یہ نہیں کہتی: "یہ تو بالکل میری طرح ہوا۔ میں ..."

1۔ calvados: بھوری رنگت کی خشک برانڈی جو سیب کے عرق سے کشید کی جاتی ہے۔

2

بی بی عمر میں تمینا سے دس سال چھوٹی ہے۔ اِدھر کوئی سال بھر سے وہ تمینا کو اپنے حالات روز کے روز آ کر بتاتی رہتی ہے۔ زیادہ عرصہ نہیں ہوا (اور سارا چکر اس وقت شروع ہوا) جب ایک روز بی بی نے تمینا کو بتایا کہ وہ اور اس کا شوہر آتی گرمیوں میں پراگ جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اچانک ایسا لگا گویا تمینا برسوں کی نیند سے چونک پڑی ہو۔ بی بی نے بات جاری رکھی لیکن (خلاف عادت) تمینا نے اس کی بات کاٹ دی اور کہا، "بی بی، اگر واقعی پراگ جانا ہو تو کیا میرے والد کے گھر جا کر میرے لیے ایک چیز لا سکتی ہو؟ کوئی بہت بڑی چیز نہیں، بس ایک چھوٹا سا پیکٹ ہے۔ اتنا چھوٹا کہ بہ آسانی تمھارے سوٹ کیس کے ایک گوشے میں سما جائے گا۔"

"ہاں ہاں، ضرور، کوئی بھی چیز،" بی بی نے کہا، بالکل راضی اور تیار۔

"تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ میں کتنی ممنون ہوں گی،" تمینا نے کہا۔

"بھروسا رکھو۔ میں یہ کام ضرور کر دوں گی،" بی بی نے کہا۔ دونوں کچھ دیر تک پراگ کے بارے میں گفتگو کرتی رہیں۔ تمینا کے رخسار جلنے لگے۔

پھر بی بی نے موضوع بدل دیا: "میں ایک کتاب لکھنا چاہتی ہوں۔"

تمینا نے چیکوسلوواکیہ میں پڑے ہوئے اپنے پیکٹ کے بارے میں سوچا، اور اس خیال سے کہ اس موقعے پر بی بی سے اس کی دوستی کتنی ناگزیر تھی، اس نے اپنی سماعت ایک بار پھر بی بی کے لیے وقف کر دی۔ "کتاب؟ کاہے کے بارے میں؟"

بی بی کی یک سالہ بچی ماں کے بار اسٹول کی ٹانگوں کے آس پاس شور مچاتی ہوئی لڑکھڑا رہی تھی۔

"شش!" بی بی نے گویا فرش کی تہدید کی اور، کسی گہرے خیال میں غرق، سگریٹ کا کش لگایا۔ "دنیا کے بارے میں... جس طرح کہ یہ مجھے نظر آتی ہے۔"

بچی اب باقاعدہ چیخنے لگی تھی۔

"سچ مچ، کتاب لکھنے کی جرأت کرو گی؟" تمینا نے پوچھا۔

"کیوں نہیں؟" بی بی نے جواب دیا۔ ایک بار پھر اپنے خیالوں میں گم ہوگئی، پھر بولی، "ظاہر ہے یہ جاننے کے لیے کہ کتاب کیسے لکھی جاتی ہے، مجھے دو چار اشاروں کی ضرورت تو پڑے گی ہی۔ تم بناکا (Banaka) کو تو نہیں جانتیں؟ یا جانتی ہو؟"

"نہیں۔ مگر یہ ذاتِ شریف ہیں کون؟" تمینا نے پوچھا۔

"ادیب ہے،" بی بی نے کہا، پھر کچھ سوچتے ہوئے اضافہ کیا، "اچھا ہوگا کہ میں پہلے اس کی لکھی ہوئی کوئی چیز پڑھ ڈالوں۔"

3

ٹیلی فون کے رسیور سے جو کچھ برآمد ہوا، وہ احساس مسرت سے لبریز کوئی فجائی کلمہ یا تحیّر جس کی وہ توقع کرسکتی ہو نہ تھا، بلکہ ایک سرد مہر "اوہ، اچھا تم۔ اتنے سالوں بعد یاد کیا۔"

"تمھیں پتا ہے میری مالی حالت اچھی نہیں،" تمینا نے اعتذاراً کہا، "فون کرنے میں بہت پیسے لگتے ہیں۔"

"تو خط لکھ دیا ہوتا۔ ٹکٹ پر تو اتنے پیسے خرچ نہیں ہوتے، یا ہوتے ہیں؟ مجھے تو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ تمھارا آخری خط کب آیا تھا۔"

اس خیال سے کہ شروعات ہی غلط طرح ہوگئی ہے، تمینا کچھ دب سی گئی اور ساس کی مزاج پرسی کرنے لگی۔ جب یہ تمام رسمیات پوری ہوگئیں، تب کہیں جا کر حرفِ مدعا زبان پر لائی: "ایک کام آپڑا ہے۔ کردو تو بے حد شکر گزار ہوں گی۔ جب ہم وہاں سے نکل رہے تھے تو پیچھے ایک چھوٹا سا پیکٹ چھوڑ آئے تھے۔"

"پیکٹ؟"

"ہاں۔ تم نے اور میریک نے مل کر اسے والد صاحب کے ڈیسک میں منتقل کردیا تھا۔ اس کی ایک دراز میریک کے لیے وقف تھی، یاد ہے؟ اور میریک نے چابی تمھارے حوالے کی تھی۔"

"چابی؟ مجھے کوئی چابی وابی یاد نہیں۔"

"مگر اماں، چابی تمھارے پاس ضرور ہونی چاہیے! میریک نے تمھیں دی تھی، میرے سامنے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔"

"تم لوگوں نے مجھے کچھ نہیں دیا تھا۔"

"زمانہ ہوگیا ہے۔ ممکن ہے بھول بھال گئی ہو۔ میں چاہتی ہوں کہ ذرا ڈھونڈ ڈھانڈ کر چابی دیکھ لو۔ مجھے یقین ہے کہ ڈھونڈو گی تو ضرور مل جائے گی۔"

"اور مل گئی تو پھر کیا؟"

"ذرا دراز کھول کر اطمینان کر لینا کہ وہ پیکٹ وہاں اب بھی موجود ہے۔"

"تو کیا تمھارے خیال میں اس کے پر لگ گئے ہوں گے؟ تم نے خود اس وہاں رکھا تھا، نہیں؟"

"ہاں۔"

"تو پھر مجھے دراز کھولنے کی کیا ضرورت ہے؟ تمھارا کیا خیال ہے، میں تمھاری نوٹ بکس الٹ پلٹ کرتی رہتی ہوں؟"

تمینا دنگ رہ گئی۔ اس کی ساس کو کیسے پتا چلا کہ دراز میں نوٹ بکس تھیں؟ اس نے انھیں حفاظت سے کاغذ میں لپیٹ کر اوپر سے گوند والی ٹیپ لگا دی تھی۔ الغرض اس نے ساس پر اپنی حیرت ذرا ظاہر نہ ہونے دی۔ "نہیں نہیں، میرا یہ مطلب نہیں۔ میں تو صرف اتنا چاہتی ہوں کہ تم ذرا دیکھ کر اطمینان کر لو کہ یہ وہاں موجود ہیں۔ اگلی دفعہ جب فون کروں گی تو پھر کچھ اور بتاؤں گی۔"

"اس وقت بتانے میں کیا بگڑ جائے گا؟"

"اماں، میں فون پر زیادہ دیر بات نہیں کر سکتی، بہت پیسے لگ جائیں گے۔"

"تو پھر فون کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟" بڑی بی نے دھڑ دھڑ آنسو بہانے شروع کر دیے۔

"اماں، روؤ مت،" تمینا نے التجا کی۔ ساس کا رونا اسے خوب یاد تھا۔ جب کبھی بڑی بی ان دونوں سے کچھ اینٹھنا چاہتیں، ساون بھادوں کی جھڑی لگا دیتیں۔ یہ ان دونوں پر الزام تراشی کا بے حد جارحانہ حربہ تھا۔

چونگا اس کی ہچکیوں سے تھرتھرانے لگا۔ "خدا حافظ، اماں،" تمینا نے کہا، "جلد ہی

دوبارہ فون کروں گی۔"

تاہم تمینا کی ہمت نہ ہوئی کہ بڑی بی کے رونا بند کرنے اور خدا حافظ کہنے سے پہلے فون منقطع کردے۔ لیکن آنسو مسلسل بہہ رہے تھے، اور ہر آنسو فون کی لاگت میں بھاری اضافہ کیے جارہا تھا۔

چنانچہ تمینا نے کھٹ سے سلسلہ منقطع کردیا۔

"یہ تو شیطان کی آنت جتنی لمبی کال کرڈالی تم نے،" تمینا کے بوس کی بیوی نے وقت کا میزان رکھنے والے آلے کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی سوگوار آواز میں کہا، پھر چیکوسلوواکیہ کے ریٹ سے اس نے کال کی مدتِ وقت کو ضرب دیا، اور تمینا کال کی قیمت دیکھ کر خاصی وحشت زدہ ہوگئی، تاہم اس نے بغیر آنا کانی کیے پوری رقم چٹ پٹ ادا کردی۔

4

تمینا اور اس کا شوہر چیکوسلوواکیہ سے غیر قانونی طور پر نکلے تھے۔ ترکیب یہ کی کہ حکومتی ٹریول ایجنسی میں اپنا نام اس گروہ میں لکھوادیا جو یوگوسلاویہ کے ساحلی علاقے کی سیر وسیاحت کو جانا چاہتا تھا۔ جب وہاں پہنچ گئے تو گروہ سے کٹ کر آسٹریا ہوتے ہوئے مغرب چلے آئے۔

لوگوں کو مشتبہ نظر آنے سے بچنے کے لیے دونوں نے صرف ایک بڑا سوٹ کیس ہی ساتھ لیا تھا۔ لیکن ٹھیک آخری لمحے میں ان کی ہمت جواب دے گئی اور انھوں نے وہ پیکٹ وہیں چھوڑ دیا جس میں ان کے ایک دوسرے کے نام خطوط اور تمینا کی نوٹ بکس تھیں۔ کسٹم کے معائنے کے دوران ان کے مقبوضہ ملک کے کسی افسر نے اگر ان کا سوٹ کیس کھول کر تلاشی لینی شروع کردی ہوتی تو اس بنڈل کو دیکھ کر اس کا ماتھا ضرور ٹھنکتا: ساحلِ سمندر پر صرف دو ہفتے کی چھٹی منانے کے لیے کون ہوش مند اپنی نجی زندگی کا سارا دفتر ساتھ اٹھائے اٹھائے پھرتا ہے؟ چونکہ وہ اس بنڈل کو اپنے اپارٹ مینٹ میں نہیں چھوڑنا چاہتے تھے، کہ انھیں خوب معلوم تھا کہ فرار ہوتے ہی حکومت ان کا اپارٹ مینٹ اپنی تحویل میں لے لے گی، انھوں نے پراگ سے باہر تمینا کی ساس کے اپارٹ مینٹ میں، تمینا کے مرحوم خسر کی قدیم

اور غیر مستعمل ڈیسک میں اسے سینت کر رکھ دیا۔

بیرونِ ملک تمینا کا شوہر سخت بیمار پڑ گیا۔ تمینا صرف اتنا ہی کر سکی کہ بیٹھی موت کے ہاتھوں اسے آہستہ آہستہ فنا ہوتا ہوا دیکھتی رہے۔ جب وہ مر گیا تو لوگوں نے اس سے پوچھا کہ لاش کو دفنایا جائے یا جلایا؟ اس نے جلانے کو کہہ دیا۔ پھر پوچھا گیا کہ وہ اس کی راکھ کو راکھ دان میں محفوظ رکھنے کے حق میں ہے یا منتشر کر دینے کے؟ اس خیال سے کہ اس کا ذاتی گھر تو ہے نہیں، اور وہ دستی سامان کی طرح اپنے شوہر کو ہر جگہ اٹھائے پھرنے پر مجبور ہو جائے گی، تمینا نے اس کی خاک منتشر کرادی۔

میں دنیا کو تمینا کے گرد ایک مدوّر چہار دیواری کی طرح اٹھتا ہوا تصور کرتا ہوں، اور خود تمینا کو بہت نیچے سبزے کے ایک ننھے سے قطعے کی طرح۔ اس قطعے پر پھلنے پھولنے والا واحد گلاب اس کے شوہر کی یاد ہے۔

یا پھر تمینا کے حال کا (جو لوگوں کو قہوے کے پیالے پیش کرنے اور ان کی لن ترانیوں کو بکمالِ خاموشی سننے سے عبارت ہے) اس طرح تصور کرتا ہوں جیسے لٹھوں کا کوئی ٹھاٹھہ سطحِ آب پر بہا جارہا ہو، اور وہ اس پر بیٹھی پیچھے کی طرف دیکھے جارہی ہو، صرف پیچھے کی طرف۔

ان دنوں وہ بڑی حسرت سے یہ محسوس کرنے لگی ہے کہ ماضی آہستہ آہستہ دھندلا کر اس کی پہنچ سے نکلا جارہا ہے۔ شوہر کی باقیات میں اس کے پاس صرف ایک پاس پورٹ سائز کی تصویر رہ گئی ہے۔ بقیہ تمام تصاویر وہیں پراگ والے اپارٹ مینٹ میں رہ گئی ہیں، جس پر اب حکومت نے قبضہ کر لیا ہوگا۔ ہر روز وہ اس میلی کچیلی تصویر کو دیکھتی ہے جس کے کونے دست بردِ زمانہ سے تڑ مڑا گئے ہیں۔ اس میں شوہر کا پورا چہرہ دکھایا گیا ہے (جس طرح کسی مجرم کی تصویر میں ہوتا ہے)۔ شباہت بھی کچھ اتنی واضح نہیں۔ وہ ہر روز تھوڑا سا وقت ایک قسم کی روحانی ریاضت میں گزارتی ہے۔ یہ یاد کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ وہ یک رخی خاکے (پروفائیل) میں کیسا لگتا، پھر نصف، اور پھر ایک چوتھائی یک رخی خاکے میں۔ اس کی ناک اور ٹھوڑی کے خط کا معائنہ کرتی ہے۔ روز ہی نئے نئے مبہم اور غیر واضح دھبوں کو دیکھ کر، جن تک پہنچ کر اس کا حافظہ ٹھٹھک کر ٹھہر جاتا ہے اور طے نہیں کر پاتا کہ آگے کس سمت میں جائے، مارے دہشت کے اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

اس قسم کی مشقوں کے درمیان وہ اس کی جلد کو مع اس کی رنگت، اس کے معمولی نقائص، مثلاً مہین مہین مسّے، مہاسے، رگیں، چھائیاں، تصور میں ابھارنے کی کوشش کرتی، لیکن یہ مشکل، بلکہ تقریباً ناممکن ثابت ہوتا۔ اس کا حافظہ جن رنگوں کا استعمال کرتا، تمام غیر حقیقی ہوتے، اور انسانی جلد کے اصلی رنگ کے ساتھ انصاف نہ کر پاتے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے شوہر کی تخیلی بازیافت کا ایک بہت ذاتی اور منفرد طریقہ ڈھونڈ نکالا۔ جب وہ کسی مرد کے آمنے سامنے بیٹھتی تو اس کے سر کو سنگ تراش کے آرمیچر [چوکھٹے] کے طور پر استعمال کرتی۔ تمام تر قوتِ ارتکاز کو کام میں لا کر اس آدمی کے چہرے کو اپنے ذہن میں نئے سرے سے ڈھالتی، جلد کے رنگ کو قدرے گہرا کر دیتی اور اس پر مسوں اور چھائیوں کا اضافہ، آہستہ آہستہ کانوں کی تراش خراش کرتی اور آنکھوں کو نیلا رنگ دیتی۔

لیکن ان تمام کوششوں سے اگر کچھ ثابت ہوتا تھا تو بس یہ کہ اس کے خاوند کا عکس ہمیشہ کے لیے محو ہو چکا ہے۔ جن دنوں انھوں نے ابھی ابھی ڈیٹنگ شروع کی تھی، اس نے تمینا سے کہا تھا کہ وہ باقاعدہ ڈائری لکھا کرے اور اس میں دونوں کی زندگی کا حساب کتاب رکھے۔ (وہ عمر میں تمینا سے دس سال بڑا تھا اور انسانی حافظے کی کمزوری کا اُسے بہر حال کچھ اندازہ ضرور تھا۔) اول اول تمینا نے انکار کر دیا۔ اس نے کہا، یہ تو ان کی محبت کا مذاق اڑانے کے مترادف ہوا۔ شوہر سے شدید محبت کے باعث وہ یہ اعتراف نہیں کرنا چاہتی تھی کہ جس چیز کو وہ ناقابلِ فراموش سمجھتی ہے، کبھی فراموش بھی ہو سکتی ہے۔ بہر کیف، آخر میں اس نے وہی کیا جو اس کا شوہر چاہتا تھا۔ یوں اس نے ڈائری لکھنا شروع تو کی، لیکن تحریر میں جوش اور ولولہ پیدا نہ کر سکی۔ اور یہ بات ان نوٹ بکس سے صاف ظاہر ہو جاتی تھی۔ ان میں جگہ جگہ کئی کئی صفحے خالی پڑے تھے۔ پھر اندراجات بھی خاصے شکستہ اور نامکمل۔

5

اس نے بوہیمیا میں پورے گیارہ سال شوہر کے ساتھ گزارے تھے، اور پیچھے پوری گیارہ نوٹ بکس ساس کے قبضے میں پڑی تھیں۔ شوہر کے انتقال کے فوراً بعد اس نے ایک نوٹ بک

خریدی اور اسے گیارہ حصوں میں تقسیم کیا۔ گو وہ کئی نیم فراموش کردہ واقعات اور صورت حالات کو از سر متشکل کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی، لیکن یہ بالکل معلوم نہ ہوسکا کہ انھیں درج کرے تو کس حصے میں۔ واقعات کی زمانی ترتیب کا سارا احساس زائل ہو چکا تھا۔

چنانچہ اس نے سب سے پہلے جس کام کا بیڑا اٹھایا وہ یادوں کی بازیافت تھا، تا کہ وقت کے بہاؤ میں ان سے ایک حوالہ جاتی نقطے کا کام لیا جا سکے اور یوں وہ ماضی کی بازتخلیق میں بنیادی ڈھانچے کی طرح ثابت ہوں۔ مثال کے طور پر، وہ چھٹیاں جو انھوں نے منائی تھیں، انھیں تعداد میں گیارہ ہونا چاہیے۔ لیکن وہ ان میں سے صرف نو ہی یاد کر سکی۔ بقیہ دو حافظے سے اس طرح گم ہو چکی تھیں کہ بازیافت ناممکن تھی۔

ان نو، از سر نو تخلیق کردہ تعطیلات میں سے ہر ایک کو اس نے اپنی نوٹ بک کے گیارہ حصوں میں جدا جدا درج کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اسے اس پر مکمل اعتماد اسی وقت حاصل ہوسکتا تھا جب اس سال کوئی غیر معمولی واقعہ ہوا ہو۔ 1964 میں تمینا کی ماں کا انتقال ہوا تھا اور ان دونوں نے معمول سے ایک ماہ بعد چند سوگوار تعطیلی ہفتے ٹیٹرس (Tatras) میں گزارے تھے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس سے اگلے سال وہ ساحلِ آب کی تفریح کے لیے بلغاریہ گئے تھے۔ اسے 1968 اور 1969 والی تعطیلات بھی یاد تھیں کیونکہ یہ چیکوسلوواکیہ میں ان کی آخری چھٹیاں تھیں۔

(زمانی ترتیب برطرف) اگر بیشتر چھٹیوں کو از سر نو تخلیق کرنے میں اسے بہتر کامیابی ہو بھی گئی تو کرسمس اور نئے سال کے موقعے بالکل قابو میں نہ آ سکے۔ گیارہ میں سے صرف دو کرسمس اور بارہ نئے سالوں میں سے صرف پانچ ہی اسے یاد آ سکے۔

اس نے ان پیار کے ناموں کو بھی یاد کرنے کی کوشش کی جن سے شوہر نے اسے مختلف اوقات میں پکارا تھا۔ تمینا کے اصلی نام کو اس نے صرف شادی کے بعد کے دو ایک ہفتوں ہی تک استعمال کیا تھا۔ اس کی شفقت اور نرمی اس مشین کی طرح تھی جس سے پیار کے نت نئے نام ڈھلے ڈھلائے نکلے چلے آتے تھے اور اس سے پہلے کہ ان میں کا کوئی نام پیش پا افتادہ ہو جائے، وہ بڑی پھرتی سے ایک اور نیا نام وضع کرلیا کرتا تھا۔ ان بارہ برسوں میں جو دونوں نے ساتھ گزارے تھے، اس نے کم از کم بیس تیس نام تو اسے ضرور دے ڈالے ہوں گے۔

ان میں سے ہر ایک کا تعلق ان کی زندگی کے ایک خاص اور معینہ دور سے تھا۔

لیکن وہ اس گمشدہ کڑی کو کیسے بحال کرسکتی تھی جو پیار کے کسی مخصوص نام اور وقت کے بہاؤ کو ایک دوسرے سے مربوط کرتی ہو؟ یہ کامیابی تو بہت نایاب موقعوں ہی پر ہوگی۔ مثلاً وہ اپنی ماں کی وفات کے بعد والے دن یاد کرسکتی تھی جب اس کے شوہر نے بالکل قریب آ کر، جیسے اسے کسی خواب سے بیدار کرنے کی کوشش کررہا ہو، بڑے تعمیل طلب انداز میں اس کا نام سرگوشیوں میں لیا تھا (اس کا وہ نام جو اس نے اسے اُن دنوں دے رکھا تھا)؛ ہاں، تو یہ نام اسے خوب یاد تھا۔ وہ اسے نہایت اعتماد کے ساتھ 1964 کے تحت درج بھی کرسکتی تھی۔ لیکن بقیہ دوسرے نام چڑیا گھر کے مفرور پرندوں کی طرح بکمال آزادی و جنوں، وقت کے باہر اڑتے پھر رہے تھے۔

یہی وجہ ہے جو وہ اس شدید وارفتگی سے نوٹ بکس اور خطوں کے اس بنڈل کی بازیافت کی خواہاں ہے۔

ظاہر ہے وہ خوب جانتی ہے کہ ان نوٹ بکس میں بہت سی ناخوشگوار باتیں بھی درج ہیں — ناآسودگی کے دن، ازدواجی چپقلشیں، حتیٰ کہ اکتاہٹ اور بے زاری بھی۔ تاہم یہ چیزیں بے حیثیت ہیں۔ اس نے کب یہ چاہا ہے کہ ماضی شعر میں بدل جائے۔ وہ تو اس بات کی کوشاں ہے کہ ماضی کو اس کا گمشدہ جسم لوٹا دے۔ اس جذبے کا محرک خواہشِ حسن نہیں، بلکہ آرزوے حیات ہے۔

سو دیکھیے، وہ وہاں لٹھوں کے ٹھاٹھے پر بیٹھی ہوئی پیچھے کی طرف دیکھے جارہی ہے، صرف پیچھے کی طرف۔ اس کی زندگی کی ساری پونجی اس سے زیادہ نہیں جو اسے فاصلے میں نظر آرہا ہے۔ جوں جوں اس کا ماضی سمٹتا، غائب ہوتا، اور پارہ پارہ ہوتا جاتا ہے، خود تمینا بھی اسی تناسب سے سمٹنا اور دھندلانا شروع کردیتی ہے۔

وہ ان نوٹ بکس کو دیکھنے کو اس لیے تڑپ رہی ہے کہ ان کی مدد سے اس نئی نوٹ بک میں واقعات کے خستہ حال ڈھانچے کو مکمل کرسکے۔ اس کو درودیوار سے آراستہ کرسکے، اور یوں اس کا ایک گھر بنا دے جس میں رہ سکے۔ کیونکہ ایک بری طرح نصب کیے ہوئے خیمے کی طرح اگر اس کی یادوں کا مرتعش ڈھانچا نیچے آرہا تو پھر تمینا کے پاس حال کے سوا کچھ باقی نہ

بچے گا — وہ حال جو غیر مرئی نقطے کی طرح ہے، اور موت کی طرف آہستہ خرام کوئی لا شے۔

6

تو پھر کیوں اس نے اپنی ساس سے پیکٹ بھیج دینے کی درخواست کرنے میں اتنی دیر لگا دی؟

چیکوسلوواکیہ سے باہر جانے والی ساری ڈاک خفیہ پولیس کے ہاتھوں سے ہو کر ہی جاتی تھی۔ تمینا اس بات پر کبھی راضی نہ ہو سکی کہ پولیس والے اس کے بے حد نجی معاملات میں دخیل ہوں۔ پھر یہ بھی کہ شوہر کا [خاندانی] نام (جو ہنوز اس کا اپنا نام بھی تھا) اب بھی بلیک لسٹ پر چڑھا ہوا ہوگا، اور پولیس والے ہمیشہ ایسے شواہد اور دستاویزات کے متلاشی رہتے ہیں جن کا تعلق ان کے مخالفین کی زندگیوں سے ہو، حتیٰ کہ ایسے مخالفین سے بھی جو کب کے مرکھپ چکے ہوں۔ (تمینا اس معاملے میں غلطی پر نہ تھی: پولیس کی مِسلوں پر ہی ہم اپنے جاوداں ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔)

بالفاظِ دیگر، اس کی رہی سہی امید بس اب بی بی سے ہی وابستہ ہے۔ اور بی بی سے اپنے تعلقات خوشگوار رکھنے کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کو تیار ہے۔ بی بی بنا کا سے ملنا چاہتی ہے۔ چنانچہ اسے بنا کا کی کتابوں میں سے کم از کم ایک کتاب کے پلاٹ سے تو ضرور واقف ہونا چاہیے، یہ تمینا کا خیال ہے۔ کبھی دورانِ گفتگو اسے اس قسم کے خیال کا اظہار کرنا چاہیے: "بالکل ٹھیک ہے۔ اس سے ملتی جلتی بات تم نے فلاں کتاب میں کہی ہے!" یا: "جانتے ہو، تم عین مین اپنے کرداروں کی طرح ہو!" تمینا کو خوب معلوم ہے کہ بی بی کے اپارٹ مینٹ میں کہیں ایک کتاب کا وجود نہیں۔ یہی نہیں، پڑھنا پڑ جائے تو مارے بوریت کے بی بی کے آنسو نکل آتے ہیں۔ چنانچہ تمینا کو لازم آتا ہے کہ خود معلوم کرے کہ بنا کا کن موضوعات پر لکھتا ہے، اور بی بی کو اس سے گفتگو کے واسطے باقاعدہ تیار کرے۔

ممکن ہے ایگو (Hugo) کو کچھ سن گن ہو جو کیفے کے باقاعدہ گاہکوں میں سے ہے۔

"تم بنا کا کو جانتے ہو؟" تمینا نے کافی کا پیالہ اس کے سامنے رکھتے ہوئے دریافت کیا۔

ایگو کے منہ سے ہمیشہ باس آیا کرتی تھی۔ ورنہ بقیہ اعتبارات سے تمینا اس کا فی گوارا

عادت پاتی تھی: خاموش طبع، شرمیلا، عمر میں تمینا سے پانچ سات سال چھوٹا۔ وہ ہفتے میں ایک بار کیفے آتا۔ یہاں اس کا مشغلہ باری باری ندیدی آنکھوں سے ان کتابوں کو جو وہ اپنے ساتھ لاتا اور اتنی ہی ندیدی نظروں سے کاؤنٹر کے پیچھے استادہ تمینا کو دیکھنا ہوتا تھا۔

"ہاں، میں اسے جانتا ہوں،" اس نے جواب دیا۔

"اس کی کسی کتاب کا موضوع بتا سکتے ہو؟"

"دیکھو تمینا،" ایگو نے کہا، "آج تک کسی نے، اور میں تاکید سے کہتا ہوں کسی نے، اس کی لکھی ہوئی کوئی چیز نہیں پڑھی ہے، یا کم از کم یہ اعتراف نہیں کیا کہ پڑھی ہے۔ وہ دوسرے، تیسرے، بلکہ یوں کہو کہ دسویں درجے کا ادیب ہے۔ سب جانتے ہیں۔ اس کی شہرت صفر کے برابر ہے۔ چنانچہ اپنے پڑھنے والوں کے لیے اس کے پاس سوائے حقارت کے کچھ نہیں۔"

تمینا نے بناکا کی لکھی ہوئی کتابوں کو حاصل کرنے کی جستجو چھوڑ دی، تاہم بی بی کو اس سے ملوانے کو وہ اب بھی اپنی ذمے داری سمجھتی تھی۔ وہ گاہے بگاہے اپنے اپارٹ مینٹ کو، جو سارا دن خالی پڑا رہتا تھا، یویو (Joujou) نامی نوجوان، شادی شدہ جاپانی لڑکی کو فلسفے کے ایک پروفیسر کے ساتھ، جو خیر سے خود بھی شادی شدہ تھا، اپنی خفیہ عاشقانہ ملاقات کے لیے استعمال کرنے دیتی تھی۔ یہ پروفیسر بناکا سے واقف تھا، اور تمینا نے عاشقوں کی اس جوڑی سے وعدہ کرا کے چھوڑا کہ ایک ایسے دن جب بی بی یہاں موجود ہو، وہ بناکا کو گھیر گھار کے یہاں لے آئیں گے۔

جب بی بی کو اس بات کا پتا چلا تو اس کا ردعمل یہ تھا: "ہوسکتا ہے کہ یہ بناکا خاصا حسین آدمی نکلے، اور تمھاری جنسی خشک سالی کے دن پورے ہوں۔"

7

بالکل درست۔ شوہر کی وفات کے بعد سے آج تک تمینا کسی مرد کے ساتھ نہیں سوئی تھی۔ یہ کسی اصول کی پابندی کی بنا پر نہیں تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اسے اپنی جنسی وفاداری، جو قبر کے ماورا بھی قائم تھی، خاصی مہمل نظر آتی، اور واقعہ یہ ہے کہ اس نے اس بارے میں کبھی ڈینگ

بھی نہیں ماری تھی۔ تاہم وہ جب بھی کسی مرد کے سامنے اپنے برہنہ ہونے کا تصور کرتی (اور یہ تصور وہ اکثر کیا کرتی) تو اس کے شوہر کا پیکر یکلخت اس کی نظروں کے سامنے تیر جاتا۔ اسے خوب معلوم تھا کہ ہم جسمی کے دوران وہ اسے مستقل دکھائی دیتا رہے گا۔ اسے پتا تھا کہ اسے اُس کا چہرہ نظر آتا رہے گا، اور اپنے پر ثبت اُس کی آنکھیں بھی۔

ظاہر ہے یہ بڑی بے ڈھب بات تھی، بالکل احمقانہ، اور اس سے مخفی بھی نہیں تھی۔ اس کے شوہر کی روح مرنے کے بعد بھی زندہ رہے گی، اس بات پر اس کا عقیدہ نہ تھا۔ پھر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اگر اس نے ایک آدھ عاشق ڈھونڈ نکالا تو اس بات سے اس کے شوہر کی یاد کو کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ اس کے باوجود وہ اس معاملے میں بالکل بے بس تھی۔

یہ ذرا عجیب تو بے شک معلوم ہوگا تاہم اسے یہ خیال بھی آتا کہ اگر وہ شوہر کی زندگی ہی میں کسی اور مرد کے ساتھ سولی ہوتی تو آج کسی کے ساتھ ہم بستری کہیں آسان ثابت ہوتی۔ شوہر ایک مطمئن، کامیاب، اور گرم جوش آدمی تھا، اور تمینا نے مقابلتاً خود کو ہمیشہ ہی کمزور محسوس کیا تھا۔ اسے ہمیشہ یہی لگتا کہ اگر وہ چاہے تو بھی کوئی ایسا کام نہیں کر سکتی جس سے اس کے شوہر کی دل آزاری ہو۔

لیکن اب صورتِ حال مختلف تھی۔ اب اگر کوئی ایسا قدم اٹھائے تو وہ اس سے ایک ایسے شخص کو ایذا پہنچائے گی جو پلٹ کر اس کا مقابلہ کرنے سے معذور ہے، جو اَب اس کا اتنا ہی دست نگر ہے جتنا کوئی بچہ ہوتا ہے۔ پوری کائنات میں صرف وہی اپنے مرحوم شوہر کی رہ گئی تھی، صرف وہی!

یہی وجہ تھی کہ جس لمحے اسے کسی غیر مرد کے ساتھ جسمانی محبت کے امکان کا خیال بھولے سے بھی آتا، شوہر کا پیکر اس کے سامنے آدھمکتا، اور ساتھ ہی اس کے لیے بے پناہ خواہش، اور خواہش کے ساتھ رو دینے کی پرزور تڑپ۔

8

بنا کا بدشکل آدمی تھا۔ اس قسم کا آدمی نہیں جو عورت کی خوابیدہ شہوانیت کو جگا سکے۔ تمینا نے

اسے چائے پیش کی اور اس نے بڑے احترام سے شکریہ ادا کیا۔ گفتگو کا کوئی خاص مرکز نہ تھا، اور سبھی اس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اچانک بنا کا مڑا اور مسکرا کر بی بی سے بولا، "سننے میں آ رہا ہے کہ تم کوئی کتاب وتاب لکھنے والی ہو۔ کاہے کے بارے میں ہوگی؟"

"بس،" بی بی نے کہا، "ایک ناول لکھنا چاہتی ہوں۔ دنیا جس طرح مجھے نظر آتی ہے اُس کے بارے میں۔"

"ناول؟" بنا کا کے استفسار میں ناپسندیدگی کا شائبہ تھا۔

"کوئی ضروری نہیں ناول ہی ہو،" بی بی نے جواباً کہا، یوں جیسے اچانک اپنے بارے میں شک میں پڑ گئی ہو۔

"کبھی سوچا بھی ہے کہ ناول میں کیا کچھ کاٹھ کباڑ ڈالنا پڑتا ہے؟" اس نے کہا، "مثلاً اب وہ بھانت بھانت کے کردار ہی لے لو۔ تو کیا ان کرداروں کے بارے میں تم سب کچھ جانتی ہو؟ وہ کیسے دکھائی دیتے ہیں؟ کیسے سوچتے ہیں؟ کس قسم کے کپڑے پہنتے ہیں؟ کس ماحول سے آئے ہیں؟ تمھیں ان باتوں سے بھلا کیا لینا دینا، کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"بالکل،" بی بی نے فوراً مان لیا۔ "مجھے ان باتوں کی مطلق پروا نہیں۔"

"جانتی ہو،" وہ اپنی ہانکے گیا، "ناول اس انسانی فریبِ نظر کا ثمر ہوتے ہیں جس کی رو سے ہم اپنے بھائی بندوں کو سمجھنے کے مدعی ہوتے ہیں۔ لیکن ہم ایک دوسرے کے بارے میں جانتے ہی کیا ہیں!"

"کچھ بھی نہیں،" بی بی نے کہا۔

"بالکل سچ،" یویو نے ٹکڑا لگایا۔

فلسفے کے پروفیسر صاحب نے سر ہلا کر تائید کی۔

"ہم صرف یہ کر سکتے ہیں،" بنا کا نے کہا، "کہ خود اپنی ذات کا کچا چٹھا پیش کر دیں۔ اس کے علاوہ ہر شے طاقت کا غلط استعمال ہی ٹھہرے گی۔ اس کے علاوہ ہر چیز جھوٹ ہے۔"

"سچ، بالکل سچ!" بی بی نے پرجوش تائید کی، "میں ناول نہیں لکھنا چاہتی۔ لکھنے سے میرا مطلب یہ تھا بھی نہیں۔ میرا مطلب تو من وعن وہی تھا جو آپ نے ابھی ابھی بیان کیا ہے۔ یعنی انکشافِ ذات۔ اپنی زندگی کا حساب دینا۔ اور میں اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں

کروں گی کہ میری زندگی بڑی معمولی ہے، مجھے کبھی کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا ہے۔"

بناکا مسکرایا۔"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مجھے دیکھو۔ باہر سے دیکھو تو خود مجھ میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں۔"

"بالکل ٹھیک کہا!" بی بی نے نعرہ لگایا، "بالکل ٹھیک! مجھے باہر سے دیکھو۔ مجھ میں بھی سرخاب کے کوئی پر نہیں لگے ہیں۔ باہر سے! کیونکہ میرے اندر جو کچھ ہو رہا ہے، اندرونی طور پر، لکھنے لکھانے کے قابل تو اصل میں وہی ہے۔ اور لوگ بھی اس کو پڑھنا چاہیں گے۔"

دریں اثنا، تمینا ان کی خالی ہوتی ہوئی پیالیوں میں مسلسل چائے ڈالتی رہی۔ وہ خوش تھی کہ یہ دونوں مرد، جو ذہن کے کوہِ اولمپس سے اس کے اپارٹ مینٹ میں قدم رنجہ ہوئے تھے، اس کی سہیلی کے ساتھ اچھا سلوک کر رہے تھے۔

فلسفے کے پروفیسر نے اپنے پائپ کا لمبا سا کش لیا اور دھویں کے پیچھے چھپ گیا، یوں جیسے اپنے پر نادم ہو۔

"جوائس کے آنے کے بعد سے ہم آگاہ ہوئے ہیں،" اس نے کہا، "کہ ہماری زندگی کا سب سے بڑا ایڈوینچر، ہماری زندگی کا ایڈوینچر سے تہی ہونا ہے۔ اوڈیس (Odysseus) ٹرائے میں لڑائی لڑا۔ خود کشتی کھیتا ہوا گھر واپس لوٹا، اور ہر جزیرے میں پیچھے ایک عدد داشتہ چھوڑتا آیا — نہیں صاحب، یہ ہماری زندگی کا نقشا ہرگز نہیں۔ ہومر کا آوڈیسی (*Odyssey*) اب انسان کے باطن میں واقع ہوتا ہے۔ آدمی نے اسے اپنے اندر اتار لیا ہے۔ جزیرے، سمندر، سائرینیں[1] جو ہمیں پھانسنے کو تلی بیٹھی رہتی ہیں اور اتھیکا (Ithaca) جو ہمیں اپنی طرف آنے کی ترغیب دیتا ہے — یہ سب گھٹ گھٹا کر بس اب ہمارے اندر اٹھنے والی آوازیں ہی رہ گئے ہیں۔"

"بالکل ٹھیک کہا! میں بھی بالکل یہی محسوس کرتی ہوں!" بی بی نے ہانک لگائی۔ اسی لیے، مسٹر بناکا، میں آپ سے مل کر معلوم کرنا چاہتی تھی کہ آدمی ان باتوں کو کس طرح لکھے۔

---

[1] sirens: یونانی دیومالا کی وہ مخلوق جو آدھی عورت اور آدھی پرند ہوتی ہے، سمندر کے بیچ کسی چٹان پر رہتی ہے، اور ساحرانہ موسیقی سے غفلت میں آئے مسافروں کو پھانس لیتی ہے۔

مجھے اکثر لگتا ہے جیسے میرا پورا جسم اظہار کی شدید خواہش سے پھٹا جارہا ہے۔ یہ بات کرنا چاہتا ہے، کچھ کہنا چاہتا ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ میرا دماغی توازن جاتا رہے گا۔ میں اپنی اندرونی گھٹن سے پھٹ پڑوں گی۔ مسٹر بنا کا، آپ تو اس کیفیت سے خوب واقف ہوں گے۔ میں اپنی رام کہانی سنانا چاہتی ہوں۔ اپنے جذبات کی کہانی۔ سچ مچ یہ بالکل منفرد ہیں۔ یقین جانیے۔ لیکن میرے ہاتھ میں کاغذ پکڑا دیجیے اور مجال ہے جو یہ خیالات باقی رہیں۔ فوراً رفوچکر ہوجاتے ہیں۔ سو میرے خیال میں سارا مسئلہ تیکنیک کا ہے۔ کچھ نہ کچھ تو ہے جو آپ جانتے ہیں اور میں نہیں جانتی۔ آپ کی کتابیں — یہ کس قیامت کی ہوتی ہیں ...“

9

یہاں ان دونوں سقراطوں نے لکھنے لکھانے کے فن پر جو لیکچر اس عورت کو دیے، میں ان کو سنا کر آپ کی سمع خراشی نہیں کرنا چاہتا۔ اس کے بجائے میں ایک بالکل مختلف چیز کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ حال ہی میں مَیں نے پیرس میں ٹیکسی کرایے پر لی۔ شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے کو جا رہا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور خاصا باتونی آدمی نکلا۔ وہ رات کو نیند نہ آنے کی شکایت کرنے لگا۔ غالباً بے خوابی کے مرض میں بری طرح مبتلا تھا۔ یہ سب اس کے ساتھ جنگ کے دوران شروع ہوا تھا۔ وہ ملاح تھا۔ اس کی کشتی ڈوب گئی تھی۔ وہ تین دن اور تین راتیں مسلسل تیرتا رہا، تاآنکہ اس کی جان بچالی گئی۔ اگلے چند ماہ وہ مستقل زندگی اور موت کے درمیان معلق رہا۔ گو آخر میں اس کی صحت بحال ہوگئی، تاہم سونے کی صلاحیت جاتی رہی۔

”میں آپ کے مقابلے میں ایک تہائی زیادہ زندگی گزارتا ہوں،“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”اس زائد تہائی کا بھلا کیا کرتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”لکھتا لکھاتا ہوں، اور کیا،“ اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا کہ کیا لکھتا لکھاتا ہے۔

”اپنی زندگی کی کہانی۔ اس آدمی کی کہانی جو مسلسل تین دن تک سمندر میں تیرتا رہا،

موت کے سامنے ڈٹا رہا، سونے کی صلاحیت سے ہاتھ دھو بیٹھا، لیکن زندہ رہنے کی قوت کا برابر تحفظ کیے گیا۔"

"تو کیا یہ سب تم بچوں وچوں کے واسطے لکھ رہے ہو، خاندانی کوائف قسم کی چیز؟"

"میرے بچوں کو اس کی ذرا پروا نہیں۔" وہ تلخی سے ہنسا۔ "نہیں، میں ان واقعات کو جوڑ توڑ کر کتاب بنا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے اس کو پڑھ کر بہت سوں کا بھلا ہوگا۔"

ایک ادیب کے سروکار کی نوعیت کیا ہوتی ہے، اس کے بارے میں مجھے ایک اتفاقیہ بصیرت ٹیکسی والے سے گفتگو کرتے ہوئے ہاتھ آئی۔ ہم کتابیں اس لیے لکھتے ہیں کہ ہماری اولاد کو ذرا پروا نہیں ہوتی۔ ہم انجانی کائنات کی طرف رخ کرتے ہیں تو اس لیے کہ جب ہم بیوی سے بات کر رہے ہوتے ہیں تو وہ اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لیتی ہے۔

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ ڈرائیور کو کہیں لکھنے لکھانے کا جنون (graphomania) تو نہیں تھا۔ چلیے پہلے اس اصطلاح کی تعریف کرلیں۔ وہ عورت جو اپنے عاشق کو یومیہ چار خط لکھتی ہے، ہرگز اس مرض میں مبتلا نہیں؛ وہ تو صرف محبت میں غرق عورت ہوتی ہے۔ لیکن یہ میرا دوست جو اپنے عشقیہ خطوط کے فوٹو اسٹاٹ نکالتا ہے، صرف اس لیے کہ کسی دن ان کو شائع کر سکے، تو یقیناً میرا دوست اس مرض کا شکار ہے۔ لکھنے کا مراق، خط، ڈائری یا خاندانی روزنامچہ (جو اپنے اور گھر والوں کے لیے لکھا جائے) لکھنے کی خواہش کا نام نہیں، بلکہ کتاب لکھنے کی خواہش کا نام ہے (تاکہ گمنام پڑھنے والوں کا ایک پورا غول آدمی کے ہاتھ آ لگے)۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو ٹیکسی ڈرائیور اور گیئٹے (Goethe) دونوں میں لکھنے کا مراق مشترک نظر آئے گا۔ تاہم جو بات گیئٹے کو ٹیکسی ڈرائیور سے ممتاز کرتی ہے وہ اس مراق سے پیدا ہونے والا نتیجہ ہے، بذاتِ خود مراق نہیں۔

گرافومینیا (یعنی کتابیں لکھنے کا سودا) معاشرے میں اس وقت عام وبا کی شکل اختیار کر لیتا ہے جب معاشرہ اتنی ترقی کر چکا ہو کہ یہ تین بنیادی صورتیں بہم پہنچا سکے:

(1) عام فلاح و بہبود کا وہ درجہ جہاں لوگ اپنی قوتوں کو فضولیات کے لیے وقف کرنے کے قابل ہو جائیں۔

(2) معاشرتی تذریے (atomization) کا خاصا بڑھا ہوا درجہ اور نتیجے میں پیدا ہونے والا فرد کا احساسِ تنہائی۔

(3) قوم کے ارتقائے باطنی میں کسی اہم سماجی تبدیلی کا بھیانک فقدان۔ (اس ضمن میں مجھے یہ بات کسی مرض کی علامت معلوم ہوتی ہے کہ فرانس، یعنی اس ملک میں جہاں ہوتا ہواتا کچھ نہیں، ادبا کی تعداد اسرائیل میں پائے جانے والے ادیبوں سے 21 فیصد زیادہ ہے۔ بی بی نے بالکل ٹھیک دعویٰ کیا تھا کہ اُس نے باہر سے کسی چیز کا سرے سے کوئی تجربہ کیا ہی نہیں ہے۔ نفسِ مضمون کا یہی نہ ہونا، یہی خالی پن ہے جو موٹر چلانے کے لیے توانائی بہم پہنچاتا ہے، اور اسے لکھنے پر اکساتا ہے۔)

لیکن نتیجے کو دیکھ کر سبب کا کچھ نہ کچھ اندازہ تو بہر حال ہو ہی جاتا ہے۔ اگر تنہائی کا عام احساس گرافومینیا کو راہ دیتا ہے، تو خود جم غفیر کا اجتماعی گرافومینیا عام احساسِ تنہائی کو تقویت پہنچاتا ہے اور اسے سنگین بنا دیتا ہے۔ چھاپے خانے کی ایجاد نے اصلاً تو باہمی تفہیم کو فروغ دیا تھا۔ لیکن گرافومینیا کے حوالے سے لکھنے لکھانے کا اثر بالکل الٹ ہوتا ہے: یعنی ہر کس و ناکس اپنے نوشتے کے انبار میں چاروں طرف سے گھرا بیٹھا رہتا ہے، گویا یہ آئینوں سے مرصّع دیوار ہو جو باہر سے آنے والی ہر آواز کا قلع قمع کر رہی ہو۔

10

ایک روز جب کیفے میں کوئی گاہک موجود نہ تھا اور وہ بیٹھی اس سے گپ لگا رہی تھی، ایگو نے کہا، "تمینا، مجھے خوب معلوم ہے کہ اس معاملے میں کامیابی کا ذرہ برابر امکان نہیں، چنانچہ میں بات گھما پھرا کر نہیں کہوں گا۔ یہ بتاؤ، کیا تم اتوار کو رات کے کھانے پر میرے ساتھ چل سکتی ہو؟"

پیکٹ اس کی ساس کے پاس صوبائی گھر میں ہے۔ تمینا چاہتی ہے کہ پیکٹ کسی طرح اس کے باپ کے پاس پہنچ جائے جو پراگ میں رہتا ہے، تاکہ بی بی جا کر وہاں سے لے آئے۔ یوں دیکھیے تو اب یہ کوئی ایسا بھاری کام نہیں۔ اِس سے زیادہ آسان بھلا اور کیا ہو سکتا ہے۔ تاہم تمینا کو ان دونوں بلا کے ضدی بڈھے بڑھیا کو اپنا مدعا سمجھانے کے لیے کافی وقت

اور پیسا درکار ہوگا۔ ایک ملک سے دوسرے ملک فون کرنا بہت مہنگا پڑتا ہے، اور تمینا کو جو تنخواہ ملتی ہے اس سے کرایے اور کھانے پینے کا بندوبست بھی بمشکل ہو پاتا ہے۔

"ٹھیک ہے،" تمینا، یہ یاد کرکے کہ ایگو کے گھر ٹیلی فون لگا ہے، راضی ہوگئی۔ وہ اسے کار میں لینے آیا۔ پھر ایک مضافاتی ریستوراں میں لے گیا۔

وہ چاہتا تو تمینا کے ساتھ فاتح کی سی زبردستی کرسکتا تھا۔ وہ اس کا کیا بگاڑ لیتی۔ اس ملک میں اس کی حیثیت ہی کیا تھی۔ لیکن اب کیا کیا جائے کہ ایک کم تنخواہ ویٹرس کے عقب میں وہ اُسے پراسرار غیر ملکی عورت اور بیوہ ہی نظر آتی تھی۔ اُس کے قدم لڑکھڑانے لگتے اور شک آ گھیرتا۔ تمینا کا لطف و کرم، زرہ بکتر کی طرح، اس کا سب سے بڑا محافظ تھا، ایک بُلِٹ پروف ویسٹ۔ وہ تو یہ چاہتا تھا کہ تمینا کی توجہ اپنی طرف کرائے۔ اس کا دل موہ لے۔ اس کے خیالات میں جا بسے۔

بہت سر مارا کہ تمینا کی دلچسپی کی کوئی شے ہاتھ آ جائے اور اس طرح وہ اس کے دل تک راہ پالے۔ سو منزلِ مقصود پر پہنچنے سے پہلے وہ اسے ایک چڑیا گھر لے گیا جو ایک بے حد دلکش دیہی قصر کی اراضی پر پھیلا ہوا تھا۔ گوتھک طرز کے لحیم شحیم برجوں کے پس منظر میں وہ بندروں اور توتوں کے درمیان سیر کرتے رہے۔ سوائے ایک دہقان صورت، اُنگھڑ مالی کے، جو کشادہ روشوں پر منتشر پتّوں کو جھاڑو دے کر صاف کر رہا تھا، وہ بالکل تنہا تھے۔ وہ ایک بندر، ایک شیر، ایک بھیڑیے کے پاس سے گزرتے ہوئے ایسے قطعے پر نکل آئے جس کے گرد احاطہ تھا اور اس میں شترمرغ گھومتے پھر رہے تھے۔

کل چھ شترمرغ تھے۔ جب انھوں نے تمینا اور ایگو کو دیکھا تو دوڑ لگا کر فوراً ان کے پاس چلے آئے اور تار کے احاطے کے اُس پار پاس پاس ایک جتھے کی شکل میں کھڑے ہوگئے۔ اپنی لمبی لمبی گردنیں دراز کیں اور دونوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی چوڑی اور چپٹی چونچوں کو پھٹ پھٹ کھولنے بند کرنے لگے، ایک بے قراری، ایک ناقابلِ یقین تیز رفتاری کے ساتھ جیسے کسی مباحثے میں شریک ہوں اور تیز تیز باتیں کرکے حریف پر سبقت لے جانے کے درپے ہوں۔ لیکن ان کی چونچیں بالکل گونگی تھیں۔ ان سے ذرہ برابر آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔

شترمرغ وہ پیغامبر تھے جنھوں نے اپنے نہایت اہم پیغام کو دل پر نقش کرلیا تھا، لیکن جن کی صوتی نالیوں کو دشمن نے چاک کر کے انھیں قوتِ گویائی سے محروم کر دیا تھا؛ سو اب، منزلِ مقصود کو پہنچ کر، وہ اتنا ہی کر سکتے تھے کہ محض اپنے منہ ہلاتے جائیں۔

تمینا، سحر زدہ سی، انھیں تیز سے تیزتر، نہایت تعمیل طلب انداز میں منہ ہلاتے دیکھتی رہی۔ جب وہ اور ایگو وہاں سے ٹلے تو شترمرغ بھی ان کے پیچھے پیچھے احاطے کی جالی سے لگے لگے چلنے لگے۔ وہ اب بھی چونچیں چلائے جا رہے تھے، گویا تمینا کو کسی چیز سے خبردار کر رہے ہوں۔ لیکن کس چیز سے، یہ وہ نہ جان سکی۔

11

"ایسا لگتا ہے گویا کسی ڈرا دینے والی پریوں کی کہانی کا واقعہ ہو،" تمینا نے چھری سے پاتے[1] کو کاٹتے ہوئے کہا، "لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی بہت اہم بات مجھے بتانا چاہتے ہوں، لیکن کیا بات؟ وہ کیا کہنا چاہتے تھے؟"

ایگو نے سمجھایا کہ وہ بہت نوجوان قسم کے شترمرغ تھے اور ان کا طور طریق بالکل ایسا ہی تھا جیسا تمام نوجوان شترمرغوں کا ہوتا ہے۔ جب وہ پچھلی مرتبہ چڑیا گھر آیا تھا، تو اس بار بھی یہی چھ شترمرغ دوڑ کر احاطے کی دیوار کے پاس آئے تھے اور چونچیں ہلانے لگے تھے۔

پھر بھی تمینا کی تسلی نہ ہوئی۔ وہ اسی طرح مضطرب رہی۔ "تمھیں پتا ہے، میں پیچھے چیکوسلوواکیہ میں ایک پیکٹ چھوڑ آئی تھی۔ اس میں کچھ ضروری کاغذات تھے۔ اگر میں اسے منگوانے کے لیے لکھتی تو پولیس والے ضرور ضبط کر لیتے۔ بی بی آتی گرمیوں میں پراگ جانے والی ہے۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ میرا پیکٹ لے آئے گی۔ اور اب مجھے یہ خوف کھائے جا رہا ہے کہ وہ شترمرغ مجھے کسی بات سے خبردار کر رہے تھے، جیسے بتا رہے ہوں کہ اس پیکٹ کے ساتھ کوئی واقعہ ہو گیا ہے۔"

---

[1] pâté: یہ وہی شے ہے جسے پاکستانی ریستورانوں میں خلقت 'پیٹس' کے نام سے جانتی ہے۔

ایگو کو معلوم تھا کہ تمینا بیوہ ہے، اور یہ بھی کہ بعض سیاسی وجوہ کی بنا پر اس کا شوہر ملک چھوڑنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے پوچھا، "کاغذات سیاسی نوعیت کے تو نہیں تھے؟"

اب یہ بات تمینا کو بہت پہلے ہی معلوم ہو گئی تھی کہ اگر وہ اِس ملک والوں کو اپنی زندگی سے آگاہ کرنا چاہتی ہے تو اسے اس زندگی کو بہت سہل اور سادہ بنا کر پیش کرنا ہوگا۔ ذاتی خطوط اور ڈائریاں کیوں ضبط کر لی جاتی ہیں اور وہ ان کے پیچھے کیوں دیوانی ہوئی جا رہی ہے ایسی باتیں ہیں جن کی وضاحت غیر معمولی طور پر پیچیدہ تھی۔ سو اس نے صرف اتنا ہی کہا، "بالکل، سیاسی نوعیت کے ہی۔"

کہنے کو تو یہ کہہ دیا، مگر اب یہ خوف دامن گیر ہوا کہ ایگو کہیں ان کاغذات کے بارے میں مزید کچھ اور نہ پوچھ بیٹھے۔ خیر ہوئی کہ اس نے نہیں پوچھا۔ کب، کس نے، کس چیز کے بارے میں اس سے استفسار کیا تھا؟ بہت ہوا تو کبھی کبھار لوگ اس کے ملک کے بارے میں اپنے محسوسات کا اظہار کر دیتے۔ رہے خود اس کے ذاتی تجربات، تو کسی شخصِ واحد کو بھی ان سے دلچسپی نہیں تھی۔

"بی بی کو تو نہیں معلوم کہ یہ کاغذات سیاسی نوعیت کے ہیں؟" ایگو نے پوچھا۔

"نہیں،" تمینا نے جواب دیا۔

"یہ بہت اچھا ہوا،" ایگو نے کہا، "اس سے بھولوں بھی ذکر نہ کرنا کہ اس کا سیاست سے دور کا بھی تعلق ہے۔ عین وقت پر اس کے ہاتھ پانو پھول جائیں گے اور وہ انھیں وہیں چھوڑ چھاڑ آئے گی۔ تمینا، لوگوں کا کیا ہے، وہ کسی چیز سے بھی خوفزدہ ہو سکتے ہیں۔ خوب اطمینان کر لینا کہ بی بی انھیں بالکل غیر اہم، معمولی سے روکھے پھیکے کاغذات ہی سمجھتی رہے، جیسے، مثلاً، تمھارے عشقیہ خطوط! بالکل! یہ بات اس کی پہنچ کی ہے۔ ایسی بات ہے جو اس کی سمجھ میں آ سکتی ہے۔"

تو گویا ایگو کے خیال میں عشقیہ خطوط بالکل بے حیثیت اور بے کیف چیز کا نام ہیں، تمینا نے سوچا۔ یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی کہ اس نے کبھی کسی سے محبت کی تھی، کہ وہ محبت اس کے لیے بڑی پُرمعنی تھی۔

"خدانخواستہ اگر بی بی وہاں نہ جا سکے،" ایگو نے اپنی بات پر اضافہ کیا، "تو اس

معاملے میں تم مجھ پر پورا اعتماد کر سکتی ہو، میں خود جا کر لے آؤں گا۔"

"شکریہ" تمینا نے گہرے اخلاص سے جواباً کہا۔

"جیل ہی کیوں نہ جانا پڑ جائے، وہ پیکٹ تمھارے لیے پھر بھی لے آؤں گا۔"

"بے وقوفی کی بات نہ کرو،" تمینا نے احتجاج کیا۔ "تمھارے جیل جانے کا کوئی امکان نہیں۔" پھر اس نے ایگو کو سمجھایا کہ غیر ملکی سیاحوں کو چیکوسلوواکیہ میں کوئی خطرہ نہیں، خطرہ تو صرف چیک باشندوں کو ہے۔ اور اب تو وہ لوگ اُسے بھول بھال چکے ہوں گے۔ اچانک وہ بڑی طول طویل اور نہایت جوشیلی تقریر کرنے لگ گئی تھی۔ اسے اپنے وطن کے چپے چپے کا کماحقہ علم تھا، اور میں آپ سے وثوق سے کہہ سکتا ہوں — اس کی ہر بات بالکل سچ تھی۔

گھنٹے بھر بعد وہ ایگو کے فون کا چونگا کان سے لگائے بیٹھی تھی، لیکن اس بار بھی ساس کو رام کرنے میں اتنی ہی کامیابی ہوئی جتنی پہلی بار ہوئی تھی۔ "تم نے مجھے کوئی چابی وابی نہیں دی تھی! تم ہمیشہ ہر چیز مجھ سے چھپا کر رکھا کرتی تھیں! اتنی تکلیف دہ یادوں کی بازخوانی کا فائدہ!"

12

اگر تمینا کو اپنی یادیں اتنی ہی عزیز تھیں تو خود کیوں چیکوسلوواکیہ نہیں چلی جاتی؟ ان چیک شہریوں کو جنھوں نے 1968 کے بعد غیر قانونی طور پر ملک چھوڑا تھا، عام معافی دی جا چکی ہے، اور ان سے واپس ملک لوٹنے کی درخواست بھی کی جا چکی ہے۔ تمینا کو اب کس بات کا ڈر ہے؟ ظاہر ہے وہ اتنی بے حیثیت ہے کہ اسے کسی بات کا خطرہ نہیں ہو سکتا!

صحیح، بالکل صحیح۔ وہ بلا خوف و خطر واپس جا سکتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود نہیں جا سکتی۔

وہاں، گھر میں، ہر فرد و بشر نے اس کے شوہر کے ساتھ دغا کی تھی۔ اب اگر وہ واپس جاتی ہے تو اسے بھی شوہر کے ساتھ دغا کرنے کا دھڑکا لگا رہے گا۔

جب انھوں نے رفتہ رفتہ اس کا عہدہ گھٹا کر بالآخر اسے ملازمت سے برطرف کر دیا تو کوئی ماں کا لال اس کی حمایت کے لیے نہیں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے عزیز ترین دوست تک نہیں۔ اب یہ بھی نہیں کہ تمینا حقیقت سے بالکل ہی نابلد ہو۔ اسے خوب معلوم تھا

کہ اپنے دل کی گہرائیوں میں یہ سارے احباب اس کے حامی تھے، اور محض خوف کے مارے اس کے اظہار سے کترا رہے تھے۔ اور بعینہٖ یہ بات کہ وہ اس کے حامی تھے، انھیں اپنے یوں خوفزدہ ہونے پر خجل کر رہی تھی۔ سڑک پر کہیں نظر آتے تو یوں انجان بن جاتے جیسے دیکھا ہی نہ ہو۔ محل شناسی کے سبب دونوں میاں بیوی خود ہی ان سے کنّی کاٹنے لگے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے دوست اور زیادہ نادم ہوں۔ دیکھتے دیکھتے دونوں کی یہ حالت ہوگئی گویا کوڑھیوں کی جوڑی ہوں۔ جب وہ چیکوسلوواکیہ سے نکل آئے تو پیچھے شوہر کے سابقہ ہم کاروں نے ایک ایسے عوامی اعلان نامے پر، جس میں شوہر پر کیچڑ اچھالا گیا تھا، دستخط کردیے۔ ظاہر ہے یہ قدم انھوں نے ملازمت سے برطرف کردیے جانے کے خوف سے اٹھایا تھا۔ کچھ بھی سہی، اٹھایا تو تھا، اور یوں انھوں نے اپنے اور ان دو بے یارومددگار مہاجرین کے درمیان ایک اچھی خاصی کھائی کھڑی کردی تھی۔ یہ وہ کھائی تھا جسے تمینا کبھی عبور نہ کرنے کی آرزومند تھی۔

فرار ہونے کے بعد کی پہلی صبح جب وہ ایلپس پہاڑوں میں بنے ہوئے چھوٹے سے ہوٹل میں بیدار ہوئے اور خیال آیا کہ اب وہ بالکل تنہا ہیں، اس پوری کائنات سے منقطع جو کل تک ان کی تمام تر زندگی رہی تھی، تو تمینا نے خود کو بے حد آزاد محسوس کیا، اور بے حد مطمئن بھی۔ وہ پہاڑوں میں تھے، اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر کہ تنہا بھی۔ ایک ناقابلِ یقین، بے پناہ خاموشی نے انھیں چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ تمینا کو یہ ایک قطعی غیر متوقع تحفہ معلوم ہوئی۔ اچانک اس پر یہ حقیقت آشکارا ہوئی کہ اگر شوہر کو جور و ستم سے بچنے کے لیے چیکوسلوواکیہ کو الوداع کہنا پڑا تھا تو خود تمینا کو بیکراں سکوت کے حصول کے لیے — وہ سکوت جو محض اس کے اور اس کے شوہر کے لیے تھا، محبت کے لیے۔

جب شوہر کا انتقال ہوا تو تمینا پر یکبارگی گھر کی یاد کا دورہ پڑا۔ اسے ایسے ملک کے لیے بے پناہ تڑپ محسوس ہوئی جہاں ان کی ازدواجی زندگی کی اولین دہائی نے جہاں تہاں اپنے بڑے گہرے نقوش چھوڑے تھے۔ جذباتیت کی ایک ناقابلِ برداشت لہر اٹھی جس کے زیرِ اثر اس نے شوہر کے کوئی دس دوستوں کو اس کی موت کا اطلاع نامہ بھیج دیا۔ پلٹ کر کسی نے بھی رسید نہ بھیجی۔

ایک ماہ بعد اس نے کوڑی کوڑی جوڑی ہوئی ساری رقم نکالی اور ساحل سمندر کی سیر کو چل پڑی۔ اس نے پیراکی کا لباس پہنا، اعصابی ہیجان کو سکون پہنچانے والی گولیوں کی پوری شیشی نگلی، اور تیرتی ہوئی دور، بہت دور، سمندر میں چلی گئی۔ اس کا خیال تھا کہ گولیوں کی طاقت سے نڈھال ہوجائے گی اور بکمالِ خاموشی غرقاب، لیکن پانی کی غیر معمولی ٹھنڈک اور اس کے پیراکی کے استادانہ، طاقتور ہاتھوں نے اسے اونگھ جانے سے باز رکھا۔ (وہ درجۂ اول کی پیراک رہی تھی — ہمیشہ ہی۔) گولیوں کی تاثیر غیر متوقع طور پر کمزور ثابت ہوئی۔

وہ مڑی اور تیرتی ہوئی واپس ساحل پر لوٹ آئی۔ کمرے پہنچی اور پورے بیس گھنٹے تک دنیا و مافیہا سے بے خبر مسلسل سوتی رہی۔ جب بیدار ہوئی تو خود کو بے حد پرسکون اور خاموش محسوس کیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ خاموشی میں اور خاموشی کے لیے زندہ رہے گی۔

13

بی بی کے ٹیلی وژن کی نیلگوں، چاندی ایسی روشنی تمینا، یو یو، بی بی، اور بی بی کے شوہر ڈے ڈے (Dédé) پر (جو ایک ٹریولنگ سیلز مین تھا اور ابھی کل ہی چار روز باہر رہ کر لوٹا تھا) پڑ رہی تھی۔ کمرے میں پیشاب کی خفیف سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ ٹیلی وژن کے پردے پر غیر مرئی ماسٹر اَوف سیرے منیز بڑے گول مٹول گنجے سر والے سے بڑا اشتعال انگیز سوال کر رہا تھا: "آپ کی سرگزشت میں بعض بڑے حیرت انگیز جنسی اعترافات ملتے ہیں۔"

یہ ایک باقاعدہ ہفتہ واری پروگرام تھا جس میں مشہور و معروف ماسٹر اَوف سیرے منیز ان ادیبوں سے ہلکی پھلکی باتیں کرتا تھا جن کی کتابیں ہفتۂ گذشتہ چھپ کر منظر عام پر آئی ہوں۔

بڑے سے گنجے سر والا خوش دلی سے مسکرایا۔ "حیرت انگیز؟ اجی جانے دیجیے، ایسی بات کہاں ہے۔ اسے باقاعدہ علمِ شماریات کہیے، بس۔ خود دیکھ لیجیے، پہلی بار جب میں نے ہم بستری کی تو اس وقت میری عمر پندرہ سال تھی ..." — گول مٹول سر والے بڑے میاں نے بڑے فخر سے پینل کے ایک رکن سے دوسرے رکن کی طرف باری باری دیکھا — "جی ہاں، پندرہ سال۔ اب میں پینسٹھ برس کا ہوں۔ اس کا مطلب ہوا ہم کوئی پچاس سالہ فعال جنسی

زندگی کی بات کر رہے ہیں۔ فرض کیجیے کہ میں نے ہفتے میں اوسطاً دو بار مجامعت کی — بہت واجبی سا تخمینہ ہے — تو سالانہ کوئی سو بار۔ یعنی کلیتاً کوئی پانچ ہزار بار۔ آگے چلیے۔ اگر جماع کی مستی پانچ سیکنڈ قائم رہتی ہے، تو پچیّس ہزار سیکنڈوں کی جماعی مستی میرے کھاتے میں آتی ہے۔ ان کو جمع کیجیے تو چھ گھنٹے اور چھپّن منٹ بنتے ہیں۔ ایسا کوئی بڑا ریکارڈ نہیں، کیوں کیا خیال ہے؟"

کمرے میں موجود سبھی نے بے حد سنجیدگی سے اپنا اپنا سر ہلا دیا، سوائے تمینا کے، جو تصور میں اس گنجے کھوسٹ کو مسلسل اورگیزم کی حالت میں دیکھ رہی تھی۔ پیچ کھاتا ہوا، شدید تشنج کے عالم میں، کبھی دل پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ پندرہ منٹ میں ہی نقلی دانتوں کا چوکھٹا پٹ سے نیچے گر پڑتا ہے، اور پانچ منٹ میں ہی موصوف خود گر کر داعی اجل کو لبّیک کہتے ہیں۔ تمینا کی ہنسی چھوٹ جاتی ہے۔

"یہ ہنسنے کی ایسی کون سی بات ہے؟" بی بی جھلا کر پوچھتی ہے۔ "یہ اعداد وشمار خاصے مرعوب کن ہیں۔ اورگیزم کے چھ گھنٹے اور چھپن منٹ!"

"اب مجھ ہی کو لے لو۔ سالوں مجھے یہی پتا نہ چلا کہ اورگیزم نام کی بھی کوئی چیز ہوتی ہے،" یو یو نے کہا، "لیکن پچھلے سال سے یہ مجھے بھی باقاعدہ ہونے لگے ہیں۔"

اب ہر کوئی یو یو کے اورگیزم کے بارے میں بات کرنے لگا۔ جلد ہی ایک اور چہرہ، برہمی اور خفگی سے لبالب بھرا، پردے پر آ دھمکا۔

"یہ حضرت کس بات پر اس قدر خفا نظر آ رہے ہیں؟" ڈے ڈے سوچ میں پڑ گیا۔

"اور یہ بات بے حد اہم ہے،" پردے پر ادیب صاحب فرما رہے تھے، "بے حد اہم۔ اور یہ سب بلا کم وکاست میری کتاب میں موجود ہے۔"

"کیا بے حد اہم ہے؟" بی بی نے پوچھا۔

"کہ انھوں نے اپنا پورا بچپن رورو (Rourou) نامی گانو میں گزارا۔"

وہ آدمی جس نے اپنا سار بچپن رورو گانو میں گزارا تھا، اس کی ناک ضرورت سے کچھ زیادہ لمبی تھی اور اتنی وزنی کہ اس کے باعث اس کا پورا جسم لنگر کی طرح بیٹھا جا رہا تھا۔ سر بتدریج دھنسا جا رہا تھا اور دو ایک بار ایسا لگا کہ وہ اسکرین سے لڑکھڑا کر ابھی دھڑام سے نیچے

کمرے کے فرش پر آ رہے گا۔ اس کی حالت سخت تشنجی تھی۔ "یہ سب بلا کم و کاست میری کتاب میں موجود ہے۔ میری پوری تخلیقی ذات اس سیدھے سادے سے گانو میں لپٹی پڑی ہے۔ جب تک آپ یہ بات نہیں سمجھ لیتے، میرے لکھے سے غلط مطالب ہی نکالیں گے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں، بہر حال، میں نے اپنی چند اولین نظمیں کہی تھیں۔ جی ہاں، میں اسے شدید اہمیت کا حامل سمجھتا ہوں۔"

"بعض مردوں سے مجھے اورگیزم بالکل نہیں ہوتا،" بی بی نے انکشاف کیا۔

"اور یہ مت بھولیے،" ادیب صاحب کچھ اور زیادہ ہیجان میں آ کر بولے، "کہ یہیں میں پہلی بار سائیکل پر سوار ہوا تھا۔ جی جی، بالکل۔ اور یہ سارے کا سارا میری کتاب میں موجود ہے۔ بس اسے ایک علامت سمجھیے۔ میرے خیال میں سائیکل اس قدم کی علامت ہے جو آدمی قبیلے کی دنیا سے اٹھا کر تہذیب کی دنیا میں رکھتا ہے۔ تہذیب سے پہلی پہلی تفریح بازی (فلرٹ)۔ ایک کنواری جو پہلے بوسے کے قبل سے فلرٹ کر رہی ہو۔ ہنوز کنواری، تاہم شریکِ گناہ۔"

"یہ اس نے بالکل ٹھیک کہا،" یو یو نے پھٹ سے رائے دے ڈالی۔ "تناکا (Tanaka)، ایک لڑکی جس کے ساتھ میں کام کرتی ہوں، تو اس کو اپنا پہلا اورگیزم اس وقت ہوا جب وہ بائیسکل کی سواری کر رہی تھی؛ وہ اس وقت تک بالکل کنواری تھی۔"

سو اب وہ تناکا کے اورگیزم کی بات کرنے لگے، اور تمینا نے بی بی سے پوچھا کہ کیا وہ اس کا ٹیلی فون استعمال کر سکتی ہے۔

14

برابر والے کمرے میں پیشاب کی بو مقابلتاً زیادہ تھی۔ بی بی کی بچی وہاں سو رہی تھی۔

"مجھے پتا ہے کہ آپ کی اس سے بات چیت بند ہے،" تمینا نے سرگوشی میں کہا۔ "لیکن میرے پاس اسے حاصل کرنے کا کوئی اور ذریعہ بھی تو نہیں۔ آپ کو وہاں جا کر اُس سے ملنا ہی پڑے گا۔ چابی نہ ملے تو اس سے کہیں کہ تالا توڑ کر دراز کھول لے۔ اس کے پاس میری

کچھ چیزیں ہیں۔ خطوط — مجھے انھیں حاصل کرنے کا پورا حق ہے۔"

"تمینا، خدا کے واسطے مجھے اس عورت سے بات کرنے پر مجبور نہ کرو۔"

"ہمت کر کے یہ کام کر ہی دیجیے، میری خاطر۔ ڈیڈی، کر دیں گے نا؟ وہ آپ سے بہت ڈرتی ہے۔ آپ جائیں گے تو اسے منع کرتے نہ بنے گی۔"

"ایک بات سنو۔ میرے پاس ایک بہت اعلیٰ فرکوٹ ہے۔ جب تمھارے دوست مجھ سے پراگ آ کر ملیں گے تو میں یہ تمھارے لیے دے دوں گا۔ واپسی پر تمھیں پہنچا دیں گے۔ یہ پرانے خطوط کے بنڈل سے بہرحال بہتر چیز ہے۔"

"لیکن مجھے فرکوٹ نہیں چاہیے۔ مجھے تو صرف وہی پیکٹ چاہیے!"

"ذرا اونچا بولو، آواز سنائی نہیں دے رہی،" تمینا کے باپ نے کہا۔ لیکن تمینا دانستہ سرگوشیوں میں بات کر رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ بی بی اسے چیک زبان میں بات کرتا ہوا سن لے۔ ورنہ تاڑ جائے گی کہ لانگ ڈسٹینس کال ہو رہی ہے، اور یوں بیٹھے بٹھائے بی بی کو اس کی قیمت دینی پڑ جائے گی۔

"مجھے صرف وہ پیکٹ ہی چاہیے۔ آپ کا فرکوٹ نہیں۔"

"تم آج تک نہیں سیکھ سکیں کہ تمھاری زندگی میں اصلاً کن چیزوں کو سبقت حاصل ہونی چاہیے۔"

"دیکھیے ڈیڈی، یہ کال مجھے بہت مہنگی پڑ رہی ہے۔ خدارا اس سے جا کر ملیے۔"

مکالمہ جاری رکھنا محال تھا۔ تمینا کا باپ بار بار مختلف باتوں کو اونچی آواز میں دہرانے کے لیے کہتا رہا اور نہایت ہٹ دھرمی سے بڑی بی سے جا کر ملنے سے انکار کر دیا۔

"تم اپنے بھائی کو فون کیوں نہیں کرتیں؟" آخر اس نے تجویز پیش کی۔ "اس سے کہو کہ تمھاری ساس سے جا کر ملے، وہاں سے پیکٹ لے آئے اور میرے حوالے کر دے۔"

"مگر وہ میری ساس کو جانتا تک نہیں۔"

"ساری بات تو یہی ہے،" تمینا کا باپ ہنس پڑا۔ "اگر جانتا ہوتا تو بھول کر بھی اس سے ملنے کا خیال نہ آتا۔"

تمینا نے جلدی جلدی غور کیا۔ اب یہ کوئی ایسی بری تجویز بھی نہیں تھی۔ اس کا بھائی بڑا

مستعد اور جی دار آدمی تھا۔ اسے لوگوں سے اپنی بات منوانے کا گر بھی خوب آتا تھا۔ لیکن تمینا خود اسے فون نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جب سے ملک سے نکلی تھی، آج تک دونوں نے ایک دوسرے کو ایک بھی خط نہیں لکھا تھا۔ وہ بڑی اچھی تنخواہ پر ملازم تھا، اور اس پر ابھی تک محض اس لیے قائم تھا کہ اس نے اپنی مہاجر بہن سے سارے تعلقات منقطع کر لیے تھے۔

"میں اسے فون نہیں کرسکتی، ڈیڈی۔ آپ خود بات کرکے اس سمجھا دیں۔ سمجھا دیں گے نا؟ پلیز، ڈیڈی!"۔

15

ڈیڈی چھوٹا سا مدقوق آدمی تھا۔ جب وہ تمینا کو لیے سڑک کے کنارے کنارے چلتا تو اتنا فخر مند نظر آتا گویا دنیا کو اُس رزمیہ رات کی یادگار پیش کر رہا ہو جس میں اس نے تمینا کا بیج بویا تھا۔ اسے داماد کبھی ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ وہ ہمیشہ ہی اس کے خلاف برسرِ پیکار رہتا۔ جب اس نے تمینا کو فرکوٹ بھیجنے کی پیشکش کی (جو اسے اپنی کسی رشتے دار سے ترکے میں ملا ہوگا)، تو اس کا محرک داماد خسر کی کہنہ رقابت تھی، نہ کہ بیٹی کی تندرستی کے بارے میں تشویش۔ وہ چاہتا تھا کہ تمینا شوہر (خطوط کا بنڈل) پر اپنے باپ (فرکوٹ) کو ترجیح دے۔

اس خیال ہی سے تمینا پر باقاعدہ ہیبت طاری ہوگئی کہ اس کے پیکٹ کی قسمت ساس اور باپ کے معاندانہ ہاتھوں میں تھی۔ وہ اس بارے میں جتنا سوچتی، اتنا ہی اسے محسوس ہوتا کہ اس کی نجی نوٹ بکس اغیار پڑھ رہے ہیں، اور اغیار کی آنکھیں اس برسات کی مانند ہیں جو پتھر کی دیوار پر کندہ تحریر کو مٹائے دے رہی ہو۔ یا پھر وہ روشنی ہو جو ڈیویلپر میں جانے سے پہلے تصویر سازی کے کاغذ پر پڑے اور اس میں پنہاں عکس کو برباد کردے۔

اسے یاد آیا کہ جو بات اس کی نوشتہ یادداشتوں کو قدر و قیمت اور معنی بخشتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ صرف اس کے لیے تھیں۔ جس لمحے ان کا یہ وصف جاتا رہے گا، تعلق کا وہ گہرا رشتہ بھی بکھر جائے گا جو ان یادوں سے اسے وابستہ کرتا ہے۔ ایسا ہوا تو وہ ان نوشتوں کو اپنی آنکھوں کے بجائے ناظرین کے اس مخصوص نقطۂ نظر سے پڑھنے پر مجبور ہوجائے گی جو لاتعلقی

سے کسی غیر شخصی دستاویز کی چھان پھٹک کر رہے ہوں۔ ایسا ہوا تو وہ عورت جس نے انھیں لکھا ہے، اپنی شناخت کھو بیٹھے گی۔ اور وہ نمایاں مماثلت جو اس کے باوجود اس کے اور ان یادداشتوں کو رقم کرنے والی کے درمیان رہ جائے گی، اُس کی حیثیت محض ایک مضحکہ خیز، بھونڈی نقل سے زیادہ نہ ہوگی۔ نہیں، یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ وہ ان یادداشتوں کو کسی غیر کی نظر سے گزر چکنے کے بعد خود بھی کبھی پڑھنے کے قابل رہ سکے۔

یہی بات تھی جو وہ اتنی بے صبری ہورہی تھی اور اس آرزو میں فنا ہوئی جارہی تھی کہ جس قدر جلد ممکن ہوسکے ان نوٹ بکس، ان خطوط کو اپنی تحویل میں لے آئے، قبل اس کے کہ ان میں پنہاں ماضی کی شبیہ زائل ہوجائے۔

16

ایک روز بی بی کیفے میں آ کر بار والے حصے میں بیٹھ گئی۔ "ہیلو، تمینا" اس نے کہا، "ذرا ایک وہسکی تو دو۔"

عام طور پر بی بی کافی کا آرڈر دیا کرتی تھی۔ یا بہت ہوا تو کبھی کبھار پورٹ کا'۔ وہسکی کا آرڈر دے کر گویا وہ یہ ظاہر کررہی تھی کہ کوئی بات ضرور ہے۔

"تمھارے لکھنے لکھانے کا کیا حال ہے؟ کہاں تک پہنچیں؟" تمینا نے گلاس میں مشروب انڈیلتے ہوئے پوچھا۔

"اگر میرا موڈ ٹھیک ہوتا تو کام بھی ٹھیک ٹھاک چلتا رہتا" بی بی نے جواب دیا، مشروب ایک ہی سانس میں حلق میں انڈیل لیا، اور دوسرے کا آرڈر دے ڈالا۔

کچھ اور گاہک کیفے میں داخل ہوئے۔ تمینا نے ان سے پوچھا کہ کیا کھائے پئیں گے۔ پھر وہ بار میں واپس آئی، اپنی دوست کو وہسکی کا دوسرا گلاس دیا، اور نوواردوں کی خبر گیری میں لگ گئی۔ جب دوبارہ واپس آئی تو بی بی نے بتایا: "میں ڈے ڈے سے عاجز

آ گئی ہوں۔ جب بھی دورے سے لوٹتا ہے، مسلسل دو دن بستر میں اینڈا پڑا رہتا ہے، اور شب خوابی کا لباس تک نہیں تبدیل کرتا۔ پاگل کر دینے کے لیے اتنا ہی کافی ہے، ہے نا؟ اس کے باوجود، ستم دیکھو، ساتھ سونے کے لیے بالکل چاق و چوبند۔ یہ بات سمجھ کر نہیں دیتا کہ میرے لیے ہم بستری کی کچھ اہمیت نہیں، کچھ بھی نہیں۔ اب مجھے اُس سے علاحدہ ہونا ہی پڑے گا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ہمہ وقت اپنی احمقانہ تعطیلات کے خیال میں مگن رہتا ہے۔ بستر میں پڑے پڑے سامنے ایٹلس پھیلائے مطالعہ کرتا رہتا ہے۔ پہلے پراگ جانا چاہتا تھا۔ اب یہ خیال خواب ہو گیا ہے۔ آئرلینڈ پر کوئی کتاب ہتھے چڑھ گئی ہے۔ سو وہاں جانے کے شوق میں مرا جا رہا ہے۔"

"تو کیا اب چھٹیاں گزارنے تم لوگ آئرلینڈ جا رہے ہو؟" تمینا نے پوچھا۔ اسے اپنے حلق میں کوئی چیز پھنستی ہوئی محسوس ہوئی۔

"ہم آئرلینڈ جا رہے ہیں؟ ہم کہیں نہیں جا رہے ہیں۔ میں یہاں سے ہلنے والی نہیں۔ بس یہیں رہوں گی اور کتاب لکھوں گی۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ اسے کب میری پروا ہے۔ یہاں میں لکھنے لکھانے میں مشغول ہوں، اور تمھارا کیا خیال ہے کہ یہ مجھ سے اتنا بھی پوچھتا ہے کہ لکھ کس چیز کے بارے میں رہی ہو۔ جھک مار کر اب معلوم ہو رہا ہے کہ ہمارے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں۔ ہمارے پاس ایک دوسرے سے کہنے کے واسطے اب کچھ نہیں رہ گیا۔"

تمینا پوچھنا چاہتی تھی، "تو اب پراگ جانے کا ارادہ نہیں رہا؟" لیکن حلق میں پھنسی چیز کا حجم یکبارگی بڑھ گیا اور وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ ٹھیک اسی لمحے یویو کیفے میں داخل ہوئی، اچک کر بار اسٹول پر جا سوار ہوئی، اور سوال داغا، "کیا تم سب کے سامنے کر سکتی ہو؟"

"کیا مطلب؟"

"مثلاً یہاں کیفے میں، ٹھیک فرش پر، سب کے سامنے، یا پھر سینما میں فلم کے دوران؟"

"چپ!" بی بی نے سر نیچا کر کے اسٹول کے پائے کے پاس کھڑی اپنی غل مچاتی ہوئی بچی سے کہا، پھر سر اٹھایا اور بولی، "ہاں ہاں، کیوں نہیں؟ کوئی غیر فطری بات تو ہے نہیں — یا ہو

تو بتاؤ؟" جو چیز فطری ہے اسے کرنے میں مجھے کیا شرم!"

تمینا پھر تذبذب میں پڑ گئی کہ بی بی سے اس کے پراگ کے دورے کے بارے میں دوبارہ پوچھے یا نہ پوچھے۔ لیکن اب یہ سوال ہی سرے سے غیر ضروری ہوگیا تھا۔ اسے خوب پتا تھا، بالکل واضح تھا کہ بی بی پراگ جانے والی نہیں تھی۔

اتنے میں باورچی خانے سے کیفے کے مالک کی بیوی نکل کر اس کی طرف چلی آئی اور بی بی کو دیکھ کر مسکرائی۔ "کیا حال ہے؟" اس نے بی بی سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔

"ہمیں اگر ضرورت ہے تو بس انقلاب کی،" بی بی نے اعلان کیا۔ "کچھ نہ کچھ ضرور ہونا چاہیے۔ کچھ نہ کچھ یہاں ضرور ہونا چاہیے۔"

اس شب تمینا نے شتر مرغوں کو خواب میں دیکھا۔ وہ اب بھی احاطے کے اندر جالی دار دیوار سے لگ کر کھڑے ہوئے تھے اور مسلسل بک بک کیے جا رہے تھے۔ وہ خوفزدہ ہوگئی اور ہل جل تک نہ سکی۔ محض سحر زدہ سی انھیں چونچیں چلاتے تکتی رہی۔ پھر اس نے لب مضبوطی سے بھینچ لیے۔ اس کے منہ میں ایک طلائی انگشتری تھی اور وہ اس کی حفاظت کے بارے میں سخت خائف تھی۔

17

میں اسے منہ میں طلائی انگشتری چھپائے کیوں تصور کرتا ہوں؟

اس معاملے میں آپ مجھے قطعی معذور سمجھیے۔ کیا کروں، وہ مجھے اسی طرح نظر آتی ہے۔ ایک نگارش جسے پڑھے ہوئے زمانہ ہوگیا، اچانک ذہن میں در آتی ہے: "ملائم، شفاف، فلزی آواز، جیسے کوئی طلائی انگشتری نقرئی تسلے میں گر رہی ہو۔"[1]

جوانی میں تامس مان نے موت کے بارے میں ایک سادہ لوح اور بڑی ساحرانہ کہانی لکھی تھی۔ اس میں موت کو بے حد حسین دکھایا گیا ہے، کیونکہ ایسے تمام لوگوں کو جو کم عمری میں

اس کا خواب دیکھتے ہیں، موت ہمیشہ ہی بڑی دل آویز نظر آتی ہے، کیونکہ اس زمانے میں، دور افتادہ جگہوں میں گونجنے والی نیلگوں آوازوں کی طرح، یہ ہنوز بڑی غیر حقیقی اور طلسماتی ہوتی ہے۔

ایک نوجوان جسے مرضِ موت لاحق ہے، کسی نامعلوم اسٹیشن پر ریل گاڑی سے اترتا ہے۔ شہر میں داخل ہوتا ہے شہر کا نام اسے معلوم نہیں اور کسی بوڑھی عورت کے گھر میں، جس کی پیشانی خارش کے دھبوں سے اَٹی ہے، چند کمرے کرایے پر لیتا ہے۔ جی نہیں، مجھے اس واقعے کو بیان کرنے کی کوئی خواہش نہیں جو اُن کرایے پر لیے گئے کمروں میں پیش آیا۔ میں تو صرف ایک بے حد معمولی سے واقعے کی بازخوانی کرنا چاہتا ہوں: سامنے کے کمرے کے گرد چلتے ہوئے اس بیمار نوجوان کو معاً یہ احساس ہوا کہ "اپنے قدموں کی آواز کے درمیان اُس نے ایک اور آواز بھی سنی ہے جو اس کے دورویہ کمروں سے آرہی تھی — ملائم، شفاف، فلزی آواز — لیکن ممکن ہے یہ محض فریب ہی ہو۔ جیسے کوئی طلائی انگشتری نقرئی تسلے میں گررہی ہو، اس نے سوچا..."

اس ادنیٰ سے صوتی واقعے کو کہانی میں کہیں بھی سلیقے سے ظاہر کیا گیا ہے اور نہ ہی واضح۔ محض عمل کے اعتبار ہی سے دیکھیں تو اسے کسی بڑے خسارے کے بغیر حذف کیا جاسکتا تھا۔ وہ آواز تو بس خود بخود وجود میں آ گئی تھی۔

لیکن میرا خیال ہے کہ تامس مان نے صرف اس لیے یہ "ملائم، شفاف، فلزی آواز" سنوائی ہے کہ مکمل خاموشی کا تاثر قائم ہوسکے، وہ خاموشی جس کے حسن کو سماعی بنانے کی اسے ضرورت تھی، اور حسن کو لائقِ ادراک بننے کے لیے خاموشی کی ایک مخصوص کم سے کم مقدار کی ضرورت ہوتی ہے (جس کا مناسب ترین پیمانہ، اتفاق سے، طلائی انگشتری کی نقرئی تسلے میں گرنے کی آواز ہے)۔

(جی ہاں، میں جانتا ہوں۔ آپ کو ذرا پتا نہیں کہ میرا مدعا کیا ہے۔ حسن کو سدھارے ہوئے ایک زمانہ ہوگیا۔ خوبصورتی کھسک کر سطح کے شوروشغب کے نیچے چلی گئی ہے — لفظوں کا شور، کاروں کا شور، موسیقی کا شور، علامتوں کا شور — جس میں ہم مسلسل زندگی کرتے ہیں۔ یہ اتنی ہی غرقاب ہوچکی ہے جتنا جزیرۂ اطلانتس، اور اس کی باقیات میں صرف لفظ ہی بچ رہا

ہے، جس کے معنی سال بہ سال صراحت سے محروم ہوتے جارہے ہیں۔)

پہلی بار جب تمینا نے اس خاموشی کو سنا (جو اتنی ہی بیش قیمت تھی جتنا غرق شدہ اطلانتس پر پائے جانے والے مرمریں مجسّموں میں سے کسی مجسّمے کا ٹکڑا) تو یہ اس وقت تھا جب وہ چیکوسلوواکیہ سے فرار ہونے کے بعد، جنگل کے بیچوں بیچ، اس الپائن ہوٹل میں سوکر اٹھی تھی: اور دوسری بار اس وقت جب وہ سمندر میں تیرتی چلی جارہی تھی، اس حال میں کہ پیٹ اعصابی تشنج کو کم کرنے والی گولیوں سے بھرا ہوا تھا، وہ گولیاں جو اس کے لیے موت کی بجائے غیر متوقع سکون لائیں۔ اس نے مصمم ارادہ کرلیا کہ وہ اس خاموشی کو کبھی جدا نہیں ہونے دے گی، کہ اسے اپنے اندر اتار کر وہیں تھامے رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مجھے اپنی خوابی دیوار کے مقابل کھڑی ہوئی نظر آتی ہے، اس حال میں کہ طلائی انگشتری اس کے مضبوطی سے بند منہ میں رکھی ہے۔

وہ چھ لمبی گردنوں کے سامنے کھڑی ہے، جن کے سر چھوٹے چھوٹے ہیں اور چپٹی چپٹی چونچیں بنا خفیف سی آواز پیدا کیے دیوانہ وار کھل بند ہورہی ہیں۔ وہ ان کی بات سمجھنے سے معذور ہے۔ اسے کچھ پتا نہیں کہ وہ اسے ڈرا دھمکا یا خبردار کررہی ہیں، استدعا کررہی ہیں یا التجا، اور چونکہ وہ ان کا مدعا سمجھنے سے قاصر ہے، اس لیے بے حد فکر مند اور مضطرب ہے۔ اسے ڈر ہے کہ اس طلائی انگوٹھی (خاموشی کے سُر ٹھیک کرنے کا کانٹا) کے ساتھ کوئی دردناک واقعہ پیش آنے والا ہے، اور وہ اسے محفوظ رکھنے کے لیے مضبوطی سے بند منہ میں دھرے ہوئے ہیں۔

یہ تمینا کبھی نہ جان سکے گی کہ وہ اس سے کیا کہنے آئے تھے۔ لیکن مجھے پتا ہے۔ وہ اسے متنبہ کرنے، ڈرانے دھمکانے، یا اس کی تہدید کرنے ہرگز نہیں آئے تھے۔ انھیں تمینا سے بھلا کیا لینا دینا۔ وہ، ان میں سے ایکو ایک، اسے صرف اپنے بارے میں ہی بتانے آیا تھا۔ یہ بتانے کہ وہ کس طرح دانہ چگتے ہیں، کس طرح سوتے ہیں، کس طرح دوڑ کر چاردیواری تک آتے ہیں، اور دیوار کے پار انھیں کیا کچھ نظر آتا ہے؛ کہ کس طرح انھوں نے اپنا بے حد اہم بچپن، اتنے ہی اہم رورو گانو میں، گزارا ہے، اور کس طرح ان کا غایت درجہ کا اہم اورگیزم پورے چھ گھنٹے تک جاری رہا ہے؛ کہ وہ عورت جس نے بُنی ہوئی شال سے سر

ڈھکا ہوا ہے، انھیں کس طرح نظر آ رہی ہے؛ کہ وہ کس طرح تیرے، بیمار پڑے، پھر رو بصحت ہوئے؛ کہ کس طرح وہ کبھی جوان رہے ہیں، بائیسکلوں کی سواری کی ہے، اور اس دن گھاس کے ایک پورے تھیلے کی جگالی۔ لو، دیکھو، وہ وہاں کھڑے ہوئے ہیں، تمینا کے عین مقابل، اسے اپنی کہانی سنا رہے ہیں؛ سب کے سب ایک ساتھ، بڑے تاکیدی، محاربانہ، جارحانہ انداز میں۔ کیونکہ جو بات وہ اس سے کہنا چاہتے ہیں، اس سے زیادہ اہم کوئی اور چیز نہیں۔

18

چند دن بعد بناکا نشے میں دھت کیفے میں داخل ہوا اور بار اسٹول پر براجمان ہونے کی تگ ودو میں دو بار گر پڑا، لیکن دونوں بار لڑکھڑا کر اٹھا اور کود کر اس پر چڑھ گیا۔ ایک عدد کلواڈوس کا آرڈر دیا اور کاؤنٹر پر سر ڈال دیا۔ تمینا نے دیکھا کہ وہ رو رہا ہے۔

"کیا بات ہے مسٹر بناکا؟" اس نے پوچھا۔

بناکا نے آنسوؤں سے تر آنکھیں اوپر اٹھا کر سینے کی طرف اشارہ کیا، "میں کچھ بھی نہیں، سمجھیں؟ کچھ بھی نہیں۔ میرا سرے سے وجود ہی نہیں!"

وہ اٹھا اور غسل خانے چل دیا، اور وہاں سے نکلا تو بغیر پیسے ادا کیے سیدھا باہر چلا گیا۔

جب تمینا نے اس واقعے کا ذکر ایگو سے کیا تو اس نے کسی اخبار کا صفحہ نکال کر دکھایا جس میں کتابوں پر تبصرے چھپے تھے۔ ان میں ایک بقدرِ اشکِ بلبل سا نوٹ بناکا کی نگارشات پر بھی تھا — استہزا کی چار سطریں، اور بس۔

بناکا کا سینے کی طرف اشارہ کر کے روتے ہوئے اپنے وجودی کرب کا اظہار کرنا مجھے بے اختیارانہ گیئٹے کے *West-East Divan* کا ایک مصرع یاد دلاتا ہے: "جب ساری خلقت زندہ ہو، کیا اس وقت فردِ واحد بھی زندہ ہوتا ہے؟" گیئٹے کے استفسار کے پیچھے ادیب کے پورے عقیدے کا راز ملتا ہے۔ کتابیں لکھ کر فرد ایک پوری کائنات بن جاتا ہے (ہم بالزاک کی کائنات کی بات کرتے ہیں، چیخوف کی کائنات کی بات کرتے ہیں، کافکا کی کائنات کی

بات کرتے ہیں — کرتے ہیں نا؟)، اور چونکہ کسی بھی کائنات کا امتیازی وصف اس کی انفرادیت ہوتی ہے، کسی دوسری کائنات کا آس پاس وجود اس کے جوہرِ ذاتی کے لیے باقاعدہ خطرہ بن جاتا ہے۔

دو موچی آپس میں مکمل ہم آہنگی کے ساتھ رہ سکتے ہیں (بشرطے کہ ان کی دکانیں ایک ہی محلے میں نہ ہوں)۔ لیکن ٹھیک جس لمحے وہ موچیوں کی قسمت پر کتابیں لکھنا شروع کر دیں، ایک دوسرے کے آڑے آنے لگیں گے، انھیں فوراً یہ فکر لاحق ہوجائے گی: کیا ایک موچی کا وجود اس وقت بھی قائم رہ سکتا ہے جب بقیہ تمام موچیوں کا وجود قائم ہو؟

تمینا محسوس کرتی ہے کہ محض ایک اجنبی آنکھ اس کی ذاتی ڈائریوں کا سارا وقار غارت کردینے کے لیے کافی ہے، جبکہ گیبٹے کے خیال میں اگر اس کے شعر کسی شخص کی نظر میں آنے سے رہ جائیں تو اس کا — گیبٹے کا — پورا وجود کھٹائی میں پڑ جاتا ہے۔ تمینا اور گیبٹے کا فرق، انسان اور ادیب کا فرق ہے۔

کتاب لکھنے والا یا تو سب کچھ ہے (اپنے اور دوسروں کے لیے پوری کائنات) یا کچھ بھی نہیں۔ اور چونکہ سب کچھ تو ایک آدمی کو ملنے سے رہا، ہم میں سے ہر کتاب لکھنے والا نتیجتاً کچھ بھی نہیں۔ نظرانداز کردہ، رقابت کی آگ میں سوزاں، شدید طور پر مجروح — ہم ابنِ آدم، اپنے ہی بھائی کی موت کی آرزو کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے ہم ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں، اب خواہ یہ بنا کا ہو، بی بی ہو، گیبٹے، یا میں۔

سیاستدانوں، ٹیکسی ڈرائیوروں، اسپتال میں پڑی بچے جنتی عورتوں، داشتاؤں، خونیوں، مجرموں، طوائفوں، کوتوالوں، ڈاکٹروں اور مریضوں میں مراقِ تحریر کی ریل پیل میرے لیے اس بات کا بڑے سے بڑا ثبوت ہے کہ بلا استثنا ہر شخص اپنے میں ایک ادیب ہونے کا امکان مخفی رکھتا ہے۔ اور ہر کس و ناکس کو اس کا پورا حق حاصل ہے کہ بھاگتا ہوا سڑک پر نکل آئے اور بہ بانگِ دہل اعلان کرے: "ہم سب ادیب ہیں!"

اس کا سبب یہ ہے کہ ہر شخص کو اس حقیقت سے نظریں چار کرنے میں خاصی دقت ہوتی ہے کہ ایک نہ ایک دن وہ اس سرد مہر کائنات میں، دوسروں کی توجہ میں آئے، بغیر، کچھ کہے سنے بغیر، معدوم ہوجائے گا۔ چنانچہ ہر شخص کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ وقت نکل جانے سے

پہلے ہی الفاظ کی ایک پوری کائنات میں اپنی تقلیب کر لے۔

جب ہر آدمی میں مستور ادیب انگڑائی لے کر معرضِ وجود میں آ جائے گا (اور وہ وقت دور نہیں) تو ہم کائناتی بہرے پن اور قلتِ فہم کے عہد میں پہنچ چکے ہوں گے۔

19

اب لے دے کر ایگو ہی اس کی واحد امید رہ گیا تھا۔ چنانچہ اس نے جب دوسری بار تمینا کو شام کے کھانے پر چلنے کی دعوت دی تو وہ اس نے خوشی خوشی قبول کر لی۔

میز کے پار، اس کے عین مقابل بیٹھے ہوئے، ایگو صرف ایک ہی چیز کی بابت سوچ سکتا ہے: تمینا کسی طرح گرفت میں آ کر نہیں دیتی۔ دو بدو ہوتی ہے تو شک میں پڑ جاتا ہے اور سامنے کا وار کرنے سے ہچکچانے لگتا ہے۔ وہ جتنا کسی واجبی سی اور معیّن چیز کے حصول کی کوشش کے خوف سے اذیت اٹھاتا ہے، اتنا ہی دنیا کو، مبہم کی بے کرانی اور بے کرانی کے ابہام کو سر کرنے کی خواہش کچھ اور منہ زور ہو جاتی ہے۔ وہ جیب سے ایک رسالہ نکالتا ہے، اسے کھولتا ہے اور تمینا کو دیتا ہے۔ جو صفحہ اس نے کھولا ہے اس پر اس کا لکھا ہوا ایک طویل مضمون ہے۔

وہ رسالے کے بارے میں پرجوش لن ترانی شروع کر دیتا ہے اور مسلسل بولے جاتا ہے: ٹھیک ہے کہ یہ رسالہ ان کے محلے کے باہر کم ہی پڑھا جاتا ہے، لیکن نظریاتی اعتبار سے اس کا شمار باحیثیت رسالوں میں ہوتا ہے۔ اس کو شائع کرنے والوں میں اپنے اعتقادات کی مدافعت کرنے کا حوصلہ بھی پایا جاتا ہے، اور اس لحاظ سے یہ لوگ ضرور بہت کچھ حاصل کر کے رہیں گے۔ ایگو مسلسل تقریر کیے جاتا ہے، اس کے الفاظ شہوانی جارحیت کا استعارہ بننے، طاقت کا مظاہرہ کرنے کی جان لیوا کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ ان میں مجرد کا وہ رجھا لینے والا جوش و خروش پایا جاتا ہے جب وہ جست بھر کے مادیت کی لاطائلی میں خود کو بدل دینے کے درپے ہو۔

تمینا جوں جوں ایگو کو دیکھے جاتی ہے، اس کے خط و خال کو از سر نو ترتیب دینے لگتی

ہے۔ پہلے جو صرف ایک روحانی ریاضت ہوا کرتی تھی، اب عادت سے زیادہ کوئی چیز بن گئی ہے۔ وہ کسی مرد کو کسی اور طرح دیکھنے سے قاصر ہے۔ اس کے لیے بڑی کاوش کی، اپنی جملہ تخلیقی صلاحیتوں کو حرکت میں لانے کی ضرورت ہے۔ پھر بھی، بڑے اچانک طور پر، ایگو کی بھوری آنکھیں واقعی نیلی ہو جاتی ہیں۔ تمینا نظریں اس کے چہرے پر جمائے رکھتی ہے۔ نیلاہٹ کو زائل ہونے سے روکنے کے لیے اسے آنکھوں کی تماتر شدت کے ساتھ اس پر ارتکاز کرنا ہوتا ہے۔

تمینا کی ٹکٹکی کو محسوس کر کے ایگو کے ہاتھ پانو پھولنے لگتے ہیں۔ وہ اپنی تقریر بازی کی رفتار اور زیادہ تیز کر دیتا ہے۔ اس کی آنکھوں کی نیلاہٹ بڑی دلپذیر ہے۔ اس کے بالوں کا خط کنپٹیوں کے پاس سے آہستہ آہستہ پیچھے کی سمت سمٹنے لگتا ہے تا آنکہ سامنے کے بال گھٹ کر صرف آگے کو جھکی ہوئی تنگ سی تکون کی شکل میں رہ جاتے ہیں۔

”میں نے ہماری مغربی دنیا کو ہمیشہ تنقید کا ہدف بنایا ہے۔ لیکن یہاں ہمارے درمیان جو ناانصافی ہو رہی ہے، اس سے مجبور ہو کر ہم دوسرے ممالک سے غلط طور پر مروت برتنے پر مائل ہو جاتے ہیں۔ تمھارا شکریہ، ہاں، تمھارا شکریہ، تمینا، کہ تمھاری وجہ سے میں بالآخر یہ سمجھنے کے قابل ہو گیا ہوں کہ طاقت کا مسئلہ ہر جگہ یکساں ہے۔ تمھارے ملک اور ہمارے ملک میں، مشرق میں اور مغرب میں۔ ہماری یہی کوشش ہونی چاہیے کہ کبھی ایک طاقت کو دوسری طاقت سے نہ بدلیں؛ ہمیں چاہیے کہ طاقت کے اصول کو بنفسہٖ مسترد کر دیں اور اس کی ہر جگہ اور ہر شکل میں پرزور نفی کریں۔“

”مطلب؟“ تمینا نے بات بیچ میں کاٹتے ہوئے کہا۔ ”تم نے اور میں نے اس بارے میں سرے سے کبھی کوئی گفتگو ہی نہیں کی۔“

اس وقت گھٹ کر ایگو کی صرف ایک نیلی آنکھ رہ گئی تھی، اور وہ بھی بتدریج بھوری ہوتی جا رہی تھی۔

”تمھیں اس بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میرے لیے تمھارا تصور کرنا ہی کافی تھا۔“

ویٹر نے جھک کر ان کے آگے ڈنر کا پہلا کورس لگا دیا۔

"میں گھر پر اسے پڑھوں گی،" تمینا نے رسالے کو تھیلے میں ٹھونستے ہوئے کہا، پھر یہ اضافہ کیا، "بی بی پراگ نہیں جارہی۔"

"مجھے پہلے سے معلوم تھا،" ایگو نے کہا۔ "لیکن پریشان نہ ہو، تمینا، میں نے جو وعدہ کیا تھا وہ تمھیں یاد ہے نا؟ میں تمھاری خاطر وہاں جاؤں گا۔"

20

"ایک خوش خبری سنو: میں نے تمھارے بھائی سے بات کر لی ہے اور وہ اس سنیچر تمھاری ساس سے ملنے جارہا ہے۔"

"سچ؟ آپ نے اسے ٹھیک سے سمجھا دیا ہے نا؟ بتادیا ہے نا کہ چابی نہ ملے تو تالا توڑ دے؟"

چونگا رکھتے رکھتے تمینا مارے خوشی کے مست ہوگئی۔

"اچھی خبر تھی؟" ایگو نے پوچھا۔

"ہاں،" اس نے سر ہلا کر جواب دیا۔

وہ اس وقت بھی اپنے باپ کی بشاش آواز کانوں میں سن سکتی تھی۔ وہ ناحق ہی اس سے بدگمان تھی، اس نے اپنے آپ سے کہا۔

ایگو اٹھ کر بار تک آیا۔ دو گلاس اٹھائے اور ان میں وہسکی ڈالی۔ "تمینا، تم جب چاہو میرے گھر سے بے تکلف پراگ فون کر سکتی ہو۔ میں ایک بار پھر وہی کہتا ہوں جو پہلے کہتا آیا ہوں: تمھارے ساتھ ہوتا ہوں تو جی کو بہت بھلا لگتا ہے۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ تم کبھی میرے ساتھ نہیں سوؤ گی۔"

"مجھے خوب معلوم ہے کہ تم کبھی میرے ساتھ نہیں سوؤ گی" کہنے کے لیے اسے خود کو باقاعدہ مجبور کرنا پڑا تھا۔ صرف اس لیے کہ خود کو باور کرا سکے کہ وہ اس پراسرار اور ناقابلِ حصول عورت کے مقابل کھڑا ہو سکتا ہے، اور اس سے بعض باتیں کہہ سکتا ہے (ہر چند کہ اسے ان باتوں کو بکمال ہوشیاری پیرایۂ نفی میں کہنا پڑا تھا)، اور خود کو تقریباً بے دھڑک محسوس کرتا ہے۔

تمینا اٹھی، چل کر ایگو کے پاس آئی اور اس کے ہاتھ سے وہسکی کا گلاس لے لیا۔ وہ اپنے بھائی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ آپس میں بات چیت بند ہونے کے باوجود وہ اب بھی ایک دوسرے کے دوست تھے، اور ایک دوسرے کی مدد کے لیے تیار۔

ایگو نے جام ٹوسٹ کیا: "سب بخوبی انجام پائے!" اور گلاس ایک گھونٹ میں چڑھا گیا۔

تمینا نے بھی اپنی وہسکی غٹا غٹ پی ڈالی اور خالی گلاس میز پر رکھ دیا۔ وہ بس لوٹ کر اپنی کرسی کی طرف جانے والی تھی کہ ایگو نے تیزی سے بازو اس کے گرد حمائل کر دیا۔

اس نے ایگو کی پیش قدمی کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ صرف رخ پھیر لیا۔ اس کا منہ بگڑ گیا تھا اور پیشانی شکن آلود۔

ایگو نے تمینا کو آغوش میں بھر تو لیا تھا لیکن ہنوز حیران کھڑا تھا کہ یہ سب کیسے ہو گیا۔ اولین چند ثانیوں تک وہ اپنی دیدہ دلیری پر سخت خائف رہا۔ اگر تمینا نے دھکا دے کر اسے جدا کر دیا ہوتا تو وہ نہایت بزدلی سے پیچھے ہٹ کر اس سے باقاعدہ معافی مانگنے لگ جاتا۔ لیکن تمینا نے اُسے دھکا وکا نہیں دیا۔ تمینا کے مڑے تڑے چہرے اور اپنے سے گریزاں سر کو دیکھ کر ایگو کی شہوت اور بھڑک اٹھی۔ اب تک جن دو چار عورتوں سے اُس کے جنسی تعلقات رہے تھے ان میں سے کسی نے بھی آج تک اس کی ملاعبت کے خلاف کسی شدید ردِعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اگر وہ پہلے سے ہی یہ طے کر کے آئی ہوتی تھیں کہ اس کے ساتھ ہم بستری کریں گی، تو خود ہی کپڑے اُتار کر اطمینان سے اس کا انتظار کرنے لگتیں، تقریباً لاتعلقی کے ساتھ، کہ دیکھیں اب وہ ان کے ساتھ کیا کرتا ہے۔ چہرے پر بل ڈال کر تمینا نے اس ہم آغوشی کو وہ معنی پہنا دیے تھے جن کا وہ آج سے قبل خواب میں بھی تصور نہیں کر سکتا تھا۔ وہ دیوانہ وار اسے بھینچنے لگا اور بڑی بے تاب عجلت سے اسے برہنہ کرنے کی کوشش میں لگ گیا۔

لیکن تمینا نے اپنی مدافعت سے کیوں انکار کر دیا؟

مسلسل تین سال سے اسے خدشہ تھا کہ ایک نہ ایک دن یہ ہونے ہی والا تھا۔ مسلسل تین سال سے وہ اس واقعے کی ساحر، نگراں آنکھ کے نیچے رہتی آئی تھی۔ اور اب یہ آ پہنچا تھا، بعینہٖ اسی طرح جس طرح اس نے اس کا تصور کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنی مدافعت سے انکار کر دیا اور اسے یوں قبول کر لیا جیسے کوئی ہونی کو قبول کرتا ہے۔

اگر وہ کچھ کرسکتی تھی تو اتنا ہی کہ سر ایگو کی طرف سے موڑ لے۔ لیکن اس روگردانی سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ رخ پھیرتے ہی اس کے شوہر کا پیکر تمام کمرے میں اس کا پیچھا کرنے لگا۔ یہ ایک بڑے ڈیل ڈول والے شوہر کا اتنا ہی گرانڈیل اور بے ڈھنگا پیکر تھا۔ وہ شوہر جو زندگی سے کہیں زیادہ بڑا تھا، لیکن عین مین اسی طرح جس طرح وہ تین سال سے تصور کرتی چلی آئی تھی۔

بالآخر جب اس کا تن کپڑوں سے جدا ہوا تو ایگو، جو اسے جنسی طور پر مشتعل سمجھ کر شہوت کے مارے پاگل ہوا جا رہا تھا، یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا کہ تمینا کے نسوانی اعضا رطوبت سے عاری تھے"۔

21

ایک بار اسے معمولی سے آپریشن سے گزرنا پڑا تھا جس میں اعضا کو سن کرنے والی دوا استعمال نہیں کی گئی تھی۔ چنانچہ درد کی شدت اور کاٹ سے توجہ بٹانے کے لیے وہ آپریشن کی پوری مدت مجبوراً انگریزی کے بے قاعدہ افعال کی گردان کرتی رہی تھی۔ اس بار بھی اس نے یہی نسخہ آزمانے کی کوشش کی۔ اس نے ساری توجہ ان نوٹ بکس پر مرکوز کردی، اس بات پر کہ عنقریب وہ بحفاظت اس کے باپ کی تحویل میں چلی آئیں گی، اور یہ کریم آدمی ایگو وہاں جا کر انھیں اس کے لیے لے آئے گا۔

کریم آدمی ایگو نہایت تیزی اور دیوانگی سے کچھ دیر تک اپنے کام میں لگا رہا، تا آنکہ تمینا کو محسوس ہوا کہ اب وہ اپنے بازوؤں کے بل اٹھ کر ماہی بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر اپنے کولھے ہر سمت میں جھاڑ پٹک رہا ہے۔ تمینا نے اندازہ کرلیا کہ وہ اس کے جنسی ردِعمل سے غیر مطمئن ہے، اور اس کی شہوت کو اپنے حسبِ ضرورت برانگیختہ نہ پا کر ہر ممکن زاویے سے اس میں دخول کی کوشش کر رہا ہے، کہ کسی طرح اثر پذیری کے اس مقام کو جا لے جو وہ کہیں دور اپنے جسم کی گہرائیوں میں اس کی دسترس سے روکے ہوئے ہے۔

ایگو کی قیامت کی دشوار گزار کوششوں کو دیکھنے کی تمینا کو چنداں خواہش نہ تھی۔ چنانچہ

اس نے ایک بار پھر سر ایگو کی طرف سے پھیر لیا۔ اپنے خیالات مجتمع کر کے ایک بار پھر نوٹ بکس پر مرتکز ہونے کی کوشش کی۔ خود کو مجبور کیا کہ شوہر کے ساتھ گزاری ہوئی چھٹیوں کی اس ترتیب کا جائزہ لے جو اس کی یادداشت نے، ہر چند نامکمل سہی، از سر نو منظم کی تھی: پہلی جو بوہیمیا میں ایک چھوٹی سی جھیل کے کنارے گزاری گئی تھیں، پھر یوگوسلاویہ والی، پھر بوہیمیا کی ایک اور جھیل والی، اس کے بعد وہ جو کسی معدنی چشمے پر گزاری گئی تھیں ــ لیکن ترتیب ہنوز غیر واضح تھی۔ 1964 میں دونوں ٹیٹرس گئے تھے، اور اس سے اگلے سال بلغاریہ، لیکن اس کے بعد ہر چیز خلط ملط ہو جاتی تھی۔ 1968 میں انھوں نے ساری چھٹیاں پراگ ہی میں بتائی تھیں، اس سے اگلے سال وہ معدنی چشمے پر گئے تھے، اور اس کے بعد ہجرت کر کے یہاں چلے آئے تھے اور اپنی آخری تعطیلات اٹلی میں منائی تھیں۔

ایگو نے اپنا جسم اس سے علاحدہ کر لیا اور اس کے جسم کو پلٹانے کی کوشش کی۔ تمینا نے اندازہ کر لیا کہ وہ چاہتا ہے تمینا جانوروں کی طرح گھٹنوں اور کہنیوں کے بل ہو جائے۔ اچانک اسے خیال آیا کہ ایگو عمر میں اس سے چھوٹا ہے، اور وہ شرمندہ ہو گئی۔ اس کے باوجود اس نے جذبات مار کر پوری لاتعلقی سے خود کو ایگو کے سپرد کر دیا۔ اُس نے ایگو کے جسم کے ناہموار دھکوں اور رگڑوں کو اپنی پشت پر محسوس کیا۔ اسے لگا جیسے وہ اسے اپنی بے پناہ قوتِ باہ اور قوتِ برداشت سے خیرہ کرنے کے درپے ہو، گویا ایک فیصلہ کن جنگ لڑ رہا ہو، اپنا امتحان لے رہا ہو، یہ ثابت کرنا چاہتا ہو کہ وہ انجام کار اسے مغلوب کرنے پر قادر اور اس کے لائق ہے۔

اسے پتا نہیں تھا کہ ایگو اسے دیکھنے سے قاصر ہے۔ تمینا کی پشت پر نظر ڈالتے ہی (اس کے حسین، بالغ کولھوں کی اس کھلی ہوئی آنکھ پر جو اسے ترحم سے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی) اس کی شہوت اتنی بھڑک اٹھی کہ اس نے آنکھیں بند کر لیں، اپنے دھکوں کی جنونی رفتار کو لگام دی، اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ اب وہ بھی اپنے ذہن کو کسی اور چیز (وہی ایک چیز جو دونوں میں مشترک تھی) پر مرتکز کرنے اور جنسی فعل کو کچھ دیر اور جاری رکھنے کی جان توڑ کوشش کر رہا تھا۔

اسی اثنا میں تمینا کو ایگو کے کمرے کی سفید دیوار پر شوہر کا بڑا سا چہرہ نظر آیا، اور اس نے مضبوطی سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ایک بار پھر وہ بے قاعدہ افعال کی گردان کی طرح

ان چھٹیوں کو دہرانے لگی: جھیل کے کنارے گزاری ہوئی پہلی چھٹیاں، پھر یوگوسلاویہ، اور جھیل؟ — پھر ٹیٹرس والی، پھر بلغاریہ والی، اس کے بعد ہر چیز مبہم ہوگئی تھی، پھر پراگ — معدنی چشمے، اور آخراً اٹلی۔

ایگو کی گہری گہری سانسوں کی آواز اسے اپنی یادوں سے کھینچ لائی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور دیوار پر شوہر کا چہرہ دیکھا۔

ٹھیک اسی لمحے ایگو نے بھی آنکھیں کھول دیں، اور تمینا کی پشت میں جڑی ہوئی اس بے پناہ آنکھ کو دیکھتے ہی جنسی وجد کی ایک زبردست لہر کوندے کی طرح اس کے سارے جسم میں لپک گئی"۔

22

جب تمینا کا بھائی اس کی ساس سے ملنے گیا تو اسے دراز کا تالا توڑنے کی ضرورت نہیں پیش آئی۔ دراز پہلے سے کھلی ہوئی تھی، اور اس میں گیارہ کی گیارہ نوٹ بکس موجود تھیں۔ لیکن وہ بنڈل میں بندھی ہوئی نہ تھیں بلکہ منتشر تھیں۔ خطوط بھی اسی طرح بے ترتیب اور بکھرے ہوئے تھے، کاغذات کا ایک بے شکل انبار۔ تمینا کے بھائی نے اس ملبے کو سوٹ کیس میں بھرا اور باپ کو دے آیا۔

تمینا نے فون پر باپ سے کہا کہ ساری چیزوں کو قرینے سے کاغذ میں لپیٹ کر اسے احتیاط کے ساتھ چاروں طرف سے باندھ دے، اور — اس سے بھی زیادہ اہم — نہایت عاجزی سے درخواست کی کہ نہ وہ نہ اس کا بھائی ان کا ایک لفظ پڑھیں۔

باپ نے تمینا کو اطمینان دلایا، حالانکہ اس بات کا وہ تقریباً برا مان گیا کہ وہ کبھی اپنے خواب میں بھی تمینا کی ساس کے نقشِ قدم پر چل کر ان چیزوں کو پڑھے گا جن سے اس کا کوئی سروکار نہ ہو۔ لیکن مجھے معلوم ہے (اور تمینا کی بھی معلوم ہے) کہ بعض چیزیں ہوتی ہی ایسی ہیں کہ آدمی انھیں دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا — مثلاً جیسے کار کا حادثہ یا دوسروں کے عشقیہ خطوط۔

چنانچہ، انتہائے کار، تمینا کی بہت ہی بے تکلف اور نجی تحریریں اب اس کے باپ کی

حفاظت میں تھیں۔ لیکن کیا اس کے لیے ان کی اب بھی وہی قدر و قیمت تھی؟ کیا وہ پہلے ہی سینکڑوں بار یہ نہ کہہ چکی تھی کہ اغیار کی نگاہ اس بارش کی طرح ہوتی ہے جو لکھے کو دھو ڈالتی ہے؟

اب یہ ہے کہ اس معاملے میں وہ غلطی پر تھی۔ وہ تو انھیں دیکھنے کے لیے پہلے سے کہیں زیادہ تڑپ رہی تھی۔ اس کے لیے ان کی اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی۔ وہ پامال اور بے حرمت کی جا چکی تھیں۔ وہ اور اس کی یادیں مشترکہ قسمت میں ایک دوسرے کی بہنیں تھیں۔ ان سے اس کی محبت اور بھی بڑھ گئی۔

لیکن اس کے باوجود وہ یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی کہ اسے باقاعدہ ذلیل، باقاعدہ سبک سر کیا گیا ہے۔

ایک بار، بہت پہلے — جب اس کی عمر سات سال کے لگ بھگ تھی — چچا اس کے کمرے میں ٹھیک اس وقت در آیا تھا جب وہ برہنہ تھی۔ اسے بے حد شرم آئی۔ پھر یہی ندامت سرکشی میں تبدیل ہوگئی۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے خود سے طفلانہ لیکن باضابطہ عہد کر ڈالا کہ مدت العمر اس چچا کو کبھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھے گی۔ وہ جب بھی ان کے یہاں آتا، وہ اسے دیکھنے سے انکار کر دیتی، اور اس کے لیے اسے ہر جور و ستم منظور تھا: گھر والوں کی تہدید، ڈانٹ ڈپٹ، پھٹکار، چیخنا چلانا، طنز، استہزائی ہنسی سب کچھ۔

اور اب یہاں ایک ملتی جلتی صورت حال کا سامنا تھا۔ وہ اپنے باپ اور بھائی کی شکر گزار تھی لیکن وہ اب دوبارہ کبھی ان کا منہ تک نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ آج یہ بات اس پر پہلے سے کہیں زیادہ واضح ہو چکی تھی: وہ کبھی لوٹ کر ان کے پاس نہیں جائے گی۔"

23

ایگو کی غیر متوقع کامیابی اپنے ساتھ اتنی ہی پسپائی بھی لیتی آئی تھی۔ ہر چند وہ اب جب چاہتا اس کے ساتھ ہم بستری کر سکتا تھا (پہلی دفعہ خود کو سپرد کر دینے کے بعد اب وہ شاید ہی انکار کر سکتی تھی)، لیکن اسے خوب احساس تھا کہ وہ اسے اپنا بنانے، اسے خیرہ کرنے میں بری طرح ناکام رہا ہے۔ ایک برہنہ جسم اس کے جسم کے نیچے اس قدر لاتعلق، اتنا سرد مہر، اتنا اجنبی

کیسے ہوسکتا ہے؟ اور وہ بھی اس وقت جب وہ اسے اپنی اندرونی زندگی کا حصہ بنانے کا شیدائی تھا! اس پرشکوہ کائنات کا حصہ جس کی تجسیم اس کے گرم لہو اور خیالات سے ہوئی تھی!

"تمینا، میں ایک کتاب لکھنا چاہتا ہوں،" ریستوراں میں اس کے مقابل بیٹھے ہوئے اس نے کہا۔ "محبت کے بارے میں کتاب۔ ہاں، ہاں، تمھارے بارے میں، اپنے بارے میں، ہمارے بارے میں، ہمارے نجی ترین جذبوں کے بارے میں۔ ڈائری کے قالب میں، ہمارے دو جسموں کی ڈائریاں۔ ہاں، ہاں، میں تمام پابندیوں کو جھاڑ کر بالکل بے لاگ طور پر یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ میں کیا ہوں اور کیا چاہتا ہوں۔ یہ کتاب سیاسی بھی ہوگی۔ محبت کے بارے میں سیاسی کہانی اور سیاست کے بارے میں محبت کی کہانی...."

تمینا وہیں بیٹھی اسے تکے جاتی ہے۔ اچانک اس کے چہرے کی کیفیت ایگو سے اور برداشت نہیں کی جاتی اور وہ اپنی گفتگو کے تانے بانے کھو بیٹھتا ہے۔ وہ تو اسے اپنے لہو اور خیالات کی کائنات میں اٹھا کر لے جانا چاہتا تھا، اور وہ یہاں اپنی ہی دنیا میں سراسر اور یوں مکملاً محو بیٹھی تھی۔ اس کے الفاظ بہرے کانوں میں پڑنے کی وجہ سے آہستہ آہستہ روانی کھو کر بوجھل ہوتے جا رہے تھے: "...سیاست کے بارے میں محبت کی کہانی۔ بالکل۔ کیونکہ ہمیں جس بات کی ضرورت ہے وہ یہ کہ انسانی پیمانے پر دنیا تخلیق کر سکیں، اپنے پیمانے پر، اپنے جسموں کے پیمانے پر۔ تمھارا جسم، تمینا، اور میرا جسم، بالکل۔ تاکہ آدمی بوس و کنار کا نیا طریقہ دریافت کر سکے، محبت کرنے کا نیا ڈھنگ..."

الفاظ اور زیادہ بوجھل اور بے ڈھب ہوتے جا رہے ہیں، وہ کٹر گوشت کے لوتھڑے کی طرح ہیں۔ ایگو کوشش چھوڑ دیتا ہے۔ تمینا حسین ہے، اور وہ اس سے نفرت کرتا ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس سے ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہے۔ اپنے بے وطن بیوہ کے ماضی کو استعمال کر رہی ہے، اور اپنے جھوٹے گھمنڈ کی فلک بوس عمارت کی بلندی سے نیچے ہر ایک کو حقارت سے دیکھ رہی ہے۔ ایگو رشک کے ساتھ خود اپنی لاٹ کے بارے میں سوچتا ہے، وہ لاٹ جو تمینا کی فلک بوس عمارت کے درمیانی فاصلے کو پاٹنے کے لیے کھڑی کرنا چاہتا ہے، وہ لاٹ جس پر تمینا ذرا سی توجہ دینے کے لیے بھی آمادہ نہیں — وہ لاٹ جو محض ایک مطبوعہ مضمون اور اپنی اور اس کی محبت کے بارے میں ایک مجوزہ کتاب سے مل کر بنی ہے۔

"تم پراگ کب جا رہے ہو؟" تمینا پوچھتی ہے۔

ایگو پر منکشف ہوتا ہے کہ تمینا نے کبھی اس سے محبت نہیں کی اور وہ ایگو کے ساتھ محض اس لیے چلی آئی ہے کہ اسے ایسے شخص کی ضرورت ہے جو اس کے لیے پراگ جا سکے۔ ایگو بدلہ لینے کی ناقابلِ مزاحمت خواہش سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ "میرا خیال تھا کہ اب تک تم خود ہی سب کچھ سمجھ چکی ہوگی۔ تم نے میرا مضمون پڑھا ہے — پڑھا ہے نا؟"

"ہاں پڑھا ہے،" وہ جواب دیتی ہے۔

اسے تمینا پر بالکل یقین نہیں آتا۔ اور اگر بفرضِ محال پڑھ بھی لیا ہے تو یہ طے ہے کہ وہ اس سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوئی ہے۔ ایگو کو محسوس ہوتا ہے کہ اس موقعے پر وہ واحد عظیم جذبہ جو وہ مہیا کر سکتا ہے ہوا ہو گیا ہے (یعنی صرف مطبوعہ مضمون اور تمینا اور اپنی محبت کے بارے میں مجوزہ کتاب پر اٹھی ہوئی لاٹ)، اور وہ اس لاٹ کی بے حرمتی کے خلاف باقاعدہ جنگ لڑنے، تمینا سے اس کے وجود کا اقرار کروا لینے، اور اس کی بلندی سے اسے متحیر کرنے کے لیے آمادہ ہے۔

"اگر پڑھ لیا ہے تو جان گئی ہوگی کہ اس کا موضوعِ بحث 'طاقت' ہے۔ میں نے طاقت کی مشینری کا تجزیہ کیا ہے۔ آج جو کچھ تمھارے ملک میں ہو رہا ہے، میں نے اس کا حوالہ دیا ہے اور میں نے بات چبا چبا کر نہیں کی۔"

"تم سچ مچ یہ سمجھتے ہو کہ پراگ والوں کو تمھارے مضمون کی خبر ہے؟"

اس طنز سے ایگو مجروح ہو جاتا ہے۔ "تم ایک مدت سے ملک کے باہر رہی ہو۔ تمھیں اب یہ یاد نہیں رہا کہ تمھاری پولیس ان معاملات میں کن انتہاؤں تک جا سکتی، کیا کچھ کر سکتی ہے۔ وہاں مضمون کی خاصی پذیرائی ہوئی ہے۔ مجھے اس کے بارے میں وہاں سے بہت سے خطوط بھی آئے ہیں۔ تمھاری پولیس میرے بارے میں سب کچھ جانتی ہے۔ مجھے اس کا پورا یقین ہے۔"

تمینا کوئی جواب نہیں دیتی۔ بس وہاں بیٹھی کچھ اور زیادہ حسین نظر آنے لگتی ہے۔ خدایا! اگر وہ اس کی کائنات کو ذرا بھی پہچان لے — وہ کائنات جس میں وہ اسے اٹھا لے جانے کا آرزومند ہے، جو اس کے گرم لہو اور خیالوں سے مرتب ہوئی ہے — تو وہ ایک کیا،

سو بار بھی پراگ آنے جانے کے لیے تیار ہو جائے گا! اور اچانک اس کا لہجہ بدل جاتا ہے۔ "تمینا،" وہ اداسی سے اسے مخاطب کرتا ہے، "مجھے معلوم ہے کہ تم میرے پراگ نہ جانے سے ناخوش ہو۔ پہلے میرا خیال تھا کہ اس مضمون کی اشاعت کو کچھ اور مدت کے لیے ملتوی کر دوں۔ لیکن پھر خیال آیا کہ مجھے ان محسوسات کو صرف اپنی ذات تک محدود رکھنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا — سمجھیں؟"

ایگو کو خوب معلوم ہے کہ اس کی ہر بات نہایت مضحکہ خیز ہے اور اسے وہاں لے جاسکتی ہے جہاں جانے کی اسے ذرا خواہش نہیں۔ لیکن اب وہ مورچہ چھوڑ کر پیچھے بھی تو نہیں ہٹ سکتا۔ اس خیال سے وہ پاگل پن کی حد تک مایوس ہوا جا رہا ہے۔ اس کے چہرے پر بڑے بڑے سرخ دھبے پت کی طرح نکل آئے ہیں، اور اس کی آواز بانس کی طرح پھٹنے لگی ہے۔ "تو تم نہیں سمجھیں؟ اچھا لو، میں سمجھائے دیتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ یہاں بھی چیزوں کا وہی حشر ہو جو وہاں ہوا ہے! اگر ہر فرد و بشر ان معاملات کو یوں ہی تھوڑی دیر کے لیے التوا میں ڈالتا گیا تو ہم پلک جھپکتے میں یہاں بھی غلام بن چکے ہوں گے۔"

کراہت کی ایک شدید لہر اٹھی اور تمینا کو مغلوب کر گئی۔ وہ کرسی سے کود کر اتری اور عورتوں کے غسل خانے کی طرف بھاگی۔ اس کی آنتیں ابل کر اس کے حلق میں چلی آ رہی تھیں۔ وہ ٹوائلیٹ کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئی اور قے کر دی۔ اس کا پورا جسم یوں تڑپ اور لرز رہا تھا گویا سسکیاں بھر رہی ہو۔ اس کی آنکھوں کے آگے اس لونڈے کے خصیوں، ذکر، اور زیرِ ناف کے بالوں کی تصویر تھی۔ وہ اس کے منہ سے نکلتی ہوئی سانسوں کی کھٹی بساند سونگھ سکتی تھی، اور اپنے کولھوں پر اس کی رانوں کے دباؤ کو محسوس کر سکتی تھی۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ اب اسے مطلق یاد نہیں رہا کہ اس کے شوہر کے اعضائے تولیدی کی کیا شکل و صورت تھی — دوسرے لفظوں میں، کراہت کی یاد شفقت اور ملائمت کی یاد سے کہیں زیادہ طاقتور ثابت ہو رہی تھی (خدایا، ہاں، کراہت کی یاد شفقت اور ملائمت کی یاد سے کہیں زیادہ طاقتور ہے)— اور وہ دن دور نہیں جب اس کے حافظے میں صرف یہ لڑکا اور اس کے منہ سے اٹھنے والی بدبو کے بھبھاکے ہی رہ جائیں گے۔ اور اس نے پھر قے کر دی۔ شاخِ بید کی طرح لرزی، تڑپی، اور ایک اور قے کر دی۔

جب وہ غسل خانے سے برآمد ہوئی تو اس کے منہ پر (جو ہنوز اس کھٹی بو سے لبریز تھا) ہمیشہ کے لیے خاموشی کی مہر ثبت ہو چکی تھی۔ ایگو مضطرب و خجل تھا۔ چاہتا تھا کہ ساتھ چل کر اسے گھر تک چھوڑ آئے، لیکن وہ ایک لفظ بولنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس کے ہونٹ سِل چکے تھے (جس طرح خواب میں ہوا تھا، جب اس کے منہ میں طلائی انگشتری تھی)۔

جب وہ اس سے بولا تو اس کا تنہا ردِ عمل یہ تھا کہ اور زیادہ تیز چلنے لگی۔ جلد ہی اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ رہ گیا، اور کچھ دیر تک وہ اس کے ساتھ خاموش خاموش چلتا گیا۔ بالآخر وہ ایک جگہ رک کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سیدھی آگے چلتی گئی، بغیر اِدھر یا اُدھر دیکھے ہوئے۔

وہ اپنی مدتِ عمر گاہکوں کو کافی پیش کرتی رہی اور بھول کر بھی دوبارہ چیکوسلوواکیہ فون نہ کیا۔

پانچواں حصہ

لتوست

کِرستینا کون ہے؟

کرستینا ایک عورت ہے جس کی عمر تیس کی دہائی میں ہوگی۔ اس کا ایک بچہ ہے، اور شوہر قصائی ہے جس کے ساتھ وہ مکمل ہم آہنگی کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے، اور مقامی مستری کے ساتھ معاشقہ بھی چل رہا ہے جس میں وقتاً فوقتاً گرمی آجاتی ہے، اور کام ختم کر لینے کے بعد وہ کبھی کبھار اس کے ساتھ گراج کی تنگ سی جگہ میں جفتی کر لیتا ہے۔ چھوٹے شہروں کی فضا خاص طور پر شادی کے باہر جنسی تعلقات کے لیے سازگار نہیں ہوتی، یا، بلکہ، اس کے لیے بڑی غیر معمولی طبّاعی اور حوصلہ چاہتی ہے، اور یہ وہ اوصاف ہیں جو قدرت نے کرستینا کو وافر مقدار میں نہیں بخشے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ وہ طالبِ علم سے ملاقاتوں پر اس بری طرح سٹپٹا گئی تھی۔ وہ ماں کے ساتھ وہاں شہر میں گرمیوں کی چھٹیاں منانے آیا تھا، اور قصائی کی دکان کے کاؤنٹر کے پیچھے دو بار اسے گھورنے کے بعد وہ مقامی تیرنے کے مقام پر جا کر اس سے بولا بالا تھا، اور اپنی کم آمیزی میں اتنا پُرکشش تھا کہ کرستینا خود کو روک نہیں سکی۔ شادی کے بعد (جسے اچھے خاصے دس سال ہو رہے تھے) جب پہلی بار اس نے کسی غیر آدمی کو چھونے کی جراُت کی تھی، تو یہ ایک مقفل گیراج کی سلامتی میں انجر پنجر ڈھیلے کی ہوئی کاروں اور گھسے ہوئے ٹائروں کے درمیان ہوا تھا، اور اب اچانک اس نے کھلے میں ملاقات کو قبول کر کے خود کو تاک جھانک کرنے والی نگاہوں کی زد میں آنے کا خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اگرچہ وہ مٹرگشت کے لیے جن مقامات کا انتخاب کرتے وہ خاصے دور افتادہ ہوتے اور ان کے پہچان لیے جانے کا احتمال قریب قریب ناپید تھا، تاہم کرستینا کا دل زور زور سے دھڑ دھڑاتا اور ایک گدگداتا ہوا خوف اسے کھا جاتا۔ وہ جتنی بہادری سے خوف کا سامنا کرتی، اسی تناسب سے طالبِ علم کے

ساتھ لیے دیے رہتی۔ وہ اس تک بہت زیادہ دور نہ جا سکا ۔ بس یہی چند عاجلانہ ہم آغوشیاں اور نرم و گداز بوسے۔ وہ کسمسا کر اس کی گرفت سے نکل جاتی اور اگر وہ اس کے جسم کے سہارے سہارے ہاتھ دوڑاتا تو مضبوطی سے ٹانگیں بھینچ لیتی۔

یہ بات نہیں تھی کہ اسے اُس کی خواہش نہیں تھی؛ بس معاملہ کچھ یوں تھا کہ وہ اس کی کم آمیزی پر فریفتہ ہو گئی تھی اور اپنے لیے اس کا تحفظ کرنا چاہتی تھی۔ کسی مرد نے کبھی اس سے اپنے فلسفۂ حیات کی تشریح کی تھی اور نہ عظیم شاعروں اور مفکروں کے نام گنوائے تھے۔ طالب علم، بے چارہ لڑکا، اس کے پاس بات کرنے کے لیے اس کے علاوہ اور کچھ تھا ہی نہیں۔ اس کی باعثِ ترغیب بک بک کا دائرہ اتنا محدود تھا کہ وہ ان میں مختلف سماجی درجوں کی عورتوں کے حساب سے مناسب ردو بدل کرنے سے عاجز تھا۔ اس کے علاوہ، اس معاملے میں وہ خود کو اتنا لاچار بھی نہیں محسوس کرتا تھا، کیونکہ فلسفیوں کے اقوال کا اثر ایک طالب علم ساتھی کے مقابلے میں ایک قصائی کی جورو پر زیادہ شدید ہو سکتا تھا۔ وہ جس بات کو نظر انداز کر گیا وہ یہ تھی کہ جہاں ایک برمحل قول اس عورت کی روح کو رجھا سکتا تھا، وہاں اس کے اور عورت کے جسم کے درمیان ایک فصیل بھی کھڑی کر سکتا تھا۔ عورت کو یہ خوف دامن گیر تھا کہ اگر اس نے اپنا جسم طالبِ علم کے سپرد کر دیا تو وہ ان کے باہمی تعلق کو بھی قصائی یا مستری سے اپنے تعلق کی سطح پر گھسیٹ لائے گی اور پھر اسے شوپن ہاور (Schopenhauer) کا کوئی اور کلمہ کبھی سننے کو نہ ملے گا۔

طالب علم کے ساتھ اسے ایسی حیا محسوس ہوتی جس سے وہ پہلے کبھی واقف نہ رہی تھی؛ جہاں تک قصائی اور مستری کا معاملہ تھا، تو وہ ان سے جو من میں آتا کہہ سکتی تھی اور اس پر ہنس بھی سکتی تھی۔ مثال کے طور پر، انھیں جفتی کے وقت کمالِ احتیاط سے کام لینا چاہیے، کیونکہ جس ڈاکٹر نے اس کا بچہ جنوایا تھا صاف کہہ دیا تھا کہ اب اور نہ ہوں کہ یہ اس کی صحت کے لیے مضر بلکہ ہلاکت خیز ہو سکتا ہے۔ اس بات کو زمانہ بیت چکا تھا، جب حمل گروانے کی سخت ممانعت تھی اور عورتوں کی مانعِ حمل تدابیر تک رسائی نہیں تھی۔ قصائی اور مستری کو اس کے خدشات کو سمجھنے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی تھی، اور دخول سے پہلے وہ بڑے کھلنڈرانہ نمائشی انداز میں اطمینان کر لینے کے لیے انھیں ٹٹولتی کہ کیا ضروری تدابیر کا اہتمام کر لیا گیا ہے۔ لیکن

جب وہ یہی سب اپنے فرشتے کے ساتھ کرنے کا خیال کرتی، وہ فرشتہ جو بادل سے، جہاں وہ شوپن ہاور سے بے تکلفانہ گھال میل کرتا تھا، زمین پر اترا ہے، تو بالکل منجمد ہوکر رہ جاتی۔ چنانچہ میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ اس کے لیے دبے پن کی دو وجوہ تھیں: کہ جتنی دیر تک ہو سکے اپنے فرشتے کو گدازگی اور شرمیلے پن کی طلسماتی اقلیم میں ہی رہنے دے، اور جتنی دیر تک ممکن ہو سکے ان لگی بندھی ہدایات اور تفاصیل کو دہرا کر جو اس کی جسمانی محبت کے تصور کا تقاضا تھیں اسے برگشتہ کرنے سے باز رہے۔

اپنے نفیس فقروں کے باوجود، طالب علم بھی تُلا بیٹھا تھا۔ عورت رانیں چاہے جتنی سختی سے کیوں نہ بھینچے رکھتی، لڑکے کی گرفت اس کی پچھاڑی پر ڈھیلی نہ پڑتی، ایسی گرفت جو درپردہ اس کی غماز تھی کہ شوپن ہاور کے اقوال دہرانے والا شخص ضروری نہیں کہ جس جسم کا خواہش مند ہو اس سے دستبردار ہونے کو بھی تیار ہو۔

جب اس کی چھٹیاں ختم ہونے کو آئیں، عاشقین کو محسوس ہوا کہ پورے ایک سال کی جدائی برداشت کرنا ان کے لیے بے حد کٹھن ہوگا۔ بس ایک ہی امکان تھا کہ کرستینا پراگ جانے کے لیے کوئی بہانہ تلاش کرے۔ دونوں کو خوب معلوم تھا کہ اس قسم کے سفر کا کیا مطلب نکلے گا۔ طالبِ علم اٹاری کے ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتا تھا، اور عورت کو سوائے وہاں رات گزارنے کے چارہ نہ ہوگا۔

'لِتوست' کیا ہے؟

'لتوست' (litost) چیک زبان کا لفظ ہے جس کا کسی دوسری زبان میں صحیح صحیح ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ یہ ایسے احساس کی ترجمانی کرتا ہے جو کسی کھلے ہوئے ایکورڈین کی طرح لامنتہا ہوتا ہے، ایک احساس جو بہت سے دوسرے احساسات کا امتزاج ہوتا ہے: غم، ہمدردی، پچھتاوا، اور ناقابلِ بیان آرزو۔ اس کا پہلا رکن، جو طویل اور مؤکّد ہے، کسی دھتکارے ہوئے کتے کی بین جیسی آواز دیتا ہے۔

بعض حالات میں اس کے معنی بڑے محدود ہوجاتے ہیں، اتنے ہی قطعی، دوٹوک، اور تیز جتنی خوب سان رکھی ہوئی کوئی کاٹ دار باڑھ۔ لفظ کے اس مفہوم کا مترادف بھی مجھے کبھی

کسی زبان میں نہیں مل سکا ہے، اگر چہ یہ بات میری سمجھ سے باہر ہے کہ اس کے بغیر کوئی انسانی روح کو کیسے سمجھ سکتا ہے۔

مجھے ایک مثال دینے کی اجازت دیں۔ ایک دن طالب علم اپنی دوست کے ساتھ تیرنے گیا۔ لڑکی درجہ اول کی کسرتی کھلاڑی تھی؛ اور طالب علم بمشکل ہی تیرنے پر قادر۔ اسے پانی کے نیچے سانس روکے رکھنے میں دقت ہو رہی تھی۔ وہ آگے بڑھنے کے لیے بری طرح ہاتھ پانو مارنے اور سطحِ آب پر سر آگے پیچھے جھٹکنے لگا۔ لڑکی اس کی متوالی تھی، چنانچہ بڑی ہوشیاری کے ساتھ اسی کی رفتار سے تیرتی رہی۔ لیکن جب ان کی تیراکی اپنے ختم کو پہنچ رہی تھی، لڑکی کو اپنی کھیل کود کی جبلتوں کو آزادانہ چھوڑنے کی بڑی سخت خواہش محسوس ہوئی، اور وہ زناتی ہوئی دوسرے کنارے پر پہنچ گئی۔ لڑکے نے بھی رفتار تیز کرنے کی کوشش کی، لیکن بہت سا پانی نگل گیا۔ اسے سبکی محسوس ہوئی، اس کی کمزوری کھل کر سامنے آ گئی تھی؛ اس نے وہ برہمی، وہ خاص الخاص رنجیدگی محسوس کی جسے صرف 'لتوست' کے نام ہی سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ اسے اپنا مریضانہ بچپن یاد آیا — نہ کوئی ورزش، نہ سنگی ساتھی، کچھ بھی تو نہیں سوائے ماما کی ہمیشہ اس پر ثبت چشمِ نگراں — اور وہ مطلق، ہمہ گیر مایوسی میں ڈوب گیا۔ شہر لوٹتے ہوئے انھوں نے کھیتوں سے ہو کر جانے والا نسبتاً مختصر راستہ اختیار کیا۔ وہ ایک لفظ بھی نہ بولا۔ وہ مجروح تھا، اور افسردہ؛ اس کا جی شدت سے چاہا کہ لڑکی کو دُھن کر رکھ دے۔ "تمھیں کیا ہو گیا ہے؟" لڑکی نے پوچھا، اور اس نے لڑکی پر ملامت کی بوچھاڑ کر دی کہ دریا کے پرلے کنارے پر سطحِ آب کے نیچے پانی کا دھارا کتنا خطرناک ہے اور اس نے اسے اس طرف تیر کر جانے سے منع کیا تھا کیونکہ وہ ڈوب سکتی ہے — پھر اس نے لڑکی کے منہ پر طمانچہ جڑ دیا۔ لڑکی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، اور جب لڑکے نے اس کے چہرے پر بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھا تو اس پر رحم آ گیا اور اس کے گرد بانہیں ڈال دیں، اور اس کا 'لتوست' زائل ہو گیا۔

یا چلیے طالب علم کے بچپن سے ایک مثال لیں: وائلن کے سبق جو اس پر زبردستی مسلّط کیے گئے تھے۔ وائلن بجانے کی اس میں کوئی خاص وہبی صلاحیت نہیں تھی، اور اس کا استاد بار بار اسے روک کر بڑی سرد سی ناقابلِ برداشت آواز میں غلطیوں کی نشان دہی کرتا۔ یہ بات اسے خفیف کرتی، اور اس کا دل رونے کو چاہتا۔ لیکن اس کے بجائے کہ وائلن سُر میں بجائے

اور کمتر غلطیاں کرے، وہ جان بوجھ کر غلطیاں کرنے لگتا۔ جوں جوں استاد کی آواز اور زیادہ ناقابلِ برداشت ہوجاتی، وہ طیش میں آ کر اور زیادہ تلخی میں ڈوب جاتا، اپنے 'لتوست' میں۔

اچھا تو پھر 'لتوست' کیا ہے؟

'لتوست' اذیت کی وہ کیفیت ہے جو آدمی میں اپنی نانجار ذات کے بارے میں کسی فوری بصیرت سے پیدا ہوتی ہے۔

ذاتی کلفت ونکبت کا ایک عمومی علاج محبت ہے۔ جسے بھرپور محبت حاصل ہو کلفت اس کے پاس ذرا نہیں پھٹک سکتی۔ اس کی ساری کوتاہیاں محبت کی جادوئی نظر سے رفع ہوجاتی ہیں، اور لشٗم پشٗم ہاتھ پانو مارنا اور پانی کے اوپر سر کو آگے پیچھے جھٹکنا بھی بڑے دل موہنے معلوم ہونے لگتے ہیں۔

محبت کا یہ مطلق وصف اصل میں مطلق مماثلت کا نام ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جس عورت سے محبت کرتے ہیں اتنی ہی ست رفتاری سے تیرے جس سے ہم تیرتے ہیں؛ ہم چاہتے ہیں کہ اس کا کوئی ماضی نہ ہو جس کی طرف مڑ کر مسرت سے دیکھ سکے۔ لیکن جوں ہی مطلق مماثلت کا یہ فریب نظر زائل ہوجاتا ہے (لڑکی مسرت سے پیچھے مڑ کر اپنے ماضی کو دیکھتی ہے یا رفتار تیز کردیتی ہے)، محبت اس عظیم اذیت کے دائمی سرچشمے میں بدل جاتی جسے ہم 'لتوست' کہتے ہیں ہے۔

کوئی فرد جسے خلقت کی عام ناتمامی اور ادھورے پن کا تجربہ ہے وہ اس کی زیادتیوں سے خاصی اچھی طرح مامون ہوتا ہے۔ وہ اپنی نانجار ذات سے متعلق بصیرتوں کو معمولی اور غیر دلچسپ سمجھ کر قبول کرلیتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، 'لتوست' عدم بلوغیت کی خاصیت ہے۔ یہ جوانی کی زینتوں میں سے ہے۔

'لتوست' کی عمل پذیری ایک دوضربی موٹر کی طرح ہوتی ہے۔ پہلے اذیت کا احساس آتا ہے، پھر انتقام کی خواہش۔ انتقام کا مدعا اپنے ساتھی کو بھی اتنا ہی کلفت زدہ کردینا ہوتا ہے جتنا آدمی خود کو محسوس کرتا ہے۔ آدمی تیرنے سے قاصر ہے، لیکن عورت چانٹا کھا کر رو دیتی ہے۔ اس سے دونوں کی برابری قائم ہوجاتی ہے اور ان کی محبت زندہ رہتی ہے۔

چونکہ انتقام کبھی اپنے حقیقی محرک کو منکشف نہیں کرسکتا (طالب علم لڑکی سے یہ نہیں کہہ

سکتا کہ اس نے اسے چانٹا یوں مارا ہے کہ وہ بہت تیز تیر رہی تھی)، اس کے لیے جھوٹے محرک کو پیش کرنا ضروری ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، پرجوش ریاکاری کے بغیر 'لتوست' کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا: نوجوان اعلان کرتا ہے کہ لڑکی کے ڈوب جانے کے خیال پر وہ سخت بدحواس ہوگیا تھا، اور بچہ بڑی اذیت ناکی سے بے سُرا بجانے لگتا ہے، اور صلاحیت کے مایوس کن فقدان کا ڈھونگ رچاتا ہے۔

میں شروع میں اس باب کو "طالبِ علم کون ہے؟" کا عنوان دینا چاہتا تھا۔ اس کے باوجود کہ یہ اب اس احساس سے سروکار رکھتا ہے جسے میں 'لتوست' کہتا ہوں، یہ پھر بھی بہت کچھ طالبِ علم کے بارے میں ہی ہے۔ اصل میں، طالبِ علم 'لتوست' کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس میں تعجب کیسا کہ وہ لڑکی جس سے اسے محبت تھی آخرالامر اسے چھوڑ بیٹھی۔ یہ ایسی کوئی خاص خوشگوار بات نہیں ہے کہ آپ صرف اس بات پر طمانچہ کھائیں کہ آپ کو تیرنا آتا ہے۔

اس کی زندگی میں اپنے آبائی شہر کے قصائی کی بیوی ضخیم مرہم پٹی کی شکل میں داخل ہوئی جو خاص اس کے زخم کے لیے پہلے سے تیار کی گئی تھی۔ وہ اسے سراہتی تھی، اس کی پرستش کرتی تھی۔ جب وہ اس سے شوپن ہاور کا ذکر کرتا، وہ کبھی اعتراض اٹھا کر اپنی خودمختار شخصیت کا احساس نہ دلاتی (جس طرح شرمناک یاد کی وہ لڑکی دلاتی تھی)؛ اور جب وہ اسے دیکھتی تو اس کے جذبات کا لڑکے پر اتنا اثر ہوتا تھا کہ اسے اس کی آنکھوں میں آنسو امڈتے ہوئے نظر آتے۔ ہمیں یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اپنی زنانہ دوست سے قطع تعلق کے مابعد اس نے جفتی نہیں کی تھی۔

والتیئر کون ہے؟

والتیئر یونیورسٹی کا لیکچرر ہے، بزلہ سنج اور جراحت پہنچانے والا نوجوان جو بڑی کینہ پرور نگاہوں سے اپنے مخالفوں کو گھورتا ہے ۔ جو اس کے چڑانے کے نام کی بہت کافی وجہ ہے۔

وہ طالبِ علم کو پسند کرتا تھا، اور اسے کوئی ادنیٰ امتیاز نہیں کہا جاسکتا؛ وہ اپنے رفقا کے انتخاب کے معاملے میں خاص خیال رکھتا تھا۔ ایک دن، سیمینار کے ختم پر، وہ لڑکے کے پاس

آیا اور پوچھا کہ کیا اگلی شام فارغ ہے۔ بہت برا ہوا، ٹھیک اسی وقت کرستینا آ رہی تھی۔ لڑکے کو والتیئر سے یہ کہنے میں اپنے پوری ہمت مجتمع کرنی پڑ گئی کہ اس وقت وہ مصروف ہوگا۔ لیکن والتیئر بھلا یہ کب سننے کے لیے تیار تھا۔ "تم جو کچھ کر رہے ہو اسے ملتوی نہیں کر سکتے؟ تمھیں بالکل افسوس نہ ہوگا۔" بظاہر ملک کے بہترین شاعر 'رائٹرز کلب' میں جمع ہونے والے تھے، اور والتیئر، جو خود بھی وہاں جانے والا تھا، چاہتا تھا کہ طالب علم ان سے آ کر ملے۔

اور ہاں، وہ عظیم شاعر جس پر والتیئر ایک مستقل مقالہ لکھ رہا تھا، وہی جس سے وہ بار بار ملنے جایا کرتا تھا — وہ بھی وہاں موجود ہوگا۔ یہ شاعر علیل تھا اور بیساکھیوں کے سہارے چلتا تھا، اسی وجہ سے وہ بمشکل ہی کبھی سوسائیٹی میں دکھائی دیتا تھا اور اسی لیے اس سے ملاقات کا یہ موقعہ اور بھی بالا قدر تھا۔

طالب علم شرکت کرنے والے سبھی شاعروں کے کام سے واقف تھا، اور اس عظیم شاعر کے تو صفحے کے صفحے ازبر کیے ہوئے تھے۔ ان کی رفاقت میں ایک شام گزارنے سے زیادہ اور کیا چیز اس کے لیے مسرت بخش ہو سکتی تھی۔ لیکن پھر اسے خیال آیا کہ وہ مہینوں سے کسی عورت کے ساتھ نہیں سویا ہے، اور والتیئر سے مکرراً معذرت کی۔

والتیئر نے یہ ماننے سے انکار کر دیا کہ کوئی چیز عظیم ہستیوں سے ملاقات کرنے کے مقابلے میں زیادہ اہم ہو سکتی ہو۔ ایک عورت؟ کیا اسے ملتوی نہیں کیا جا سکتا؟ اس کی عینک کے عدسے طنز کی چنگاریوں سے چمکنے لگے۔ لیکن طالب علم کو تو بس قصائی کی بیوی اُس پورے ماہ گرفت سے نکلتی ہوئی ہی نظر آ رہی تھی، اور اگرچہ یہ بہت مشکل تھا، اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ اس وقت اس کے لیے کرستینا کی بالکل اتنی ہی اہمیت تھی جتنی اپنے ملک کی ساری شاعری کی۔

سمجھوتا؟

وہ صبح کے وقت پہنچی۔ دن کے وقت اس نے اس کام کا پھیرا لگایا جو اس کی براءت کی ضمانت فراہم کرنے والا تھا۔ طالب علم نے اس سے شام کو ریستوراں میں ملنے کا طے کیا تھا اور ریستوراں کا انتخاب خود کیا تھا۔ جب وہ داخل ہوا، تو یہ دیکھ کر سٹپٹا گیا کہ مرکزی کمرا نشے

میں دھت لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ اس کی چھوٹے سے شہر والی پریوں کی شہزادی جس سے چھٹیوں کے دوران ملاقات ہوئی تھی غسل خانوں کے برابر کونے میں اس میز کے پاس بیٹھی ہوئی تھی جو جھوٹی پلیٹوں وغیرہ کو رکھنے کے لیے مخصوص تھی۔ وہ اپنا اتوار کا بہترین لیکن انگھڑ لباس پہنے ہوئے تھی، اور کسی ٹکسالی صوبائی خاتون جیسی نظر آ رہی تھی جو بڑی طویل غیر حاضری کے بعد دارالحکومت آئی ہو اور اس کی مسرتوں سے فیضیاب ہونے کی متمنی ہو۔ وہ ہیٹ پہنے ہوئے تھی، بڑے بڑے منکوں والا ہار، اور سیاہ، اونچی ایڑی والے پمپ جوتے۔

طالبِ علم کو اپنے گال سلگتے محسوس ہوئے — مایوسی سے، جوش سے نہیں۔ چھوٹے سے شہر کے پس منظر میں، جس کے باسی قصائی، مستری، اور ملازمت سے سبک دوش وظیفہ خوار تھے، کرستینا اتنی ممتاز نظر آتی تھی جتنی دیدہ زیب طلبہ اور آرائشِ گیسو کرنے والوں کے پراگ میں کبھی نہیں نظر آ سکتی تھی۔ اپنے مضحکہ خیز ہار اور (منہ کے بالائی بائیں گوشے میں) بہت زیادہ نہ کھٹکنے والے سونے کے دانت کے ساتھ وہ جوانی سے تروتازہ جینز میں ملبوس اس حسینہ کی بالکل ضد نظر آ رہی تھی جو پچھلے کئی ماہ سے اسے نہایت بے رحمی کے ساتھ مسلسل ٹھکرائے جا رہی تھی۔ وہ بڑی بے اعتمادی سے جھجکتے ہوئے اس کی میز کی طرف بڑھنے لگا، اپنے اضمحلال، اپنے 'لتوست' کو گلے لگائے۔

اگر طالبِ علم مایوسی کا شکار ہوا تھا، تو کرستینا بھی ہوئی تھی۔ جس ریستوراں میں اس نے اسے دعوت دی تھی، اس کا بھلا سا نام تھا — 'کنگ وین شسلوس' — اور کرستینا نے، جو پراگ میں اجنبی تھی، فرض کر لیا تھا کہ یہ کوئی اعلیٰ درجے کی جگہ ہوگی جہاں وہ اس کی پرتکلف شرابوں اور کھانوں سے تواضع کرے گا، اور یہ ان کے پراگ کے شبانہ بگولا صفت سیر تماشے کا پہلا پڑاؤ ہی ہوگا۔ جب اس نے دیکھا کہ 'کنگ وین شسلوس' کی وہی اوقات تھی جو اس جگہ کی تھی جہاں مستری بیئر پینے جایا کرتا تھا اور یہ کہ اسے کونے میں غسل خانوں کے پاس بیٹھ کر طالبِ علم کا انتظار کرنا ہوگا، تو اسے جو محسوس ہوا وہ، وہ نازک اور ناقابلِ بیان جذبہ نہیں تھا جسے میں نے 'لتوست' کا نام دیا ہے، بلکہ روزمرہ کی عام سی برافروختگی۔ جس سے میری مراد یہ ہے کہ کلفت اور سبک سری محسوس کرنے کے بجائے اسے یہ محسوس ہوا کہ طالبِ علم آدابِ شائستگی سے نابلد ہے۔ اور نہ یہ جتانے میں اس نے بہت زیادہ وقت ضائع کیا۔ اس کا چہرہ طیش کھایا ہوا تھا، اور

اس نے اس کے لیے بھی وہی لب ولہجہ اختیار کیا جس میں اپنے قصائی سے پیش آتی تھی۔

سو وہ وہاں کھڑے ہوئے تھے، آمنے سامنے، عورت اپنی مذمت میں بلند بانگ اور بیش از بیش رواں، لڑکا اپنی مدافعت میں کمزور۔ لڑکے میں عورت سے نفرت بڑی شدت کے ساتھ بھڑک اٹھی۔ وہ بس یہی چاہتا تھا کہ سیدھا اسے اپنے کمرے لے جائے، اسے ہر نگاہ سے پوشیدہ کردے، اور آزما کر دیکھے کہ کیا ان کی جائے فرار کی قربت اس کھوئے ہوئے جادو کو دوبارہ جگا سکتی ہے۔ عورت نے انکار کردیا۔ وہ کون سا روز روز پراگ آتی تھی۔ وہ یہاں چیزیں دیکھنا چاہتی تھی، مقامات کی سیر کرنا چاہتی تھی، اچھا اور خوشگوار وقت گزارنا چاہتی تھی۔ وہ سیاہ ایڑیاں اور ہار کے وہ رنگین دانے اپنے حقوق پر اڑے رہے۔

"عام طور پر یہ بڑی اچھی جگہ ہے،" طالب علم نے کہا۔ "تمام نفیس لوگ یہاں آتے ہیں۔" وہ قصائی کی جورو کو یہ جتانا چاہتا تھا کہ وہ بھلا کیا سمجھ سکتی ہے کہ پراگ میں کس چیز کی اہمیت ہے اور کس چیز کی نہیں۔ "بدقسمتی سے، آج یہاں تل دھرنے کی جگہ نہیں، تمھیں کہیں اور لے جانا ہوگا۔" لیکن ہر دوسری جگہ پر بھی اتنی ہی بھیڑ بھاڑ لگی ہوئی تھی، ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے میں انھیں کافی وقت لگا، اور کرستینا اپنے ہیٹ اور ہار اور چمک دار سونے کے دانت میں ناقابلِ برداشت طور پر مضحکہ خیز نظر آتی رہی۔ نوجوان عورتوں سے پٹی سڑکوں پر چلتے ہوئے لڑکے کو احساس ہوا کہ وہ کرستینا کے ساتھ شام گزارنے کی خاطر اپنے ملک کے عظما کے ساتھ شام نہ گزارنے پر کبھی خود کو معاف نہیں کرسکے گا۔ دوسری جانب، وہ اسے اپنا دشمن بھی نہیں بنانا چاہتا تھا؛ جیسا کہ میں نے بتایا، اس نے بڑے زمانے سے مباشرت نہیں کی تھی۔ اس عقدے کا واحد حل یہی تھا کہ کوئی کارگر سمجھوتا ڈھونڈ نکالے۔

بالآخر انھیں ایک راستے سے ہٹے ہوئے کیفے میں ایک خالی میز مل ہی گئی۔ طالب علم نے کھانے سے پہلے کے دو عدد اشتہا آور مشروب کا آرڈر دیا اور بڑے ماتمی انداز میں کرستینا کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ یہاں پراگ میں زندگی غیر متوقع واقعات سے بھری ہوئی تھی، اس نے عورت کو بتایا۔ اب یہی کہ گذشتہ کل، مثال کے طور پر، اسے ملک کے سب سے زیادہ نامور شاعر کا فون ملا تھا۔

جب اس نے شاعر کا نام لیا تو کرستینا کچھ اکڑ سی گئی۔ ظاہر ہے اس نے اسکول میں علم

اس شاعر کا کلام منہ زبانی یاد کیا تھا، اور جن لوگوں کو ہم اسکول کے زمانے میں حفظ کرتے ہیں، عجیب سی موہومیت، عجیب سی غیر مادیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اُس وقت بھی جب یہ زندہ ہوتے ہیں، ان کی جگہ بلند مرتبت جاودانوں کے تصویر محل میں ہوتی ہے۔ کرستینا کو یقین ہی نہیں آیا کہ طالب علم فی الواقع اُس شاعر سے بذاتہٖ واقف تھا۔

بالکل تھا، طالب علم نے ڈنکے کی چوٹ پر کہا۔ اور تو اور وہ اپنی سند کا مقالہ بھی اسی پر لکھ رہا تھا، ایک مونوگراف جس کے شائع ہونے کا اچھا خاصا امکان تھا۔ اگر اس نے پہلے اس کا اس سے ذکر نہیں کیا تھا تو اس کی تنہا وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی نمائش نہیں کرنا چاہتا تھا، لیکن اب چونکہ شاعر نے غیر متوقع طور پر ان کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کر دی تھی، مجبوراً کرنا پڑ رہا ہے۔ اس شام 'رائٹرز کلب' میں ایک نجی محفل میں شاعر جمع ہو رہے ہیں اور صرف چند مخصوص نقاد اور قریبی لوگ ہی مدعو کیے گئے ہیں۔ یہ ایک بے حد اہم اجتماع تھا۔ بحثا بحثی یقینی تھی، خوب چنگاریاں اڑنے والی تھیں! لیکن ظاہر ہے وہ شرکت کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ وہ تو اُس سے ملاقات کا منتظر تھا!

میرے عزیز، عجیب ملک میں عورتوں کے دل اب بھی شاعروں پر ریجھتے ہیں، اور کرستینا کو طالب علم سے پہلے سے بھی زیادہ رغبت محسوس ہوئی۔ اسے نصیحت کرنے کی مادرانہ خواہش بھی محسوس ہوئی اور اس کے مشاغل کی نگہبانی کی بھی۔ قابلِ تحسین اور غیر متوقع سادہ لوحی کے ساتھ اس نے اعلان کیا کہ اگر وہ اس محفل میں جس میں شاعر آنے والا تھا شریک نہ ہوا تو یہ بڑے افسوس کی بات ہوگی۔

طالب علم نے کہا کہ اس نے انھیں اس پر راضی کرنے کی کوشش کی تھی کہ اُسے بھی ساتھ آنے دیں کیونکہ اسے معلوم تھا کہ وہ عظیم شاعر اور اس کے دوستوں سے مل کر لطف اندوز ہوگی، لیکن بدقسمتی سے یہ ممکن نہ ہوا۔ خود عظیم شاعر بھی اپنی بیوی کو نہیں لا رہا تھا۔ محفل بالکلیہ ماہرین کے لیے ہی تھی۔ شروع میں طالب علم کا واقعی وہاں جانے کا خیال نہیں تھا، لیکن اب محسوس ہوتا ہے کہ کرستینا ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔ وہ لڑکے کے اپارٹ مینٹ میں اس کا انتظار کر سکتی ہے، اور جب وہ لوٹے گا، تو بس وہ دونوں ہی ہوں گے۔

تھیٹروں اور نائٹ کلبوں کے لبھاوے کو پیچھے چھوڑ کر کرستینا طالبِ علم کے اٹاری

والے اپارٹ مینٹ آئی۔ کچھ دیر تک اسے وہی مایوسی محسوس ہوئی جو 'کنگ وین سشلوس' میں قدم رکھتے ہی محسوس ہوئی تھی۔ اسے اپارٹ مینٹ کہلانے کا کوئی حق نہیں تھا؛ اس میں تو سرے سے داخلے کی راہداری بھی نہیں تھی۔ یہ تو ایک ڈربے سے زیادہ مشابہ تھا جس میں ایک صوفہ اور ڈیسک پڑی تھی۔ لیکن اب اس کا اپنی قوتِ فیصلہ پر سے اعتماد اٹھ گیا تھا؛ وہ ایسی دنیا میں داخل ہوگئی تھی جس کی اقدار کا پیمانہ بڑا پراسرار تھا اور اس کی فہم سے بالا۔ سو اس نے جلد ہی اس گندے سندے اور بے راحت کمرے سے سمجھوتا کرلیا اور اپنی ساری نسوانی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر وہاں آرام محسوس کرنے کی کوشش کی۔ لڑکے نے اس سے اپنا ہیٹ اتار دینے کو کہا۔ اسے چوما، صوفے پر بٹھایا، اور اپنی واجبی سی لائبریری دکھائی کہ اس کی غیر حاضری میں پڑھنے پڑھانے کے لیے کچھ مل جائے۔

یکایک عورت کو خیال آیا۔ "تمھارے پاس اس کی کوئی کتاب وتاب تو ہوگی؟" اس کا اشارہ عظیم شاعر کی طرف تھا۔

ہاں، طالبِ علم کے پاس اس کی ایک کتاب تھی۔

"مجھے نہ دے دوگے؟" اس نے بڑی ہچکچاہٹ کے ساتھ کہا، "اس سے کہنا کہ میرے لیے اس پر کچھ لکھ دے۔"

طالبِ علم کا چہرہ کھل اٹھا۔ عظیم شاعر کا انتساب تھیٹر اور نائٹ کلبوں کی تلافی کے لیے خوب رہے گا۔ عورت نے اس کے ضمیر کو گراں بار کردیا تھا، اور وہ اس کے لیے کچھ بھی کرنے کے لیے تیار تھا۔ اس کی توقع کے مطابق، اٹاری کی خلوت میں عورت کا جادو لوٹ آیا تھا۔ سڑکوں پر مٹرگشت کرتی ہوئی لڑکیاں معدوم ہوچکی تھیں اور عورت کی خاکسارانہ خاموش دلکشی سے سارا کمرا معمور ہوگیا تھا۔ لڑکے کی مایوسی آہستہ آہستہ زائل ہوگئی، اور وہ آنے والی رات کے دہرے پروگرام کے خیال پر پرسکون اور مطمئن ہوکر کلب کے لیے نکل پڑا۔

شعرا

طالبِ علم 'رائٹرز کلب' کے سامنے والتیئر کا انتظار کرتا رہا، پھر دونوں ساتھ ساتھ اوپر آئے،

کلوک روم سے ڈیوڑھی میں آتے ہی انھیں بڑا زندہ دل شور وغوغا سنائی دیا۔ والتیئر نے کھانے کے کمرے کا دروازہ کھولا اور لڑکے نے کیا دیکھا کہ ملک بھر کی شاعری ایک بڑی سی میز کے گرد براجمان ہے۔

میں انھیں دو ہزار کلومیٹر کے فاصلے سے دیکھ رہا ہوں۔ اب یہ 1977 کی خزاں کا موسم ہے۔ پچھلے آٹھ سال سے میرا ملک روسی ایمپائر کی شیریں اور مضبوط آغوش میں پڑا اونگھ رہا ہے، والتیئر کو یونیورسٹی سے نکال دیا گیا ہے، اور میری کتابیں سارے عوامی کتب خانوں میں ممنوعہ قرار دے دی گئی ہیں اور حکومت کی زمین دوز کوٹھریوں میں مقفل ہیں۔ میں چند سال تک لشتم پشتم گزارہ کرتا رہا اور پھر کار میں جتنی دور مغرب کی سمت میں جا سکتا تھا گیا، رینس (Rennes) کے شہر بریتوں (Breton) میں، جہاں پہلے ہی دن مجھے سب سے اونچی عمارت کی بالائی منزل میں ایک اپارٹ مینٹ مل گیا۔ اگلی صبح جب سورج نے مجھے جگا دیا، تو اندازہ ہوا کہ رہائش گاہ کی بڑی بڑی کھڑکیاں مشرق کے رخ ہیں، پراگ کی جانب۔

اب میں انھیں اپنے برج سے دیکھتا ہوں، لیکن فاصلہ بہت زیادہ ہے۔ خوش قسمتی سے میری آنکھ کا چاک کسی دوربین کے عدسے کی طرح پھیل کر ان کے چہروں کو قریب لے آتا ہے۔ اب مجھے عظیم شاعر، توجہ کا مسلمہ مرکز، نظر آنے لگا ہے۔ اگر چہ وہ عمر میں ستر سے متجاوز ہے، اس کا چہرا ہنوز دلکش ہے، آنکھوں سے فراست اور زندہ دلی ٹپکتی ہے۔ اس کی بیساکھیاں اس کے برابر میز سے ٹکی ہوئی ہیں۔

میں انھیں پراگ کی شبانہ روشنیوں میں دیکھتا ہوں، جیسا کہ پراگ پندرہ برس قبل ہوا کرتا تھا، ان کی کتابوں کے حکومت کی زمین دوز کوٹھریوں میں مقفل کر دیے جانے سے پہلے، جب ہم بوتلوں سے اَٹی بڑی سی میز کے گرد باہم اچھا وقت گزار سکتے تھے، خوب ہنگامہ کر سکتے تھے۔ میں ان سب کو پسند کرتا ہوں اور ٹیلی فون کی کتاب سے ان کے لیے اندھادھند نام چننے کو مناسب نہیں سمجھتا۔ اگر مجھے ان کے چہروں کو فرضی ناموں کی نقابوں سے چھپانے کی ضرورت پیش آ ہی جائے، تو کیوں نہ یہ انھیں تحفتاً پیش کر دوں، ایک سجاوٹ، ایک اعزاز کے طور پر۔

اگر طلبہ لیکچرر کو والتیئر کہہ کر پکارتے ہیں، تو مجھے عظیم اور بے حد محترم شاعر کو گیئٹے کہہ کر

پکارنے سے کون روک سکتا ہے؟

اور اس کے سامنے جو شاعر بیٹھا ہے اسے لیرمنتوف (Lermontov)۔

اور اس خواب آلود کالی آنکھوں والے کو پیٹرارک (Petrarch)۔

لیکن ویرلین (Verlaine)، یسی نین (Yesenin)، اور بہت سے دوسروں کے ساتھ جو خاص طور پر ذکر کیے جانے کے قابل نہیں، ایک اور شخص بھی موجود ہے جو شاید غلطی سے وہاں آ گیا ہے۔ یہ بالکل صاف ہے (میں اسے دو ہزار کلو میٹر کی دوری سے دیکھ سکتا ہوں) کہ شعر کی دیوی نے کبھی اسے اپنی عنایات سے فیضیاب نہیں کیا ہے، کہ اسے تو شاعری کی ذرا پروا نہیں۔ اس کا نام بکاچیو (Boccaccio) ہے۔

والتیئر دیوار کے پاس سے دو کرسیاں چنتا ہے اور انھیں دھکیل کر بوتلوں سے لدی میز کے پاس لاتا ہے، اور شاعروں سے طالبِ علم کا تعارف کراتا ہے۔ تمام شاعر بڑے مہذب انداز میں اس کی طرف دیکھ کر سر ہلاتے ہیں، سبھی سوائے پیٹرارک کے، جو بکاچیو سے کسی بحث میں اتنا منہمک ہے کہ وہ اس کی توجہ میں ہی نہیں آتا۔ "عورتیں ہمیشہ ہی ہمیں پچھاڑ دیتی ہیں،" وہ کہتا ہے، خلاصتاً۔ "میں ہفتوں اس پر گفتگو کر سکتا ہوں۔"

"یہ تو بہت زیادہ ہوگا،" گیٹے کہتا ہے۔ "دس منٹ کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

پیٹرارک کا قصہ

"ہفتہ بھر پہلے میرے ساتھ بے حد ناقابلِ یقین واقعہ پیش آیا۔ بیوی نے ابھی ابھی غسل کیا تھا۔ وہ سرخ رنگ کا نیگلی جے پہنے ہوئے تھی اور اپنے لمبے لمبے سنہری بالوں کو کھلا چھوڑ دیا تھا۔ وہ حسین نظر آ رہی تھی۔ نو بج کر دس منٹ پر دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ ایک لڑکی دیوار سے بھڑی کھڑی ہے۔ میں اسے فوراً پہچان گیا۔ میں ہفتے میں ایک بار لڑکیوں کے اسکول جاتا ہوں جہاں ایک 'پوئیٹری کلب' ہے۔ ساری لڑکیاں مجھے سے خفیہ محبت کرتی ہیں۔

"'یہاں کیا کر رہی ہو؟' میں اس سے پوچھتا ہوں۔

"'ایک بات ہے جو میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں!'

"'بھلا کیا بات ہے؟'

"'میں آپ کو ایک بہت اہم بات بتانا چاہتی ہوں!'

"'دیکھو،' میں نے کہا، 'بہت وقت ہو گیا ہے اور تم اندر نہیں آ سکتیں۔ نیچے جاؤ اور بیس مینٹ کے دروازے پر میرا انتظار کرو۔'

"میں بیڈ روم میں واپس آیا اور بیوی سے کہا کہ کسی نے غلط گھنٹی بجادی تھی۔ پھر میں نے لاتعلقی سے کہا کہ مجھے کوئلے لینے بیس مینٹ جانا ہے اور ٹوکریاں اٹھائیں۔ یہ غلط حکمت عملی تھی۔ میرا پتا سارا دن تکلیف پہنچاتا رہا تھا، اور میں نے کچھ وقت بستر پر ہی گزارا تھا۔ توانائی کے اس اچانک پھریرے نے بیوی کے شبہات کو ضرور ہوا دی ہو گی۔"

"تمھیں پتے کا عارضہ ہے؟" گیئٹے نے دلچسپی سے پوچھا۔

"برسوں سے ہے،" پٹرارک نے کہا۔

"تو آپریشن کیوں نہیں کرا لیتے؟"

"ہرگز نہیں،" پٹرارک بولا۔

گیئٹے نے ہمدردی سے سر ہلایا۔

"ہاں تو کہاں بات چھوڑی تھی؟" پٹرارک نے پوچھا۔

"پتا تنگ کر رہا تھا اور تم نے کوئلے کی ٹوکریاں اٹھائی تھیں،" ورلین نے شہ دی۔

"لڑکی مجھے بیس مینٹ کے دروازے پر منتظر ملی،" پٹرارک نے بات جاری رکھی، "اور میں نے اسے اپنے ساتھ نیچے آنے کے لیے کہا۔ ٹوکریوں میں کوئلے ڈالتے ہوئے میں نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ وہ کیا چاہتی تھی۔ وہ بس یہی تکرار کیے گئی کہ مجھ سے ملنا ضروری تھا۔ اس سے زیادہ میں اس سے کچھ اور نہیں اگلوا سکا۔

"اچانک مجھے سیڑھیاں اترتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں نے بھری ہوئی ٹوکریوں کو جھپٹ کر اٹھایا، اوپر بھاگا اور بیس مینٹ سے ٹھیک بیوی کے سامنے نکل آیا۔ 'یہ لو،' میں نے کہا۔ 'میں واپس جا کر دوسری بھی بھر لاتا ہوں۔' بیوی ٹوکری لے کر اوپر چلی گئی، اور میں نے بیس مینٹ میں لوٹ کر لڑکی سے کہا کہ ہم یہاں نہیں رہ سکتے اور باہر جا کر میرا انتظار

کرے۔ میں نے جلدی جلدی ٹوکری بھری اور اسے لے کر واپس اوپر اپارٹ مینٹ میں آیا۔ بیوی کو بوسہ دیا اور کہا کہ جا کر لیٹ جائے، میں بستر پر آنے سے پہلے ذرا نہا لوں۔ وہ بستر میں گھس گئی، اور میں نے باتھ ٹب میں پانی کھول دیا۔ پانی ٹب کی تہہ میں خوب زوردار چھپاکوں سے گرنے لگا۔ میں نے سلیپر اتارے اور موزے پہنے راہداری میں آیا۔ دن میں جو جوتے استعمال کیے تھے وہ صدر دروازے کے قریب ہی پڑے تھے۔ انھیں وہیں پڑے رہنے دیا، اس ثبوت کے طور پر کہ گھر سے باہر نہیں گیا ہوں۔ پھر میں نے کپڑوں کی الماری سے جوتوں کی ایک اور جوڑی نکالی، پہنی، اور اپارٹ مینٹ سے سرک لیا۔"

"ہم سب جانتے ہیں کہ تم کتنے عظیم شاعر ہو، پٹرارک،" بوکّا چیو نے بات کاٹ کر کہا، "لیکن اب پہلی بار مجھے تمھارے اندر مکار بھی نظر آ رہا ہے، وہ زیرک شاطر جسے شہوت نے اندھا کر دیا ہے۔ واہ، سلیپر اور دو جوڑی جوتوں کی یہ حکمت عملی بڑا اچھوتا خیال تھا!"

سب نے بکّاچیو سے اتفاق کیا اور پٹرارک پر خوب خوب تحسین کے ڈونگرے برسائے، جس سے صاف ظاہر ہے وہ خوش ہوا۔

"خیر، تو وہ باہر کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی،" وہ بولے گیا۔ "میں نے اسے دلاسا دلانے کی پوری کوشش کی۔ کہا کہ اب مجھے واپس جانا ہے اور وہ اگلی صبح آئے، جب مجھے پورا یقین تھا کہ بیوی کام پر گئی ہوئی ہوگی۔ ہماری عمارت کے عین سامنے ٹرام کا اسٹاپ ہے، اور میں نے اسے ٹرام میں سوار ہو جانے کے لیے پھسلایا۔ جب بالآخر ایک ٹرام آئی، تو وہ ہذیانی طور پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور میں نے بھاگ کر عمارت میں داخل ہونے کی کوشش کی۔"

"تمھیں چاہیے تھا کہ اسے ٹرام کے نیچے دھکا دے دیتے،" بکّاچیو بولا۔

"دوستو،" پٹرارک نے بڑے رسمی تکلف سے کہا، "ایسے وقت بھی آتے ہیں جب آدمی کو عورت کے ساتھ بڑی بے رحمی دکھانی پڑتی ہے۔ سو میں نے اس سے کہا، 'اگر تم خود واپس گھر نہیں جاؤ گی تو میں تمھیں عمارت کے باہر کر کے تالا لگا دوں گا۔ مت بھولو کہ یہ میرا مکان ہے۔ میں اس اصطبل بنانے سے رہا!' اور صاحبان، یہ نہ بھولیے کہ اس تمام مدت میں جب میں اس کے ساتھ عمارت کے سامنے کھڑا بحث رہا تھا، غسل خانے میں پانی بہے جا رہا تھا اور باتھ ٹب کسی لمحے بھی بھر کر چھلک سکتا تھا!

"میں مڑا اور تیزی سے صدر دروازے کی طرف بھاگا۔ لڑکی بھی میرے پیچھے بھاگی۔ بدقسمتی سے ٹھیک اُسی وقت کچھ اور لوگ بھی دروازے سے اندر داخل ہو رہے تھے اور وہ ان میں گھس گھسا کر اندر آ گئی۔ میں کسی تیز دوڑنے والے کی طرح سیڑھیاں چڑھا! اپنے ذرا پیچھے ہی مجھے اس کے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ہمارا اپارٹ مینٹ چار سیڑھیاں اوپر تھا، اور چڑھنے میں حالت غیر ہوئی جاری تھی، تاہم میں اس سے تیز تر نکلا۔ عین وقت پر میں نے دروازہ اس پر پھٹ سے بند کر دیا۔ پھر گھنٹی کے تار کھینچ کر دیوار سے نوچ ڈالے تاکہ کوئی لڑکی کے گھنٹی بجانے کی آواز نہ سن سکے — مجھے پورا یقین تھا کہ وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا کر گھنٹی پر تکی کھڑی رہے گی — اور پنجوں کے بل چلتا ہوا غسل خانے میں آیا۔"

"پانی ٹب سے ابھی تک نہیں چھلکا تھا؟" گیتھے نے تشویش کے ساتھ پوچھا۔

"میں نے عین موقعے پر پانی بند کر دیا۔ پھر دروازے پر ایک بار اور نظر ڈالنے لوٹا۔ سوراخ کا ڈھکنا سرکایا تو دیکھا کہ لڑکی ابھی تک وہیں بے حرکت کھڑی دروازے کو تک رہی ہے۔ صاحبو، میری سٹی گم ہو گئی۔ مجھے یہ ڈر لگا کہ وہ ساری رات وہیں کھڑی رہے گی۔"

بکّا چیو گڑبڑ مچاتا ہے

"پٹرارک، تمھیں پتا ہے، تم لاعلاج صنم پرست واقع ہوئے ہو؟" بکّا چیو نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "مجھے خوب معلوم ہے کہ شاعری کے کلب میں داخلہ لینے اور تمھیں اپنا اپالو گردانے والی کس قسم کی لڑکی ہو سکتی ہے۔ رہا میں، تو میں اس کے پاس بھی نہیں پھٹک سکتا۔ شاعر عورت دہری عورت ہوتی ہے۔ مجھ جیسے زن بے زار کی برداشت سے کہیں باہر۔"

"بکّا چیو، یہ بتاؤ،" گیتھے نے کہا، "تم اپنے زن بے زار ہونے کا اتنا ڈھنڈورا کیوں پیٹتے رہتے ہو؟"

"اس لیے کہ زن بے زار ہی بہترین آدمی ہوتے ہیں۔"

تمام شاعروں نے ان الفاظ پر ناپسندیدگی اور تضحیک کے آوازے کس کے ردِعمل ظاہر کیا، اور بکّا چیو چیخنے چلانے پر مجبور ہو گیا۔ "ارے ارے، مجھے غلط نہ سمجھو۔ زن بے زار

عورتوں سے نفرت نہیں کرتا؛ وہ تو بس عورت ذات ہی کو ناپسند کرتا ہے۔ اوائل وقت سے مرد دو بڑے زمروں میں بٹے ہوئے ہیں: زن پرست — جو شاعر بھی کہلاتے ہیں — اور زن بےزار — یا، بلکہ، عورت سے خوفزدہ۔ زن پرست یا شاعر روایتی نسوانی اوصاف جیسے احساسات، گھر گرہستی، مادریت، زرخیزی، ہسٹریا کے الوہی کوندے، اور ہم میں فطرت کی جو الوہی صدا پائی جاتی ہے اس کی پرستش کرتے ہیں؛ زن بےزار یا عورت سے خوفزدہ ان باتوں کا خیال آتے ہی ہلکی سی دہشت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ زن پرست عورت میں عورت ذات کی پرستش کرتا ہے۔ اور ایک بات ملحوظ رکھیے: عورت صرف زن بےزار کے ساتھ ہی خوش رہ سکتی ہے۔ کوئی عورت تم میں سے کسی کے ساتھ خوش نہیں رہی ہے!"

ایک بار پھر تضحیک اور ناپسندیدگی کا غلغلہ اٹھا۔

"زن پرست یا شاعر عورت کو ناٹک، جوش و خروش، آنسو، اور فکریں تو دے سکتا ہے، آسودگی کبھی نہیں۔ کبھی میں ایک ایسے سے واقف تھا۔ وہ بیوی کی پرستش کرتا تھا۔ پھر وہ کسی اور کی بیوی کی پرستش کرنے لگا۔ اس نے پہلی والی کو دھوکا دے کر اس کی توہین کرنے سے انکار کردیا اور دوسری کے ساتھ چوری چھپے سو کر اس کی توہین کرنے سے۔ سو اس نے بیوی سے ساری بات صاف صاف بتادی اور مدد کرنے کے لیے کہا۔ وہ اس کی متحمل نہ ہوسکی اور بیمار پڑ گئی، اور وہ خود ہر وقت آنسو بہانے لگا، اتنے کہ دوسری عورت نے انکار کردیا اور تعلق توڑ لیا۔ ایک دن وہ جا کر ٹرام کی پٹری پر لیٹ گیا تاکہ سارا دلدّر دور ہو، لیکن بدقسمتی سے ڈرائیور نے دور ہی سے دیکھ لیا اور میرے زن پرست کو آمد و رفت میں روڑا اٹکانے کے الزام میں پچاس کراؤن کا جرمانہ ہوگیا۔"

"جھوٹا! بکاچیو جھوٹا ہے!" ویرلین چلایا۔

"پٹرارک نے ابھی ابھی جو کہانی تمھیں سنائی ہے، وہ بھی اسی قبیل کی ہے،" بکاچیو نے جوابی حملہ کیا۔ "تمھاری سنہری بالوں والی بیوی نے آخر کیا گناہ کیا ہے جو تم اس قسم کی ہسٹریا زدہ لونڈیا کے بارے میں اتنی سنجیدگی دکھا رہے ہو؟"

"تم میری بیوی کے بارے میں کیا جانتے ہو؟" پٹرارک نے چلا کر کہا۔ "میری بیوی میری وفادار رفیق ہے! ہمارے درمیان کوئی راز واز نہیں!"

"تو پھر تم نے اپنے جوتے کیوں بدلے تھے؟" لیر منتوف نے پوچھا۔

لیکن پٹرارک اپنی بات پر اَڑا رہا۔ "دوستو" وہ بولا، "اس نازک وقت جب لڑکی راہداری میں کھڑی ہوئی تھی اور میری عقل گم تھی کہ کروں تو کیا کروں، میں نے بیڈ روم میں جا کر بیوی سے سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔"

"بالکل میرے زن پرست کی طرح!" بکّاچیو نے قہقہہ مارا۔ "وہی صاف صاف بتا دینے کا مرض! زن پرست کا پہلا اضطراری عمل! شرط لگا کر کہہ سکتا ہوں کہ تم نے بھی اس سے مدد کرنے کے لیے کہا ہوگا۔"

پٹرارک کی آواز مجسم گدازی تھی۔ "ہاں، میں نے اس سے مدد کرنے کے لیے ضرور کہا تھا۔ اس نے نہ پہلے کبھی انکار کیا تھا، نہ اب کیا۔ وہ خود دروازے پر گئی۔ میں پیچھے بیڈ روم میں ہی رہا۔ میں خوفزدہ تھا۔"

"میں بھی خوفزدہ ہوا ہوتا" گیئٹے نے ہمدردی سے کہا۔

"خیر، تو وہ بالکل آسودہ حال لوٹی۔ اس نے سوراخ سے راہداری میں جھانکا تھا، دروازہ کھولا تھا، اور وہاں کسی کو نہیں پایا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ساری کہانی میری ہی گھڑنت ہو۔ لیکن اچانک ہمیں اپنے عقب میں ایک بلند آواز سنائی دی، اور اس کے بعد شیشہ چکنا چور ہونے کی۔ تم جانتے ہی ہو، ہم پرانے سے اپارٹ مینٹ ہاؤس میں رہتے ہیں، وہی جن کی ہر منزل پر صحن کے گرد برآمدے ہوتے ہیں۔ خیر تو، جب کسی نے لڑکی کے گھنٹی بجانے کا جواب نہیں دیا، تو اس نے کہیں سے ایک لوہے کی سلاخ اٹھائی اور برآمدے میں پھیرا لگاتے ہوئے ایک کے بعد ایک ہماری ساری کھڑکیوں کے شیشے توڑ دیے۔ ہم اندر کھڑے اسے دیکھتے رہے — بے یارومددگار، دہشت زدہ۔ پھر ہمیں تاریک برآمدے کی دوسری طرف تین سفید پرچھائیاں ابھرتی ہوئی نظر آئیں۔ یہ وہ بوڑھی عورتیں تھیں جو راستے کے دوسری طرف والے اپارٹ مینٹ میں رہتی تھیں۔ شیشے چکنا چور ہونے کی آواز سے جگ پڑی تھیں اور اپنے نائٹ گاؤن پہنے ہی باہر نکل آئی تھیں، بے تاب آنکھوں اور کانوں سمیت، اس امید میں کہ کوئی مزے دار فضیحتا دیکھنے کو ملے گا۔ ذرا تصور تو کرو: ایک نوجوان حسین لڑکی، ہاتھ میں لوہے کی سلاخ تھامے ہوئے، تین چڑیلوں کے بدشگون سایے میں گھری ہوئی!

"خیر تو جب اس نے آخری کھڑکی بھی توڑ دی تو کود کر کمرے میں چلی آئی۔
"میں آگے بڑھ کر اس سے بات کرنا چاہتا تھا، لیکن بیوی نے بانہیں میرے گرد ڈال دیں اور عاجزی کی کہ ایسا نہ کروں۔ 'وہ تمھیں مار ڈالے گی!' لڑکی ہمارے بیڈ روم کے بیچ کھڑی ہوئی تھی، ہاتھ میں آہنی سلاخ اٹھائے، شمشیر بکف جون اُوف آرک، بارعب، پرشکوہ۔ میں نے جھٹک کر خود کو بیوی کی آغوش سے علاحدہ کیا اور لڑکی کی طرف بڑھنے لگا۔ جوں ہی اس کے نزدیک پہنچا، اس کا ڈرانے دھمکانے والا تاثر چہرے سے غائب ہو گیا؛ اس کے بجائے اس پر نرمی آ گئی، اور ایک سماوی سکون سے بھر گیا۔ میں نے جھپٹ کر اس کی سلاخ چھین کر زمین پر ڈال دی اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔"

ابانتیں

"مجھے ایک لفظ پر بھی یقین نہیں،" لیرمنتوف نے کہا۔
"ظاہر ہے یہ سب بالکل اس طرح نہیں ہوا ہوگا جس طرح پٹرارک نے بیان کیا ہے،" بکاچیو نے کہا، پھر بات کاٹتے ہوئے اضافہ کیا، "لیکن مجھے یہ یقین ضرور ہے کہ ہوا ہوگا۔ لڑکی ہذیان زدہ تھی، اور اس کی جگہ پر کوئی نارمل آدمی ہوتا تو اسے ایک دو زوردار طمانچے کبھی کے رسید کر دیے ہوتے۔ زن پرست اور شاعر ہذیانی عورتوں کے لیے ہمیشہ ہی اول درجے کا مالِ غنیمت رہے ہیں۔ ہذیانی عورتیں جانتی ہیں کہ زن پرست انھیں کبھی طمانچہ نہیں ماریں گے۔ عورت سامنے آ جائے تو زن پرست لاچار ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ اپنی ماؤں کے دامن سے باہر کبھی نکلے ہی نہیں ہوتے۔ ہر عورت میں انھیں اپنی ماں کا فرستادہ پیامبر ہی نظر آتا ہے اور فوراً ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ ان کی ماؤں کے دامن ان پر آسمان کی طرح تنے ہوتے ہیں۔"
اسے یہ آخری جملہ اتنا پسند آیا کہ اسے کئی طرح سے بدل بدل کر کہا۔ "شاعرو، تمھیں اپنے سروں پر وہ پہنائی نظر آ رہی ہے؟ تو یہ کوئی آسمان وآسمان نہیں ہے، یہ تمھاری ماؤں کے زبردست دامن ہیں۔ تم سب اپنی ماؤں کے دامنوں کے نیچے زندہ ہو!"
"یہ تم نے ابھی ابھی کیا کہا؟" یاسنین بڑے زور سے ڈکرایا اور کرسی سے اچھل پڑا۔

وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ اس نے اس شام سبھوں سے زیادہ چڑھا رکھی تھی۔ "یہ تم نے میری ماں کے بارے میں کیا کہا؟ تم نے کیا کہا؟"

"میں تمھاری ماں کا ذکر نہیں کر رہا تھا" بکاچیو نے نرمی سے جواب دیا۔ اسے پتا تھا کہ ان دنوں یاسنین بیلے کی ایک مشہور رقاصہ کے ساتھ رہ رہا تھا جو اس سے تیس سال بڑی تھی اور واقعی اس کے لیے بڑا افسوس محسوس کیا۔ لیکن تھوک یاسنین کے ہونٹوں پر تیار رکھا تھا، بس جھکا اور پچکاری ماردی۔ چونکہ بری طرح مدہوش تھا، وہ جا کر گیئٹے کے کالر پر پڑی۔ بکاچیو نے فوراً رومال نکال کر عظیم شاعر کے کالر سے تھوک پونچھ ڈالا۔

تھوک اچھالنے کی محنت سے نڈھال ہو کر یاسنین اپنی کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔

"دوستو، میں بتاتا ہوں کہ اس نے مجھ سے کیا کہا" پٹرارک نے بات جاری رکھی۔ "اسے بھولا نہیں جا سکتا، یہ تو ایک دعا کی طرح تھی، ایک وظیفے کے ورد کی طرح۔ 'میں ایک سیدھی سادی لڑکی ہوں، بالکل معمولی سی۔ تمھیں دینے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں، لیکن میں محبت کے کہنے پر یہاں آئی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم' — اور اب وہ میرا ہاتھ دبا رہی تھی — 'محسوس کرو، میں چاہتی ہوں کہ تم زندگی میں ایک بار تو اس کا ذائقہ چکھ دیکھو۔'"

"اور تمھاری بیوی نے محبت کی اس پیامبر سے کیا کہا؟" لیرمنتوف نے پوچھا، اس کی آواز میں بلا کا طنز تھا۔

"لیرمنتوف کسی عورت سے اپنی کھڑکیاں تڑوانے کے لیے کیا نہیں قربان کر دے گا!" گیئٹے ہنسا۔ "وہ تو اس کے لیے اسے باقاعدہ پیسے بھی دے گا!"

لیرمنتوف نے گیئٹے کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا، اور پٹرارک نے پھر بات کا سلسلہ جوڑا۔ "میری بیوی؟ لیرمنتوف، اگر تم سمجھتے ہو کہ یہ بھی بکاچیو کی احمقانہ کہانیوں جیسی ہے، تو غلط سمجھ رہے ہو۔ لڑکی اپنی سماوی آنکھوں سمیت میری بیوی کی طرف متوجہ ہوئی اور بولی — ایک بار پھر کسی دعا کی طرح، کسی وظیفے کے ورد کی طرح — 'آپ غصے نہ ہوں، مجھے معلوم ہے کہ آپ بہت اچھی ہیں اور میں آپ کو بھی اتنا ہی چاہتی ہوں جتنا انھیں، مجھے آپ دونوں سے محبت ہے۔' پھر اس نے میری بیوی کا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔"

"اگر یہ بکاچیو کی کسی احمقانہ کہانی کا منظر ہوتا، تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا" لیرمنتوف

نے کہا۔ "لیکن نہیں، یہ تو اور بھی زیادہ قبیح ہے۔ یہ بری شاعری ہے۔"

"بس، تم حسد کے مارے جلے جا رہے ہو،" پٹرارک اس پر چلایا۔ "تمھیں کمرے میں دو ایسی حسین عورتوں کی صحبت کا اتفاق ہی نہیں ہوا جو تم سے ٹوٹ کر محبت کرتی ہوں! کچھ خبر بھی ہے کہ جب میری بیوی کے سرخ نیکلی جے پر اس کے سنہری بال لہرا رہے ہوں تو اس کے حسن کا کیا عالم ہوتا ہے؟"

جب لیرمنتوف جواب میں کمینگی سے ہنس پڑا تو گیٹے نے اس کی عام بدخواہی پر مزاج پرسی کرنے کا فیصلہ کیا۔ "لیرمنتوف، یہ کہ تم عظیم شاعر ہو، تو اس میں کسی کو شک نہیں،" اس نے کہا، "لیکن تمھارے اندر یہ کیسی بھیانک نفسیاتی گرہیں پڑی ہوئی ہیں؟"

لیرمنتوف پر جیسے اچانک بجلی گر پڑی ہو۔ "تمھیں یہ نہیں کہنا چاہیے تھا، یوحان،" اس نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پاتے ہوئے گیٹے سے کہا۔ "یہ بدترین چیز تھی جو تم کہہ سکتے تھے۔ بڑی نیچ حرکت۔"

اب گیٹے، جو شانتی اور ہم آہنگی کا بڑے سے بڑا عاشق تھا، اس حد سے کبھی آگے نہ بڑھا ہوتا، لیکن اس کا سوانح نگار، ہمارا چہار چشم والتیئر، ٹھٹھا مار کر ہنس پڑا اور بولا، "سبھی کو تمھارے نفسیاتی الجھاوؤں کا پتا ہے، لیرمنتوف،" اور اس کی شاعری کا تجزیہ کر مارا، جو گیٹے کی لطافت اور پٹرارک کی گرم جوشی سے عاری تھی۔ وہ تو منفرد استعاروں کا تجزیہ بھی کرنے بیٹھ گیا، اور بڑی ظرافت سے بحث کی کہ لیرمنتوف کا احساسِ کمتری ہی اس کے تخیل کا سرچشمہ ہے اور یہ اس بچپن کی دین ہے جو غربت اور آمرانہ باپ کے غلبہ آور دباؤ سے عبارت تھا۔

ٹھیک اس وقت گیٹے پٹرارک کی جانب جھکا اور اسٹیج والی سرگوشی میں کہا جس سے پورا کمرا بھر گیا اور جسے سبھی نے، بشمول لیرمنتوف، سنا، "نہیں، نہیں۔ یہ بالکل غلط سمجھا ہے۔ لیرمنتوف کی ساری مصیبت یہ ہے کہ اسے استعمال کے لیے کافی مقعدیں نہیں ملتیں۔"

طالب علم لیرمنتوف کی حمایت کرتا ہے

اس تمام مدت میں طالب علم خاموش بیٹھا گلاس میں شراب انڈیلتا رہا تھا (ایک باشعور ویٹر

دبے قدموں آ کر خالی بوتلیں اٹھا لے گیا تھا اور بھری ہوئی لا کر رکھ دی تھیں) اور اس جگمگاتی گفتگو کا ہر ہر لفظ سننے کی بھرپور کوشش کرتا رہا تھا۔ شعرا کی سرشار چک پھیریوں کا ساتھ دینے کے لیے اسے اپنے تمام ہوش و حواس قائم رکھنے کی ضرورت تھی۔

اس نے فیصلہ کرنے کی کوشش کی کہ ذاتی طور پر ان میں سے کون اسے سب سے زیادہ پسند تھا۔ وہ گیئٹے کی کرستینا سے، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ سارے ملک سے، کچھ کم پرستش نہیں کرتا تھا۔ وہ پٹرارک اور اس کی شعلہ بار آنکھوں سے مسحور تھا۔ تاہم عجیب بات تھی کہ وہ اوروں کے مقابلے میں لیرمنتوف سے زیادہ قربت محسوس کرتا تھا جو خاصی بد گوئی کا ہدف بنا ہوا تھا۔ یہ گیئٹے کا آخری فقرہ تھا جس نے فیصلہ کر دیا۔ اس پر یکبارگی منکشف ہوا کہ ایک عظیم شاعر (اور لرمنتوف واقعی ایک عظیم شاعر تھا) کے بھی وہی مسائل ہو سکتے ہیں جو اُس جیسے بے ارز طالب علم کے ہوتے ہیں۔ اس نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی، اس خیال سے کہ اپنا حشر لیرمنتوف جیسا نہیں کرانا چاہتا تو اب اسے رخصت ہو جانا چاہیے۔

لیکن کسی وجہ سے ان عظما سے دور ہوتے نہ بنی، اور بجائے کرستینا کے پاس لوٹ جانے کے اس نے مردوں کے غسل خانے کا رخ کیا۔ وہ وہاں کھڑا سفید رنگ کے ٹائل کو تک رہا تھا اور سوچ میں گم تھا کہ اچانک اسے اپنے برابر لیرمنتوف کی آواز سنائی دی جو کہہ رہی تھی، "تم نے انھیں سنا نا۔ یہ لوگ کوئی خاص 'لطیف' نہیں ہیں، میرا مطلب سمجھے؟ کوئی خاص 'لطیف' نہیں ہیں۔"

اس نے 'لطیف' کا لفظ یوں استعمال کیا جیسے یہ آئی ٹیلکس (italics) حروف میں ہو۔ ہاں، بعض لفظ دوسرے لفظوں جیسے نہیں ہوتے؛ ان کے خاص معنی ہوتے ہیں اور صرف ماہر ہی اس سے واقف ہوتے ہیں۔ طالب علم کو پتا نہیں تھا کہ لیرمنتوف نے 'لطیف' کا لفظ آئی ٹیلکس حروف کے طور پر کیوں استعمال کیا تھا، لیکن میں، جو ماہروں میں سے ہوں، جانتا ہوں کہ ایک مرتبہ لیرمنتوف نے لطیف ذہنوں اور ہندسی ذہنوں کے بارے میں پسکال کی *pensée* پڑھی تھی، اور تبھی سے اس نے خلقت کو لطیف اور غیر لطیف لوگوں کے زمروں میں تقسیم کر دیا تھا۔

"یا تمھارے خیال میں لطیف ہیں؟" اس نے زبان گنگ طالب علم کو للکارا۔

پتلون کے آگے کے بٹن لگاتے ہوئے یہ بات طالب علم کی توجہ میں آئی کہ لیرمنتوف کی ٹانگیں، جیسا کہ کاؤنٹیس N. P. Rostopchina نے ڈائری میں رقم کیا ہے، بے حد کوتاہ ہیں۔ طالبِ علم اُس کا بے حد ممنون تھا۔ وہ پہلا عظیم شاعر تھا جس نے سنجیدہ سوال کر کے اور سنجیدہ جواب مانگ کر اس کی عزت افزائی کی تھی۔

"ذرہ برابر بھی لطیف نہیں،" وہ بولا۔

لیرمنتوف اپنی چھوٹی چھوٹی ٹانگوں پر مڑا اور بولا، "نہیں، ذرہ برابر بھی نہیں۔" پھر آواز بلند کرتے ہوئے اضافہ کیا، "لیکن میرا بھی 'وقار' ہے۔ سمجھے۔ میں بھی 'وقار' رکھتا ہوں۔"

اس نے 'وقار' کا لفظ بھی آئی ٹیلکس میں ادا کیا، اور وہ بھی کچھ ایسے آئی ٹیلکس میں جس کا مدعا تھا کہ کوئی احمق ہی لیرمنتوف کے وقار کو اس زمرے میں ڈال سکتا ہے جس میں حسن کے اعتبار سے ایک لڑکی کا وقار آتا ہے یا کسی دکاندار کا اپنے مال کے اعتبار سے۔ نہیں، اس کا وقار بڑا خاص الخاص تھا، عالی رتبہ اور پوری طرح سے اس کا سزاوار۔

"میرا وقار بھی ہے!" واپس کمرے میں لوٹتے ہوئے لیرمنتوف نے خوب چلا کر کہا۔ وہ عین وقت پر بیٹھ گئے تاکہ گیٹے کی شان میں والتیئر کی قصیدہ خوانی سن سکیں۔ لیرمنتوف کھول رہا تھا۔ وہ پھر اٹھ کھڑا ہوا — اور یوں فوراً سبھوں سے سر بھر بلند قامت نظر آنے لگا — اور بولا، "اور اب میں تمھیں بتاؤں گا کہ میں کیوں اپنے پر اس قدر فخر کرتا ہوں۔ اب بتاؤں گا کہ کس وجہ سے اتنا فخر کرتا ہوں۔ اس ملک میں صرف دو شاعر ہی ہیں: گیٹے اور میں۔"

"تم عظیم شاعر ہو سکتے ہو،" والتیئر نے فوراً مخالفت کی، "لیکن اگر اپنے بارے میں اس قسم کی باتیں کرتے پھرو گے تو بڑے اوچھے آدمی ہی رہو گے!"

لیرمنتوف اتنا سراسیمہ ہو گیا کہ بس ہکلا ہکلا کر ہی بول سکا، "ہاں، تو کیوں نہ کروں؟" اور کئی بار تکرار کی، "میرا اپنا وقار ہے!" جلد ہی والتیئر خوب ٹھٹھے مار کر ہنسنے لگا، اور دوسرے بھی اس کی ہنسی میں شریک ہو گئے۔

طالبِ علم کو موقع نظر آیا۔ وہ بھی اسی طرح اٹھ کھڑا ہوا جس طرح لیرمنتوف ہوا تھا، چاروں طرف سارے حاضرین پر نظر ڈالی، اور بولا، "آپ لوگ لیرمنتوف کو نہیں سمجھتے ہیں۔ شاعر کا فخر عام فخر سے مختلف ہوتا ہے۔ صرف شاعر ہی اپنے کلام کی صحیح قدر و قیمت جان سکتا

ہے۔ یہ قدر و قیمت دوسروں پر بہت بعد میں عیاں ہوتی ہے، اور کبھی بالکل نہیں ہوتی۔ شاعر کے لیے اپنا فخر ضروری ہے۔ اگر نہ ہو تو وہ اپنی پوری زندگی کے کام سے غداری کرے گا۔"

اگرچہ ایک منٹ پہلے تک وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوئے جا رہے تھے، انھیں طالب علم کی بات میں مخفی نکتہ اچانک نظر آ گیا۔ حقیقت میں، ان میں سے ہر ایک خود پر اتنا ہی فخر کرتا تھا جتنا لیرمنتوف، بس اس کا اعتراف کرتے ہوئے شرم سی آتی تھی۔ انھیں یہ احساس نہیں تھا کہ اگر 'فخر' کے لفظ کو مناسب تاکید کے ساتھ ادا کیا جائے، تو اس میں کچھ بھی ہنسنے کے قابل نہیں ہوتا، بلکہ یہ بزلہ سنجی اور شرافت سے مملو ہوتا ہے۔ سو وہ یہ مفید مشورہ دینے پر طالب علم کے شکر گزار تھے، اور ان میں سے کسی نے — ہوسکتا ہے ورلین نے — دل کھول کر اس کی داد و تحسین کی۔

گئیٹے، کرستینا کو ملکہ بنا دیتا ہے

جب طالب علم اپنی نشست پر دوبارہ بیٹھ گیا، گیئٹے ایک دوستانہ تبسم کے ساتھ اس کی طرف ملتفت ہوا اور بولا، "اب دیکھیں، یہ لڑکا شاعری کے اسرار و رموز جانتا ہے!"

دوسرے اس وقت تک نشے میں دھت اپنی بحثا بحثی میں غرق ہو چکے تھے، سو طالب علم عظیم شاعر کے سامنے تنہا رہ گیا۔ وہ اس نایاب موقعے سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا، لیکن اچانک اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہے تو کیا۔ جب وہ بڑی بے جگری سے اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ جواب دینے کے لیے کوئی مناسب بات مل جائے، گیئٹے بس بیٹھا اسے متبسم نگاہی سے دیکھتا رہا، اور چونکہ اسے کوئی مناسب جواب سجھائی نہ دیا، اس نے بھی بس اتنا ہی کیا کہ جواباً گیئٹے کی طرف دیکھ کر مسکرا دے۔ معاً کرستینا کا خیال ذہن میں کوند گیا۔

"اِدھر کچھ دنوں سے میری ایک عورت سے ملاقاتیں ہو رہی ہیں، میرا مطلب ہے، ایک نوجوان عورت سے، جو ایک قصائی کی بیوی ہے۔"

گیئٹے کو یہ بات اچھی لگی اور وہ دوستانہ ہنسی ہنسا۔

"وہ آپ کی پرستش کرتی ہے۔ اس نے مجھے آپ کا ایک مجموعہ دستخط کرنے کے لیے

دیا ہے۔"

"اچھا تو دو۔" گیبیٹے نے کہا، اور لڑکے سے اپنی نظموں کی کتاب لے کر اس کا عنوان والا صفحہ نکالا۔ "مجھے اس کے بارے میں کچھ بتاؤ۔" اس نے بات جاری رکھی۔ "وہ دیکھنے میں کیسی لگتی ہے؟ کیا حسین ہے؟"

گیبیٹے کے آمنے سامنے طالبِ علم سے جھوٹ بولتے نہ بنی۔ اس نے اعتراف کیا کہ قصائی کی بیوی کوئی حور نہیں۔ بنا بریں، وہ سخت مضحکہ خیز لباس میں پراگ وارد ہوئی ہے۔ گردن میں موٹے موٹے منکوں کا ہار ڈالے اور پیروں میں ربڑ سے سیاہ پمپ چڑھائے، جن کا صدیوں سے رواج نہیں رہا، شہر بھر میں پھرتی رہی ہے۔

گیبیٹے بڑے اخلاص سے دلچسپی لے رہا تھا۔ "کیا کہنے۔" اس نے ناسٹلجیا کے شائبے کے ساتھ کہا۔

سو طالبِ علم کی ہمت بڑھی اور اس نے مزید اعتراف کیا کہ قصائی کی عورت کے منہ میں ایک دانت سونے کا ہے جو کسی سنہری مکھی کی طرح دمکتا ہے۔

گیبیٹے خوب دل کھول کر ہنسا اور طالبِ علم سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گیا۔ "کسی اکیلے نگینے کی طرح۔"

"مینارۂ نور کی طرح۔" طالبِ علم ہنسا۔

"ستارے کی طرح۔" گیبیٹے مسکرایا۔

قصائی کی جورو دراصل چھوٹے سے قصباتی شہروں کی عام سی مخلوق تھی، طالبِ علم نے بتایا، لیکن اس کی اسی صفت نے اسے اپنی طرف جذب کیا تھا۔

"اور میں تمھاری بات خوب سمجھتا ہوں۔" گیبیٹے بولا۔ "بے جوڑ لباس، قدرے ناقص دانتوں کا چوکھٹا، اور روح کی دل آویز پیش پا افتادگی — یہی تو وہ جزئیات ہیں جو عورت کو حقیقی اور جاندار بناتی ہیں۔ وہ عورتیں جو تمھیں اشتہاروں یا فیشن کے رسالوں میں نظر آتی ہیں — وہی جن کی آج کل ساری عورتیں نقل اتارنے کی کوشش میں جٹی ہیں — ان میں بھلا دلکشی کہاں؟ ان کی کوئی ذاتی حقیقت نہیں؛ وہ تو بس تجریدی اصولوں کے ایک دستے کا حاصل جمع ہیں۔ وہ انسانی جسموں سے پیدا نہیں ہوئی ہیں؛ ہر روز کمپیوٹروں سے بنی بنائی نکل پڑتی

ہیں۔ میرے دوست، میں تمھیں بتاتا ہوں، تمھاری چھوٹے سے قصباتی شہر کے قصائی کی جورو شاعر کے نزدیک مکمل عورت ہے۔ مبارک ہو!"

وہ عنوان والے صفحے پر جھکا، قلم نکالا، اور لکھنا شروع کیا۔ وہ وجد کے عالم میں تھا، ایک بےخودی سی طاری تھی، اس کا چہرہ محبت اور تفہیم سے گلنار ہو رہا تھا۔ اس نے پورا صفحہ بھر ڈالا۔

کتاب واپس لیتے ہوئے طالب علم مارے فخر کے سرخ ہوا جا رہا تھا۔ گیئٹے نے ناشناسا عورت کے لیے جو الفاظ لکھ دیے تھے ان میں حسن اور غم انگیزی تھی، ناسٹلجیا اور بڑی جاندار حسیت، مزاح اور ہوش مندی۔ طالب علم کو یقین تھا کہ ان سے زیادہ خوبصورت الفاظ میں پہلے کبھی کسی عورت کو مخاطب نہیں کیا گیا ہے۔ وہ اس عورت کے خیال پر بے چین ہو گیا۔ اس کے سوقیانہ، مضحکہ خیز لباس پر شاعری نے بڑی پرشکوہ ردا ڈال دی تھی۔ وہ ملکہ میں بدل گئی تھی۔

شاعر زینے سے اترتے ہوئے

اگلی بار جب ویٹر داخل ہوا تو نئی بوتل لے کر نہیں آیا تھا، بلکہ شاعروں سے یہ کہنے آیا تھا کہ اب رخصت کا ارادہ کریں۔ عمارت چند لمحوں میں بند ہونے والی ہے، اور عمارت کی دیکھ بھال پر مامور شخص دھمکی دے رہا ہے کہ انھیں صبح تک کے لیے اندر بند کر کے گھر چلتا بنے گا۔

ویٹر کو یہ تنبیہ کئی بار دہرانی پڑی — اونچے سروں میں، اور مدھم سروں میں، سبھوں کو ایک ساتھ، اور ہر ایک کو فرداً فرداً — تب کہیں جا کر شاعروں کو احساس ہوا کہ وہ حقیقتاً مذاق نہیں کر رہا تھا۔ پٹرارک کو دفعتاً سرخ نیگلے جے میں بیوی کا پیکر نظر آیا اور کرسی سے یوں اچھلا جیسے کسی نے پیچھے سے لات رسید کر دی ہو۔

معاً گیئٹے نے بیکراں غم و اندوہ کی آواز میں کہا۔ "تم لوگ جاؤ۔ مجھے یہیں چھوڑ دو۔ میں یہیں رہوں گا۔" انھوں نے اس کے برابر میز سے ٹکی بیساکھیوں پر نظر ڈالی اور ان کے ساتھ ہی چلے چلنے پر راضی کرنے کی کوشش کی، لیکن اس نے بس انکار میں سر ہلا دیا۔

وہ سب اس کی بیوی سے واقف تھے، جو سخت مزاج اور چڑچڑی عورت تھی، اور اس سے ڈرتے تھے۔ انھیں پتا تھا کہ اگر گیئٹے وقت پر گھر واپس نہیں آیا تو وہ وہیں سب کے

سامنے اچھا خاصا ہنگامہ برپا کردے گی۔ "یوحان، عقل سے کام لو" انھوں نے منت سماجت کی۔ "تمھیں گھر جانا ہی ہوگا۔" انھوں نے اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر بڑی احتیاط سے اسے کرسی سے اٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن شاہِ اولمپس [خدائے سخن] کافی وزنی تھا اور ان کے ہاتھ بقدرِ جرأت کوتاہ۔ وہ عمر میں ان سے کم از کم تیس سال بڑا تھا اور ان کے باپ کی جگہ تھا، اور اب اسے اٹھاتے ہوئے اور اس کے ہاتھوں میں بیساکھیاں تھماتے ہوئے وہ بڑی بے چینی اور اپنے کو خفیف محسوس کررہے تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ مسلسل وہیں ٹھہرے رہنے کی گردان کیے جارہا تھا۔

کوئی بھی اسے وہاں نہیں رہنے دینا چاہتا تھا، لیکن لیرمنتوف نے موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھیں جتایا کہ وہ ان سب کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوشیار ہے۔ "کیوں نہ اسے یہیں پڑا رہنے دیں؟ میں صبح تک اس کی رکھوالی کرتا رہوں گا۔ دیکھتے نہیں؟ جب یہ جوان تھا تو مسلسل ہفتوں گھر سے دور رہتا تھا۔ بس یہی تو چاہتا ہے کہ اپنی جوانی لوٹا لائے! احمقو، تم نہیں دیکھتے؟ ہاں تو کیا خیال ہے، یوحان؟ اگر ہم دونوں بوتل لیے یہیں غالیچے پر پسر جائیں اور صبح تک روپوش رہیں تو کیسی رہے گی؟ باقی سارے جائیں جہنم میں، اور پٹرارک اپنے سرخ نیکلے جے اور لہراتی ہوئی سنہری زلفوں کے پاس واپس جاتا رہے!"

لیکن والتیئر جانتا تھا کہ یہ گم گشتہ جوانی کی بازیافت نہیں تھی جو گیئٹے کو گھر لوٹنے سے روکے ہوئے تھی۔ گیئٹے بیمار تھا، اسے پینے کی ممانعت تھی۔ اور اگر پی لیتا تھا، تو اس کی ٹانگیں اس کا بوجھ اٹھانے سے تائب ہوجاتی تھیں۔ والتیئر نے دونوں بیساکھیاں سنبھال لیں اور بقیوں سے کہا کہ اپنے لحاظ وحاظ کو بالائے طاق رکھیں۔ سو شاعروں کے ناتواں بازوؤں نے گیئٹے کی بغلیں تھامیں اور اسے کرسی سے بلند کردیا۔ پھر وہ اسے اٹھا کر، یا بلکہ گھسیٹ کر لائے (گاہے گیئٹے کے پیر فرش سے جا لگتے، گاہے اس کے اوپر کسی بچے کی طرح جھولنے لگتے جیسے ماں باپ آگے پیچھے جھلا رہے ہوں)، کمرا عبور کیا اور ڈیوڑھی میں داخل ہوئے۔ لیکن گیئٹے بہت وزنی تھا اور شاعر حضرات مست، سو انھوں نے ڈیوڑھی کی نصف مسافت پر ہی اسے فرش پر نیچا کردیا۔ "دوستو" اس نے آہ و بکا کی، "خدارا مجھے یہیں مرجانے دو، ٹھیک اسی جگہ پر۔"

والتیئر آپے سے باہر ہوگیا اور سبھوں پر چلایا کہ اسے فوراً دوبارہ اٹھالیں۔ یکلخت شاعروں کو ندامت محسوس ہوئی۔ بعضوں نے گیبٹے کے بازو پکڑ لیے، بعض دوسروں نے اس کی ٹانگیں، اور یوں اسے اٹھائے اٹھائے ڈیوڑھی سے ہوتے ہوئے زینے پر پہنچے۔ سبھوں نے ساتھ مل کر اسے اٹھایا۔ والتیئر نے اٹھایا، پٹرارک نے اٹھایا، ورلین نے اٹھایا، بکاچیو نے اٹھایا، اور یہاں تک کہ یاسنین، جو خود بہت ڈگمگا رہا تھا، گیبٹے کی ٹانگوں کو تھامے رہا، اب یہ اور بات ہے کہ یہ تھامنا صرف خود کو گرنے سے بچانے کے لیے تھا۔

طالبِ علم نے بھی مدد کرنے کی کوشش کی۔ اسے معلوم تھا کہ یہ ایسا موقع ہے جو زندگی میں ایک بار ہی ہاتھ آتا ہے۔ لیکن عاجز رہا۔ لیرمنتوف اس سے بڑی وابستگی محسوس کرنے لگا تھا۔ اس نے اس کا بازو مضبوطی سے گرفت میں لیا ہوا تھا اور اس سے بات کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ ڈھونڈ نکالتا رہا۔

"ان میں صرف لطافت ہی کی کمی نہیں،" وہ طالبِ علم سے کہہ رہا تھا، "یہ تو سلیقے سے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اماں جان کے بچے، اور کیا؟ ذرا دیکھو تو، اسے کیسے اٹھایا ہوا ہے۔ گرا کر دم لیں گے، اس میں کیا شک ہے؟ انھوں نے کب اپنے ہاتھوں سے کوئی کام کیا ہے؟ تمھیں معلوم ہے، میں ایک زمانے میں فیکٹری میں کام کرتا تھا؟"

(ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اُس عہد اور ملک کے تمام سورماؤں نے کسی نہ کسی فیکٹری میں اپنے حصے کا کام کیا تھا، رضاکارانہ — انقلابی وفور کے باعث — یا جبراً، سزا کے طور پر۔ دونوں صورتوں میں وہ یکساں فخر محسوس کرتے تھے۔ ان کی دانست میں فیکٹری میں کام کر کے انھوں نے 'محنت کش زندگی' کی بلند مرتبت دیوی سے اپنے لیے ذاتی بوسے کا حق حاصل کر لیا تھا۔)

شاعر اپنے دیوتائے سخن کو ہاتھ پانو سے اٹھائے زینے سے نیچے لائے۔ زینے کا نقشا چوکور تھا۔ اس کے بہت سے موڑ زاویۂ قائمہ جیسے تھے، اور ان پر مڑنا مخصوص طاقت اور مہارت کا طلبگار تھا۔

"لڑکے، جانتے ہو موٹے موٹے شہتیر اٹھانے میں ٹیس بول جاتی ہے؟" لیرمنتوف نے بات جاری رکھی۔ "تم نے یہ کام کبھی کیا نہیں، طالبِ علم جو ہو۔ لیکن انھوں نے بھی نہیں کیا۔

ذرا دیکھو تو، کس بری طرح اسے اٹھائے ہوئے ہیں! وہ گر پڑے گا!" وہ ان کی طرف مڑا اور چلایا، "اسے دوسری طرف موڑو، احمقو! اسی طرح بڑھے تو وہ گر جائے گا! تم لوگوں نے کبھی اپنے ہاتھ استعمال نہیں کیے!" اور طالب علم کی بانہوں میں بانہیں ڈالے، وہ ڈگمگاتے شاعروں کے پیچھے آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترنے لگا جن کا عذاب گیبیلے کے بڑھتے ہوئے بوجھ کے تناسب سے بڑھتا جا رہا تھا۔ بالآخر وہ اسے نکال کر فٹ پاتھ پر بجلی کے کھمبے کے پاس لائے۔ پٹرارک اور بکاچیو اسے ڈھے پڑنے سے سنبھالے رہے، جبکہ والتیئر سڑک پر ٹیکسی رکوانے کے لیے نکل گیا۔

"تمھیں اس کا احساس بھی ہے کہ کس چیز کا مشاہدہ کر رہے ہو؟" لیرمنتوف نے لڑکے سے کہا۔ "تم ایک طالبِ علم ہی ہو، کیا جانو زندگی کس چیز کا نام ہے، لیکن یہ کیسا زبردست منظر ہے! نزولِ شاعر۔ کچھ اندازہ ہے، اس خیال پر نظم لکھی جائے تو کیسی بے پناہ ہوگی؟"

دریں اثنا گیبیلے پھسل کر زمین بوس ہو چکا تھا اور پٹرارک اور بکاچیو نے اسے سہارا دے کر پھر کھڑا کر دیا تھا۔

"دیکھ رہے ہو؟" لیرمنتوف نے لڑکے سے کہا۔ "ان کے بازو اتنے ناتواں ہیں کہ اسے سیدھا کھڑا بھی نہیں رکھ سکتے۔ انھیں زندگی کی کیا خبر؟ 'نزولِ شاعر' ایک شاندار عنوان، کیا خیال ہے تمھارا؟ میں ان دنوں دو کتابوں پر کام کر تا رہا ہوں، دو بالکل مختلف کتابیں۔ ایک ہیئت میں خالص کلاسیکی ہے: مقفاّ، واضح بحر۔ دوسری آزاد، غیر مقفاّ۔ میں اس کا نام Poetic Reports رکھوں گا۔ آخری نظم ہوگی 'نزولِ شاعر'، اور یہ بڑی گمبھیر نظم ہوگی۔ گمبھیر لیکن دیانتدار۔ 'دیانتدار'۔"

یہ تیسرا لفظ تھا جو لیرمنتوف نے آئی ٹیلکس میں ادا کیا تھا۔ یہ تمام ان چیزوں کی ضد تھا جو محض ٹیپ ٹاپ اور بزلہ سنجی تھی۔ اس کا مفہوم پٹرارک کے خوابوں اور بکاچیو کے کھیل تماشوں کی ضد تھا۔ اس کا مفہوم محنت و مشقت کی رقت آفرینی اور 'محنت کش زندگی' کی مذکورہ دیوی میں پرجوش ایمان تھا۔

ورلین، جسے رات کی ہوا نے مدہوش کر دیا تھا، فٹ پاتھ پر کھڑا آسمان کی طرف سر اٹھائے گا رہا تھا۔ یاسنین عمارت کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھا سو رہا تھا۔ والتیئر، جو ہنوز سڑک

پر کھڑا ہاتھ ہلا رہا تھا، بالآخر ٹیکسی رکوانے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے پٹرارک کو ڈرائیور کے برابر بٹھانے کی کوشش کی۔ اگر کوئی مسز گیبیٹے کی تشفی کرانے کا امکان رکھتا تھا تو یہ بس پٹرارک ہی تھا۔ لیکن پٹرارک بڑی بے جگری سے اپنی مدافعت کرنے لگا۔ "میں ہی کیوں؟ میری تو اُس سے سٹی گم ہوجاتی ہے!"

"دیکھا؟" لیرمنتوف نے طالبِ علم سے کہا۔ "جب دوست کی دست گیری کا وقت آتا ہے، تو یہ دُم دبا کر دوسری طرف بھاگ نکلتا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی اُس کی بیوی سے بات کرنے کا اہل نہیں۔" وہ گاڑی پر جھکا۔ گیبیٹے، بگاچیو، اور والتیئر سب کے سب پچھلی نشست میں بھنچے بیٹھے تھے۔ "دوستو،" وہ بولا، "میں بھی تمھارے ساتھ چل رہا ہوں۔ مسز گیبیٹے کو مجھ پر چھوڑو۔" اور وہ کود کر ڈرائیور کے برابر والی نشست پر بیٹھ گیا۔

پٹرارک، بگاچیو کی ہنسی پر نکتہ چینی ہوتا ہے

جب شاعروں سے لدی پھندی ٹیکسی فاصلے میں معدوم ہوگئی، لڑکے کو خیال آیا کہ کرستینا کے پاس واپس پہنچنا بہتر ہوگا۔

"اچھا، تو اب میں اپنی راہ لیتا ہوں،" اس نے پٹرارک سے کہا۔

پٹرارک نے سر ہلا دیا، اس کا بازو پکڑا، اور اس کے ساتھ غلط سمت میں چل پڑا۔

"جانتے ہو، تم بڑی تیز بصیرت کے مالک ہو،" وہ بولا۔ "صرف تمھی اس حالت میں تھے کہ سبھوں کی بات سنو۔"

"وہ لڑکی جو کمرے کے بیچوں بیچ شمشیر بکف جون اوف آرک کی طرح کھڑی ہوئی تھی — ہاں، میں سب دہرا سکتا ہوں، لفظ بلفظ۔"

"اور یہ ٹھرّا اچٹ، انھوں نے مجھے اپنی بات بھی نہیں ختم کرنے دی! انھیں اپنے سوائے کسی کی فکر نہیں۔"

"یا جب تمھاری بیوی پر یہ خوف طاری تھا کہ لڑکی تمھیں مار ڈالے گی اور جب تم اس کے پاس آئے اور اس پر سماوی سکون چھا گیا۔ یہ ایک چھوٹے موٹے معجزے کی طرح تھا۔"

"شاعر تو 'تم ہو' میرے دوست۔ تم، وہ نہیں۔" پٹرارک طالب علم کو شہر کی دوسری طرف اپنے اپارٹ مینٹ کی سمت میں لے جارہا تھا۔ "تو معاملہ کیسے ختم ہوا؟" طالب علم نے پوچھا۔

"بیوی کو اس پر ترس آ گیا اور اسے رات ہمارے یہاں ہی گزارنے دی۔ جانتے ہو کیا ہوا؟ میری ساس، جو باورچی خانے کے پرلی طرف کاٹھ کباڑ رکھنے والے کمرے میں سوتی ہے، منہ اندھیرے اٹھنے کی عادی ہے۔ جب اس نے دیکھا کہ ساری کھڑکیاں ٹوٹی پڑی ہیں، تو وہ باہر نکلی اور چند شیشہ لگانے والوں کو بلا لائی جو برابر کی عمارت میں کام کر رہے تھے، اور ہمارے بیدار ہونے سے پہلے ہی سارے شیشے جڑ چکے تھے۔ گذشتہ رات کی تخریب کا ادنیٰ سا نشان بھی باقی نہیں بچا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے سارا عمل خواب میں واقع ہوا ہو۔"

"اور لڑکی؟" طالبِ علم نے پوچھا۔

"وہ صبح ہونے سے پہلے ہی کھسک لی۔"

پٹرارک ایک دَم سڑک کے بیچ ٹھہر گیا اور اسے تقریباً عداوت کی نظر سے دیکھا۔ "جان لو، میرے دوست، اگر تم نے یہ سمجھا کہ میری کہانی کی انتہا بھی بگّاچیو کی حکایات کی طرح بستر ہی میں ہوئی ہوگی تو مجھے بہت برا لگے گا۔ ایک چیز ہے جو تمھیں جان لینی چاہیے۔ بگّاچیو پرلے درجے کا حرامی ہے۔ بگّاچیو کبھی کسی کو نہیں سمجھتا، کیونکہ سمجھنے کا مطلب گھل مل جانا ہے، یگانگت ہے۔ شاعری کا سارا راز یہی ہے۔ ہم جس عورت کی پرستش کرتے ہیں اسی کی آگ میں جلتے ہیں، جس خیال کی پرورش کرتے ہیں اسی میں جھلس جاتے ہیں، جس منظر سے متاثر ہوتے ہیں وہی ہمیں شعلہ زن کر دیتا ہے۔"

پٹرارک کو گرم جوشی سے سنتے ہوئے، طالبِ علم کو اپنی کرستینا کا پیکر نظروں کے سامنے تیرتا ہوا لگا۔ صرف چند گھنٹے پہلے ہی وہ اس پر شک کر رہا تھا۔ اب ان شکوک پر ندامت محسوس ہوئی۔ ان شکوک کا تعلق اس کی شخصیت کے بدترین (بگّا چوانہ) پہلو سے تھا۔ یہ اس کی بزدلی کا ثمر تھے، اس کی دلیری کا نہیں۔ انھوں نے اس پر بالکل واضح کر دیا تھا کہ وہ محبت کے تعلق میں روح و جان سے داخل ہوتے ہوئے کس قدر ڈر رہا تھا، اس عورت کی آگ میں جس سے محبت تھی جلنے سے کتنا خوفزدہ تھا۔

"عشق شاعری ہے، شاعری عشق ہے،" پٹرارک نے کہا، اور طالبِ علم نے اپنے سے

عہد کیا کہ وہ کرستینا سے ایسی محبت کرے گا جو نہ صرف عظیم ہوگی بلکہ ہمہ گیر بھی۔ اول اول گیئیٹے نے کرستینا کو شاہی پوشاک پہنا دی تھی، اب پٹرارک نے اس کے دل میں آگ بھر دی تھی۔ آنے والی رات کو دونوں شاعروں کی رحمتیں حاصل تھیں۔

"دوسری طرف،" پٹرارک نے بات جاری رکھی، "خندہ وہ دھماکا ہے جو ہمیں دنیا سے نوچ کر جدا کر دیتا ہے اور ٹھٹھری ہوئی تنہائی میں ڈال دیتا ہے۔ مذاق آدمی اور دنیا کے درمیان رکاوٹ کی طرح ہوتا ہے۔ مذاق عشق اور شاعری دونوں کا دشمن ہوتا ہے۔ سو مجھے دوبارہ کہنے دو — اور اسے کبھی نہ بھولنا — بکّاچیو محبت کے بارے میں صفر نہیں جانتا۔ محبت لائقِ خندہ نہیں ہوتی۔ محبت کا ٹھٹھول سے کوئی علاقہ نہیں۔"

"ہاں!" لڑکے نے بڑی گرم جوشی سے کہا۔ اسے دنیا دو میں منقسم نظر آئی: نصف عشق، نصف مذاق۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا تعلق پٹرارک کے لشکر سے ہے، اور ہمیشہ رہے گا۔

ملائک طالبِ علم کے صوفے کے گرد منڈلاتے ہیں

وہ نہ اعصابی ہیجان کے عالم میں کمرے میں چکر لگاتی رہی تھی نہ برہمی سے بے قابو ہوئی تھی، نہ منہ پھلایا تھا اور نہ کھڑکی سے لگی بیٹھی فراق میں گھلتی رہی تھی۔ وہ تو نائٹ گاؤن چڑھائے اُس کے کمبل میں سمٹی سمٹائی پڑی تھی۔ اس نے اس کے ہونٹوں پر بوسہ دے کر اسے جگا دیا، اور اس کی ممکنہ لعن طعن کو پہلے ہی سے فرو کرنے کے لیے اس بے پناہ محفل کے واقعات جلدی جلدی بیان کرنے لگا جس میں بکّاچیو اور پٹرارک نے اتنے ڈرامائی انداز میں پنجہ کشی کی تھی اور لیرمنتوف نے سارے شاعروں کو ناراض کر دیا تھا۔

عورت نے اس کے بیان میں کسی دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا اور بے اعتباری سے اس کی بات کاٹ دی۔ "شرطیہ کہتی ہوں کہ تم کتاب کے بارے میں سب بھول بھال گئے ہوگے۔"

جب اس نے کتاب اسے تھما دی جس پر گیئیٹے نے بڑا طول طویل انتساب لکھا تھا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اس نے ان انہونی تخیلی پروازوں کو بار بار شروع سے آخر تک پڑھا۔ ان میں طالبِ علم کے ساتھ خود اس کی اپنی اتنی ہی انہونی مہمات کی جیسے تجسیم

ہوگئی تھی: ان کی گرمیوں کی ملاقاتیں، بنوں کے نادر یافتہ راستوں پر ان کی خفیہ ٹہلیں، وہ تمام نزاکت اور گدازی جو اس کی زندگی سے اس قدر دور افتادہ تھی۔

اس درمیان میں طالبِ علم کپڑے اتار کر بستر میں اس کے پہلو میں آ گیا تھا۔ عورت نے اسے اپنے سینے سے لگا کر بھینچا۔ یہ ایسی ہم آغوشی تھی جس کا تجربہ اسے آج سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ جاندار، مخلص، پر شوق، ایک ماں، ایک بہن، ایک دوست کی ہم آغوشی کی طرح، اور شہوت بھری۔ اس شام لیرمنتوف نے "دیانتدار" کا لفظ بار بار استعمال کیا تھا، اور طالبِ علم کو لگا کہ عورت کی ہم آغوشی کے لیے اس سے بہتر کوئی اور مرکب لفظ نہیں ہوسکتا، کہ اس میں ان گنت صفات در آئی تھیں۔

طالبِ علم کے جسم نے اسے بتا دیا کہ وہ غیر معمولی طور پر جفتی کے لیے مائل ہے۔ یہ جسم اتنی قابلِ بھروسا، پائدار، اور مستعد حالت میں ہے کہ اسے جلد بازی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، اور اس نے اِس طویل، لذّت بھری، بے حرکت ہم آغوشی سے خوب خوب حظ اٹھایا۔

پہلے پہلے عورت نے اسے فرانسیسی طرز کے گہرے گہرے، شہوت آمیز بوسے دیے، پھر بہنوں کے انداز میں اس کے سارے چہرے کو سرسری سا چوما۔ عورت کے سونے کے دانت کو زبان سے تھپ تھپاتے ہوئے لڑکے کو گیٹے کے لفظ یاد آ گئے: وہ کمپیوٹر سے بنی بنائی نہیں پیدا ہوگئی تھی، وہ تو انسانی جسم سے نکلی تھی! وہ عورت تو شاعر کے لیے تخلیق ہوئی تھی! اس کا جی خوشی سے چلانے کو چاہا۔ پھر اس نے پٹرارک کے بیان پر غور کیا جس کے مطابق عشق شاعری تھا اور شاعری عشق اور سمجھنے کا مطلب اپنے شریک کے ساتھ گھل مل جانا اور اس کی آگ میں جلنا تھا۔ (ہاں، تینوں شاعر ہی وہاں اس کے ساتھ تھے، فرشتوں کی طرح اس کے پلنگ کے اوپر منڈلا رہے تھے — گا رہے تھے، خوشیاں منا رہے تھے، اور اس پر اپنی برکتیں نثار کر رہے تھے۔) اب طالبِ علم وفورِ جذبات سے اتنا مغلوب ہوگیا تھا کہ اس نے بے حرکت ہم آغوشی کی لیرمنتوفانہ دیانتداری سے خود محبت کے عمل کی طرف بڑھنا چاہا۔ وہ کرستینا کے جسم کی طرف پلٹا اور اس کی ٹانگوں کو اپنے گھٹنوں سے پھیلانے کی کوشش کی۔

لیکن یہ کیا؟ کرستینا مزاحمت کر رہی ہے! وہ ٹانگوں کو اسی ہٹ دھرمی سے باہم جوڑے رکھتی ہے جس سے گرمیوں میں بنوں میں اپنی سیروں کے درمیان!

وہ اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ آخر کیوں، لیکن اس پر اپنے کو آمادہ نہ کر سکا۔ کرستینا اتنی کم آمیز تھی، اتنی نازک کہ محبت کی عملیات اس کے سامنے اپنے نام تک کھو بیٹھیں۔ وہ صرف اسی کے استعمال کی جرأت کر سکتا تھا جو تنفس اور لمس کی زبان سے ادا ہو سکے۔ کیا یہ بے ہنگم الفاظ سے آگے کی چیز نہیں تھے؟ کیا وہ اس کی آگ میں نہیں جل رہا تھا؟ کیا وہ دونوں ایک ہی شعلے میں فروزاں نہیں تھے؟ سو اس نے بار بار بڑی ہٹیلی خاموشی میں گھٹنوں کو اس کی مضبوطی سے بھنچی ہوئی رانوں کے درمیان بزور ڈالنے کی کوشش کی۔

وہ بھی خاموش تھی، اسے بھی بولنے سے خوف آ رہا تھا؛ اپنے موقف کو صرف بوس و کنار ہی سے واضح کر دینا چاہتی تھی۔ لیکن جب پچیسویں بار اس نے اس کی رانوں کو کھینچ کر جدا کرنے کی کوشش کی — جو خاصی جارحانہ تھی — تو اس نے یہ کہہ ہی دیا، "نہیں، براہ کرم نہیں۔ یہ مجھے مار دے گا۔"

"کیا؟" اس نے کہا، گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے۔

"یہ مجھے مار کر رکھ دے گا۔ سچ مچ" اس نے دہرایا، اور اسے ایک اور بار بڑی شدت سے چوما اور رانوں کو اور مضبوطی سے بھینچ لیا۔

طالبِ علم کو ملی جلی مایوسی اور سعادت کا احساس ہوا۔ ایک طرف، اس کے ساتھ مباشرت کی بڑی شدید خواہش محسوس ہو رہی تھی؛ دوسری طرف، وہ اس خیال پر خوشی کے مارے رو سکتا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتی تھی، اتنی کہ پہلے کسی اور نے کبھی نہیں کی تھی۔ وہ اتنی زیادہ محبت کرتی تھی کہ اس کے وفور سے مر سکتی تھی؛ اتنی زیادہ کہ اس کے ساتھ ہم بستری کرنے سے خوفزدہ تھی؛ اگر کرتی تو وہ کبھی اس کے بغیر زندہ نہ رہ سکتی، اشتیاق و خواہش سے مر جاتی۔ وہ خوش تھا، وفورِ سعادت سے نہال۔ یک بیک، غیر متوقع طور پر، بغیر استحقاق کے، اسے وہ سب کچھ مل گیا تھا جس کی اس نے کبھی خواہش کی تھی — وہ ناپیدا کنار محبت جس کے دوارے سارا کرۂ ارض اپنی ساری تری اور خشکی سمیت کچھ بھی نہیں۔

"میں سمجھتا ہوں۔ میں بھی بالکل یہی محسوس کر رہا ہوں!" اس نے عورت سے سرگوشی میں کہا، اسے تھپتھپاتے اور چومتے ہوئے، وفورِ محبت سے تقریباً روتے ہوئے۔ لیکن یہ تمام نرم و نازک جذبات اس کی جسمانی خواہش کی تسکین کے لیے کچھ نہ کر سکے، جو بڑی تکلیف دہ ہوتی

جارہی تھی، تقریباً نا قابلِ برداشت۔ سو وہ گھٹنا اس کی رانوں میں داخل کرنے کی مسلسل تگ و دو کرتا رہا تا کہ اس کے نسوانی اعضا تک پہنچنے کے لیے کوئی راہ بنالے، جو اس کے لیے اُس لمحے ہولی گریل[1] سے بھی زیادہ اسرا کے حامل تھے۔

"نہیں تم نہیں کررہے۔ تم نہیں؛ یہ تمھارے ساتھ پیش نہیں آئے گا۔ یہ صرف مجھے ہی مار ڈالے گا!" کرستینا نے کہا۔

اس نے ایسی شہوانی لذت کا تصور کیا جو اپنی بے کرانی میں اسے مار ڈالنے کے لیے کافی تھی، اور بار بار "ہم ساتھ ساتھ مریں گے! چلو ساتھ ساتھ مرجائیں!" کی سرگوشی کرتے ہوئے وہ پیہم گھٹنے سے اس کی رانیں جدا کرنے کی ناکام جستجو کرتا رہا۔

ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ اور باقی نہیں رہا تھا۔ بس یہی کر سکتے تھے کہ ایک دوسرے سے چمٹے رہیں، وہ سر ہلاتی رہی، اور طالبِ علم اس کی رانوں کے قلعہ پر مسلسل یورش کرتا رہا۔ انجام کار اس نے ہتھیار ڈال دیے اور فرماں برداری سے اس کے پہلو میں پیٹھ کے بَل کروٹ بدل لی۔ فوراً ہی عورت نے اس کی محبت کے عفریت کو دبوچ لیا، اپنے وقار میں راست باز، اور اپنی تمام تر شاندار دیانتداری سے اسے دبایا: مضبوطی سے، اخلاص سے، اشتیاق سے، ایک ماں کی طرح، ایک بہن کی طرح، ایک دوست کی طرح — اور گرم جوشی سے۔

طالبِ علم کو بے کنار عشق کی سعادت اور ٹھکرائے ہوئے جسم کی بے کسی دونوں ہی محسوس ہوئے۔ قصائی کی بیوی نے اس کے ہتھیار کو گرفت سے نکلنے نہیں دیا، لیکن دو ایک سادہ سی جنبشوں کے بجائے جو اس جسمانی عمل کی انگیخت کے لیے بہت کافی ہوتیں جس کے لیے وہ تڑپ رہا تھا، وہ اسے اپنے ہاتھ میں یوں تھامے رہی جیسے یہ کوئی نایاب چیز ہو، کوئی قیمتی چیز، ایسی چیز جس کو بڑی لمبی مدت تک محفوظ رکھا جائے، استادہ اور سخت۔

لیکن اب اس رات کا ذکر چھوڑنا چاہیے جو تقریباً صبح تک بغیر کسی ٹھوس تبدیلی کے قائم رہی۔

[1]۔ Holy Grail: وہ پیالہ جو حضرت مسیح نے عشائے آخری میں استعمال کیا تھا؛ کوئی مطلوبہ شے جس کی جستجو کی جائے۔

صبح کی گدلی روشنی

چونکہ وہ رات بڑی دیر سے سوئے تھے، اگلے دن دوپہر کے قریب بیدار ہوئے۔ دونوں کے سر درد کر رہے تھے۔ رفاقت کے لیے بہت وقت باقی نہیں بچا تھا کیونکہ کرستینا کی ریل گاڑی جلدی ہی کوچ کرنے والی تھی۔ انھوں نے کوئی بات چیت نہیں کی۔ کرستینا نے نائٹ گاؤن اور گیٹے کا مجموعہ بیگ میں رکھ لیا، اپنے ناقابلِ برداشت کالے پمپ جوتے پہنے اور ناقابلِ برداشت ہار گلے میں ڈال لیا۔

جیسے صبح کی گدلی روشنی نے مہرِ سکوت توڑ ڈالی تھی اور شاعرانہ رات کے بعد نثر کا دن چلا آیا تھا، کرستینا نے طالبِ علم سے بالکل بے لاگ انداز میں کہا، "امید ہے کہ تم گزری رات پر خفا نہیں ہوگے۔ واقعی، اس نے مجھے مار ڈالا ہوتا۔ ڈاکٹر نے پہلا بچہ ہونے کے بعد کہہ دیا تھا کہ اب کبھی حاملہ نہ ہوں۔"

"تو تمھارا واقعی یہ خیال ہے کہ میں نے تمھیں حاملہ کر دیا ہوتا؟" لڑکے نے بڑی مایوس نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم آخر مجھے کیا سمجھتی ہو؟"

"سب یہی کہتے ہیں۔ انھیں ہمیشہ خود پر بڑا اعتماد ہوتا ہے۔ مجھے اپنی سہیلیوں کا حشر اچھی طرح معلوم ہے۔ اور تم جیسے نوجوان، تو یہ سب سے زیادہ خطرناک نکلتے ہیں۔ اور جب یہ ہوتا ہے، معاملہ ٹھپ۔"

اس نے عورت سے بڑی یاس بھری آواز میں کہا کہ اسے ان باتوں کا کافی تجربہ ہے اور اس نے کبھی اسے حاملہ نہیں کیا ہوتا۔ "اب تم مجھے بھی ان نتھو خیروں کے زمرے میں تو نہیں ڈال رہیں جن کے ساتھ تمھاری سہیلیاں مٹرگشت کرتی پھرتی ہیں، یا ڈال رہی ہو؟"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو" اس نے تقریباً اعتذاریہ لہجے میں کہا۔ طالبِ علم نے اپنی بات بالکل واضح کر دی تھی۔ عورت کو اس پر اعتبار تھا۔ وہ کوئی گاؤدی نہیں تھا اور محبت کی نزاکتوں کو دنیا کے سارے مستریوں سے بہتر سمجھتا تھا۔ شاید اتنی زیادہ مزاحمت کر کے اس نے غلطی کی تھی۔ لیکن اسے اس پر افسوس نہیں تھا۔ ایک چھین جھپٹ والی مجامعت (کرستینا جسمانی محبت کا تصور صرف عجلت اور اختصار کی حدود ہی میں کر سکتی تھی) کا اپنا مزہ تھا، لیکن یہ

خطرناک ثابت ہوسکتی تھی اور اسے بے وفا محسوس کرواسکتی تھی۔ جو رات اس نے طالب علم کے ساتھ گزاری تھی وہ کہیں زیادہ بہتر تھی۔

اس وقت بھی جب وہ اسٹیشن کے راستے میں تھے، وہ اپنے ڈبے میں بیٹھنے اور اس تمام واردات کو ذہن میں دہرانے کا انتظار کررہی تھی۔ ایک سادہ سی عورت کی بے لاگ اَنا کے ساتھ وہ مسلسل اپنے کو جتاتی رہی کہ اس نے ایسی چیز کا تجربہ کیا تھا جسے 'کوئی بھی اس سے چھین نہیں سکتا تھا': اس نے ایک لڑکے کے ساتھ شب باشی کی تھی جو اسے ہمیشہ موہوم، گریزپا، دورافتادہ معلوم ہوا تھا، اور جس کے استادہ عضو کو پکڑے پکڑے پوری رات بتادی تھی۔ ہاں، پوری رات! تو یہ ایسی چیز تھی جو اس نے پہلے کبھی تجربہ نہیں کی تھی! ہوسکتا ہے کہ وہ اب کبھی اس سے نہ مل سکے، لیکن اس نے اس سے مسلسل ملتے رہنے کی توقع بھی تو نہیں کی تھی۔ وہ اس پر خوش تھی کہ اس کے پاس کم از کم ایک مستقل چیز تو ایسی تھی جس سے وہ اسے یاد رکھ سکے: گیئٹے کا مجموعہ اور وہ اس کا ناقابلِ یقین انتساب، اس بات کا قطعی ثبوت کہ اس کی مہم جوئی کوئی خواب نہیں تھی۔

دوسری طرف لڑکا دل شکستگی کے عالم میں تھا۔ کاش اس نے ایک ہی معقول جملہ کہہ دیا ہوتا، اس سے کھری کھری بات کی ہوتی، تو اسے عورت کے ساتھ جفتی نصیب ہوجاتی۔ وہ تو اس سے ڈر رہی تھی کہ کہیں پیٹ نہ رہ جائے، اور وہ یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ یہ ان کی محبت کے افق کی بیکرانی تھی جس نے اسے خوفزدہ کردیا تھا! اپنی حماقت کی گہری کھائی میں جھانکتے ہوئے، اس کا جی بے تحاشا زور سے قہقہہ لگانے کو چاہا — آنسوؤں سے تر، ہذیانی قہقہہ۔

وہ اسٹیشن سے اپنے محبت سے عاری خرابے کی راہ لگتا ہے، اپنے دامن میں 'لتوست' کو لیے ہوئے، محرومی کو لیے ہوئے۔

نظریۂ 'لتوست' پر مزید چند یادداشتیں

میں نے طالبِ علم کی زندگی سے دو واقعات نکال کر ان دو بنیادی ردِعمل کی وضاحت کے لیے استعمال کیے ہیں جو خود اپنے 'لتوست' کے حوالے سے ہمارے ہوسکتے ہیں۔ جب ہمارا رفیق

ہم سے کمزور ہوتا ہے تو ہم اس کی توہین کرتے ہیں، جس طرح طالب علم نے اپنی زنانہ دوست کی تیز تر تیرنے پر کی تھی۔

لیکن اگر ہمارا رفیق ہم سے زیادہ زور آور ثابت ہوتو ہم گول مول راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں — ہاتھ کے پشت کی مار، خودکشی کے بھیس میں قتل۔ چھوٹا سا لڑکا بے سُرا بجاتا ہے تا آنکہ استاد اور برداشت نہیں کرسکتا اور اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیتا ہے۔ اور گرتے ہوئے پرواز کے دوران لڑکا اس خیال پر خوش ہوتا ہے کے بڈھے کمینے استاد پر اب قتل کا الزام لگے گا۔

یہ دو کلاسیکی ردِعمل ہیں۔ اگر اول الذکر شادی شدہ یا غیر شادی شدہ جوڑوں میں عام رونما ہوتا ہے تو موخر الذکر اس چیز کا خاص الخاص جز ہے جسے ہم انسانی تاریخ کہتے ہیں۔ ہر وہ چیز جسے ہمارے استادوں نے کبھی بطالت کہا ہو، ہوسکتا ہے کہ اس نوع کے 'لتوست' سے زیادہ نہ رہی ہو جس کی وضاحت میں نے کم سن لڑکے اور وائلن کے استاد کی مثال دے کر کی ہے۔ اہلِ فارس پیلوپونیسس (Peloponnesus) فتح کرتے ہیں، اور اسپارٹا کے باشندے ایک کے بعد ایک غلط حکمت عملی کا ارتکاب۔ جس طرح کم سن لڑکا سُروں میں بجانے کا انکاری ہے، وہ بھی کوئی معقول قدم اٹھانے سے انکار کرتے ہیں؛ طیش کے آنسوؤں سے اتنے اندھے ہوگئے ہیں کہ نہ تو زیادہ تسلی بخش طور پر لڑ سکتے ہیں، نہ سپر انداز، اور نہ الٹے پانو فرار کرسکتے ہیں۔ وہ تو بدخواہی — 'لتوست' — کو اس کی اجازت دے دیتے ہیں کہ ان میں کے ایکو ایک کو فنا کر ڈالے۔

اس تعلق سے مجھے خیال آتا ہے کہ یہ کوئی اتفاق نہیں کہ 'لتوست' کا تصور پہلے پہل بوہیمیا میں نمودار ہوا۔ چیک قوم کی تاریخ — زیادہ طاقتور دشمنوں کے خلاف غیر مختتم بغاوتوں کی تاریخ، رفیع الشان پسپائیوں کی تاریخ جس نے عالمی تاریخ کو تو ضرور حرکت دی لیکن ساتھ ہی خود اپنے لوگوں کے زوال کا محرک بھی بنی — دراصل 'لتوست' ہی کی تاریخ ہے۔ جب اگست 1968 میں ہزاروں روسی ٹینکوں نے اس چھوٹے سے شاندار ملک پر قبضہ کیا تو مجھے اس کے شہروں میں کے ایک شہر کی دیواروں پر یہ گرفیتی نظر آئی: 'ہم سمجھوتا نہیں چاہتے، ہم فتح کے طلب گار ہیں۔' آپ یہ ملحوظ رکھیں کہ اس وقت انتخاب مختلف نوع کی شکستوں میں سے کسی

ایک کا تھا، لیکن مذکورہ شہر مفاہمت سے سرگرداں تھا، اور فتح کے علاوہ کسی اور چیز سے معاملہ کرنے پر ہرگز آمادہ نہ تھا۔ یہاں عقل نہیں بول رہی تھی؛ یہ تو 'لتوست' کی آواز تھی! سمجھوتے سے انکار کا مطلب لامحالہ بدترین شکست کا انتخاب تھا، لیکن، بہر حال، یہی تو 'لتوست' ہے۔

'لتوست' کا سودائی اپنا انتقام خود اپنے کو تباہ کر کے لیتا ہے۔ ننھا بالک فٹ پاتھ پر کرچی کرچی ہو گیا تھا، لیکن اس کی امر روح اس بات پر ابد تک شادماں رہے گی کہ استاد نے کھلی کھڑکی کی چٹخنی سے اپنے کو پھانسی دے لی تھی۔

لیکن طالب علم آخر کس طرح کرستینا کو ضرر پہنچا سکتا ہے؟ اس کے کچھ کرنے سے پہلے ہی وہ ریل گاڑی کی سلامتی میں پہنچ گئی ہے۔ نظریہ ساز اس قسم کے مظہر سے واقف ہیں اور اسے "متاثرہ لتوست" (impacted *litost*) کا نام دیتے ہیں۔

اس سے بدتر کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ طالب علم کا 'لتوست'، اس کی مایوسی، اس پھوڑے کی طرح تھی جو دم بدم بڑھ رہا ہو، اور وہ اس سے لاعلم کہ علاج کیسے کیا جائے۔ چونکہ وہ انتقام لینے سے قاصر تھا، کم از کم تسلی کا امیدوار تھا۔ اور اسی کے باعث اسے لرمنتوف کا خیال آ گیا۔ اسے یاد آیا کہ گیئٹے نے اس کی کس طرح اہانت کی تھی، کس طرح والتیئر نے بے توقیر کیا تھا، اور لرمنتوف بار بار کس طرح چلا چلا کر کہتا رہا تھا کہ اس کا بھی فخر ہے، جیسے میز کے گرد تمام شاعر وائلن سکھانے والے استاد تھے اور وہ انھیں اکسا رہا ہو کہ اٹھ کر اسے کھڑکی کے باہر پھینک دیں۔

طالب علم کو لرمنتوف کی پدرانہ مدد کی حاجت تھی۔ اس نے ہاتھ جیب میں بہت نیچے تک ڈالے اور بڑے سے تہہ شدہ کاغذ کو محسوس کیا۔ وہ کسی نوٹ بک سے پھاڑا ہوا ورق تھا جس پر یہ پیغام تھا "میں انتظار کر رہی ہوں۔ مجھے تم سے عشق ہے۔ کرستینا۔ نصف شب۔"

اس نے متوقع نتیجہ نکال لیا۔ جو جیکٹ وہ پہنے ہوئے تھا کل اس کے کمرے میں ٹنگی ہوئی تھی۔ بعد از وقت پڑھا جانے والا پیغام اس بات کی تصدیق کر رہا تھا جو وہ پہلے سے جانتا

پٹرارک کی نظر اس پر جا پڑی اور وہیں اپنی میز سے ہاتھ ہلایا۔ لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ لبغض (بالکل ٹھیک، 'لتوست') اسے کلب سے دور اس کی ناشاد تنہائی میں واپس بلا رہا تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا، اور ٹھیک آخری لمحے میں کرستینا کا نوٹ جیب سے نکالا۔ اب یہ اور

اسے تسکین نہیں پہنچا سکے گا۔ اگر وہ اسے یہیں چھوڑ جائے تو یہ کسی کی توجہ میں آ جائے گا اور وہ جان لے گا کہ جو طالب علم یہاں بیٹھا ہوا تھا اس سے بیکراں محبت کی گئی ہے۔

وہ نکلنے کی نیت سے دروازے کی سمت بڑھا۔

اعزازِ ناگہاں

"ٹھہرو!" پیچھے سے آواز آئی۔ طالب علم پلٹا۔ پٹرارک نے ہاتھ لہرایا اور قریب آیا۔ "اتنی جلدی لوٹے جا رہے ہو؟" اس نے پوچھا، اور فوراً نہ پہچاننے پر معذرت کی۔ "مجھے اگلے دن بالکل ہوش نہیں رہتا۔"

طالب علم نے کہا کہ وہ مخل نہیں ہونا چاہتا تھا کیونکہ وہ پٹرارک کی میز پر جو اصحاب بیٹھے تھے ان سے واقف نہیں تھا۔

"اوہ، وہ گھامڑ ہیں۔" پٹرارک بولا اور طالب علم کے ساتھ اسی میز کے پاس پہنچا جہاں سے طالب علم ابھی ابھی اٹھا تھا۔ طالب علم نے بڑی تکلیف کے ساتھ کاغذ کے بڑے سے ٹکڑے کو دیکھا جو وہاں بڑی معصومیت سے پڑا ہوا تھا۔ کاش یہ چھوٹی سی پرزی ہی ہوتا، لیکن نہیں — صفحہ اتنا بڑا تھا کہ جس انگھڑ پیش بینی کے ساتھ اسے چھوڑا گیا تھا اسے نظر انداز کرنا ناممکن تھا۔

پٹرارک، جس کی سیاہ آنکھیں تجسس سے بھڑک رہی تھیں، سیدھا اسی کی طرف گیا۔ "یہ کیا ہے؟" اس نے کہا، اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ "تمھارا نہیں، میرے دوست؟"

طالب علم اس آدمی کی خجالت کا بھرم رکھنے میں اناڑی نکلا جو ایک رازدارانہ یادداشت پیچھے چھوڑ گیا ہو۔ اس نے کاغذ پٹرارک کے ہاتھ سے اچک لینے کی کوشش کی۔

لیکن پٹرارک اسے اونچی آواز میں پڑھنے لگا تھا۔ "میں انتظار کر رہی ہوں۔ مجھے تم سے عشق ہے۔ کرستینا۔ نصف شب۔"

اس نے لڑکے کی آنکھوں میں گھور کر دیکھا اور پوچھا، "نصف شب؟ امید ہے کہ گذشتہ کل نہیں۔"

"ہاں، کل ہی،" طالبِ علم نے نظریں نیچی کرتے ہوئے کہا۔ کاغذ کو پٹرارک کے ہاتھوں سے جھپٹ لینے کی کوشش اب اس نے چھوڑ دی تھی۔

اس اثنا میں لرمنتوف اپنی کوتاہ ٹانگوں پر چلتا ہوا میز کی طرف آ رہا تھا۔ "تمھارے نظر آنے پر خوشی ہوئی،" اس نے طالبِ علم سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ پھر، اس میز کی طرف مڑ کر نظر ڈالتے ہوئے جہاں سے چلا آ رہا تھا، یہ اضافہ کیا، "نرے گھامڑ ہیں،" اور پٹرارک اور طالبِ علم کے ساتھ بیٹھ گیا۔

پٹرارک نے فوراً ہی پیغام کا متن لرمنتوف کو پڑھ کر سنایا۔ کئی بار پڑھا اور ایسے لہک لہک کے جیسے شاعری کی کوئی سطر ہو۔

مجھے خیال ہوتا ہے کہ ان صورتوں میں جب ہم زیادہ تیز تیرنے والی لڑکی کو ایک زوردار چپت مارنے سے عاجز ہوں یا جب اہلِ فارس کو اس کی اجازت دیں کہ ہمیں تہِ تیغ کر ڈالیں، جب اپنے دلخراش 'لتوست' سے بچ نکلنے کی کوئی سبیل نہ ہو، تو شاعری ہماری مدد کرنے آ پہنچتی ہے۔

اس مکمل اور مطلق ہزیمت کا کیا بچا ہے؟ صرف شاعری۔ وہ الفاظ جو گیٹے نے اس کتاب میں لکھ دیے تھے جو کرستینا اپنے ساتھ گھر لے گئی تھی اور مسطّر کاغذ پر گھسیٹے ہوئے وہ لفظ جنھوں نے طالبِ علم کو غیر متوقع اعزاز بخشا ہے۔

"اس کا اعتراف کرلو، میرے لڑکے،" پٹرارک نے طالبِ علم کا ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "مان لو۔ تم شاعری کرتے ہو! تم شاعر ہو!"

طالبِ علم نے نظریں جھکالیں اور مان لیا کہ پٹرارک درست کہہ رہا ہے۔

اور لرمنتوف پھر تنہا ہے

اصل میں لڑکا لرمنتوف سے ملنے ہی 'رائٹرز کلب' آیا تھا، لیکن اس وقت کے بعد سے لرمنتوف اسے کھو چکا تھا اور وہ لرمنتوف کو۔ لرمنتوف کو شادماں عاشقوں سے نفرت ہے۔ اس نے ناک بھوں چڑھائی اور میٹھے جذبات سے تر بتر شاعری اور بڑے بڑے لفظوں کے خلاف لعن طعن

کرنے لگ گیا۔ کہ نظم کو کس طرح کاریگر کے ہاتھوں سے وضع کی ہوئی شے کی طرح سچا ہونا چاہیے۔ اس نے پٹرارک اور طالب علم پر سخت تیور چڑھائے، تنک مزاجی دکھائی۔ ہم جانتے ہیں کہ مصیبت کیا ہے۔ گیٹے کو بھی اس کا پتا تھا۔ مقعد کی کمی۔ وہ بھیانک 'لتوست' جو مقعد کی کمی سے پیدا ہوتا ہے۔

اب ظاہر ہے لرمنتوف کو سمجھنے کے لیے کون طالب علم سے بہتر حالت میں تھا؟ لیکن اس ناقابلِ اصلاح فاتر العقل کو اگر کچھ نظر آتا ہے تو وہ شاعر کا غم انگیز چہرہ ہی ہے، اگر کچھ سنائی دیتا ہے تو وہ اس کی زہر میں بجھی باتیں ہیں۔ اور وہ انھیں اپنی ذات پر محمول کرتا ہے۔

میں انھیں دور سے دیکھ رہا ہوں، فرانس میں اپنی فلک بوس عمارت سے۔ پٹرارک اور طالب علم جانے کے لیے اٹھتے ہیں۔ وہ لرمنتوف سے سرد سی خداحافظ کہتے ہیں۔ اور لرمنتوف پھر اکیلا رہ جاتا ہے۔

پیارے لرمنتوف، اس مخصوص اذیت کے نابغہ کا میرے غم زدہ ملک میں ایک نام ہے جو کسی دھتکارے ہوئے کتے کی آہ وزاری کی یاد آوری کراتا ہے، اسے 'لتوست' کا نام دیا جاتا ہے۔

چھٹا حصہ

ملائک

1

فروری 1948 میں اشتراکی رہنما کلیمنت گوت والت پراگ کے بروک طرزِ تعمیر کے محل کی بالکونی میں نمودار ہوا تا کہ ان ہزاروں لاکھوں ہم شہریوں سے خطاب کرے جو پرانے شہر کے چوک میں مجمع لگائے کھڑے تھے۔ یہ چیک تاریخ کا سخت دشوار لمحہ تھا۔ ہلکی ہلکی برفباری ہوری تھی، موسم سرد تھا، اور گوت والت برہنہ سر۔ فکر مند کلے مینتس نے اپنی سموری ٹوپی اتاری اور گوت والت کے سر پر رکھ دی۔

نہ یہ بات گوت والت کو معلوم تھی نہ کلے مینتس کو کہ فرانز کافکا آٹھ سال تک ہر روز یہی سیڑھیاں چڑھتا رہا تھا جنھیں چڑھ کر وہ ابھی ابھی بالکونی میں آئے تھے۔ آسٹرو ہنگیرین بادشاہت کے دور میں اس عمارت میں جرمن اسکول ہوا کرتا تھا۔ ایک اور بات جو وہ نہیں جانتے تھے یہ تھی کہ اسی عمارت کی سب سے نچلی منزل پر فرانز کے باپ ہرمن کافکا کی دکان تھی جس کی تختی پر اس کے نام کے برابر سفید سر والا کوّا (jackdaw) بنا ہوا تھا، کیونکہ چیک زبان میں 'کافکا' سفید سر کوّے کا مترادف ہے۔

گوت والت، کلے مینتس، اور دوسرے تمام لوگ کافکا کے بارے میں لاعلم تھے، اور کافکا کو معلوم تھا کہ لاعلم ہیں۔ اس کے ناولوں کا پراگ یادوں سے معرّا شہر ہے۔ یہ تو اپنا نام تک بھول گیا ہے۔ اس میں کسی کو کچھ یاد نہیں رہتا، کوئی کچھ یاد نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ جوزف K بھی اپنی گذشتہ زندگی کے بارے میں بالکل لاعلم نظر آتا ہے۔ ایک گیت تک نہیں جو یاد آوری کے عمل سے اس شہر کے ماضی کو اس کے حال سے ملا دینے کا اہل ہو۔

کافکا کے ناولوں میں وقت اس انسانیت کا وقت ہے جو تمام انسانیت سے اپنا تسلسل

کھو چکی ہے، ایسی انسانیت کا جو نہ اب کسی چیز سے واقف ہے نہ کسی چیز کی یاد اس میں باقی ہے، جو بے نام شہروں میں رہتی ہے جن کے گلی کوچے بے نام ہیں یا ایسے ناموں کے حامل ہیں جو ان کے کل تک کے ناموں سے مختلف ہیں، کیونکہ ایک نام کا مطلب ہے ماضی سے تسلسل اور جن لوگوں کا ماضی نہ ہو، ان کا کوئی نام بھی نہیں ہوتا۔

پراگ، بقول مَکس بروٹ (Max Brod)، بدی کا شہر ہے۔ 1621 میں چیک ریفورمیشن کی شکست کے بعد، جیزوئسٹوں نے قوم کو مستند کیتھولک عقیدے کی دوبارہ تعلیم اس طرح دی کہ شہر کو بروک طرز کے گرجوں سے بھر مارا۔ ہزاروں حجری سَنت مہنت جو ہر طرف سے باہر کو گھورتے ہیں — آدمی پر ہیبت طاری کر دیتے ہیں، اس کا تعاقب کرتے ہیں، اسے ہپنوٹائز کر ڈالتے ہیں — قابضوں کے وہ غضب ناک لشکر ہیں جو ساڑھے تین سو سال پہلے بوہیمیا پر حملہ آور ہوئے تاکہ لوگوں کے دلوں سے ان کا عقیدہ اور زبان نوچ پھینکیں۔

تمینا جس گلی میں پیدا ہوئی تھی وہ شُوَرِین (Schwerin) کہلاتی تھی۔ یہ جنگ کے زمانے کا ذکر ہے، جب پراگ پر جرمنوں کا قبضہ تھا۔ اس کا باپ 'شارعِ سرنوکوسٹلیکہ' — (Cernokostelecka Avenue) 'کالا گرجا' والی سڑک — کے جوار میں پیدا ہوا تھا، آسٹرو ہنگیرین بادشاہت کے زمانے میں۔ جب اس کی ماں شادی کے بعد شوہر کے یہاں اٹھ آئی تھی، اس وقت اس کا نام 'مارشل فوخ' (Marshal Foch) تھا۔ یہ پہلی جنگِ عظیم کا زمانہ تھا۔ تمینا نے اپنا بچپن 'شاہراہِ اسٹالن' پر گزارا تھا، اور جب اس کا شوہر اسے وہاں سے لے جانے کے لیے آیا، تو وہ 'شاہراہِ ونوہارڈی' (Vinohardy) — یعنی 'انگور باڑی' — گیا۔ اور ان تمام وقتوں میں وہ یہی ایک سڑک تھی؛ بس اس کے نام بدلتے رہے، اس کی جراحی کرتے رہے۔

ان پریشان سڑکوں پر ہر قسم کی روحیں گشت کرتی پھر رہی ہیں۔ یہ ان یادگاروں کی روحیں ہیں جو منہدم کر دی گئی ہیں، ریفورمیشن کے ہاتھوں، آسٹریائی کاؤنٹر ریفورمیشن کے ہاتھوں، چیکوسلوواک ریپبلک کے ہاتھوں، اشتراکیوں کے ہاتھوں۔ اسٹالن کے مجسمے بھی توڑ تاڑ دیے گئے ہیں۔ ملک بھر میں، جہاں جہاں مجسموں کو اس طرح توڑا پھوڑا گیا تھا، ہزاروں کی تعداد میں لینن کے مجسمے نکل آئے ہیں۔ وہ خرابوں پر خس و خاشاک کی طرح اگتے ہیں، فراموشی کے مغموم پھولوں کی طرح"۔

2

اگر کافکا ایسی دنیا کا پیغمبر تھا جو حافظے سے تہی ہو چکی تھی، تو گستاف ہوساک (Gustav Husak) اس کا آفریدگار ہے۔ ٹی۔ جی۔ مسّریک (T. G. Masaryk) کے بعد، جو آزادی دلوانے والا صدر مشہور ہے (اس کے ایکو ایک مجسمے منہدم کردیے گئے ہیں)، بینش (Benes)، گوت والت، زپوتیکی (Zapotecky)، نووتنی (Novotny)، اور سوووبدا (Svoboda) کے بعد، ہوساک، میرے ملک کا ساتواں صدر، 'صدرِ فراموشی' کے طور پر مشہور ہے۔

یہ روسی ہیں جنھوں نے 1969 میں اس کا اقتدار قائم کروایا تھا۔ 1621 سے چیک تاریخ نے کبھی فکر و ثقافت کے ایسے بے محابا قتلِ عام کا تجربہ نہیں کیا تھا۔ ہر جگہ ہر کوئی یہ فرض کرلیتا ہے کہ ہوساک محض اپنے سیاسی مخالفین کی کھوج میں تھا۔ یہ بات نہیں، سیاسی مخالفت سے جد و جہد محض ایک بہانہ تھی، روسیوں نے اپنے میانگر کو کہیں زیادہ ٹھوس مقصد کے لیے استعمال کرنے کے مبارک موقع کو لبیک کہا۔

اس تعلق سے مجھے یہ بات بے حد اہم نظر آتی ہے کہ ہوساک نے کوئی ایک سو پینتالیس چیک تاریخ دانوں کو دانش گاہوں اور تحقیقی اداروں سے برطرف کردیا تھا۔ (افواہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے عوض — خفیہ طور پر، جیسے پریوں کی کہانیوں میں ہوتا ہے — لینن کا ایک تازہ یادگاری مجسمہ کھڑا ہوگیا تھا۔) ان میں کا ایک تاریخ داں، میرا سب کچھ لیکن اندھا دوست مِلان ہبل (Milan Hubl)، 1971 میں ایک دن مجھ سے میرے 'بارتولومیسکا اسٹریٹ' (Bartolomejska Street) والے ڈربے جیسے اپارٹ مینٹ میں ملنے آیا۔ ہم نے کھڑکی کے باہر قصری قلعے کے کلس کو دیکھا اور غمگین تھے۔

"ایک قوم کو کالعدم کرنے کا پہلا قدم،" ہبل نے کہا، "یہ ہے کہ اس کا حافظہ مٹا دیا جائے۔ اس کی کتابوں کو تباہ کردو، اس کی ثقافت کو، اس کی تاریخ کو۔ پھر کسی سے نئی کتابیں لکھوالو، ایک نئی ثقافت میکانکی طور پر پیدا کرالو، نئی تاریخ گھڑلو۔ اور قوم کو یہ بھولنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی کہ وہ کون ہے اور کون تھی۔ اور اس کے ارد گرد دنیا تو اور بھی تیزی سے بھول

جائے گی۔"

"اور زبان؟"

"اسے ہم سے چھین لینے کی کسی کو کیا ضرورت پڑی ہے؟ اسے فوک لور بنتے اور قدرتی موت مرتے دیر نہیں لگے گی۔"

کیا یہ مطلق نا امیدی کا زائیدہ مبالغہ تھا؟

یا یہ صحیح ہے کہ کوئی قوم باقاعدہ منظم کی ہوئی فراموشی کے صحرا کو عبور نہیں کرسکتی؟

ہم میں سے کوئی نہیں جانتا کہ کیا ہوگا۔ لیکن ایک بات ضرور یقینی ہے: روشن ضمیری کے لمحوں میں چیک قوم اپنی موت کی جھلک بہت قریب سے دیکھ سکتی ہے۔ اس طرح نہیں جیسے یہ کوئی واقع شدہ امر ہو، اس طرح بھی نہیں جیسے یہ کوئی ناگزیر مستقبل ہو، لیکن اس طرح جیسے کہ یہ بالکل کوئی ٹھوس امکان ہو۔ اس کی موت اس کے پہلو میں ہے۔

3

چھ ماہ بعد ہبل کو گرفتار کر کے کئی سال قید کی سزا دے دی گئی۔ اس وقت میرے والد موت سے ہمکنار ہو رہے تھے۔

زندگی کے آخری دس سالوں میں ان کی قوتِ گویائی آہستہ آہستہ جاتی رہی تھی۔ شروع شروع میں انھیں صرف بعض الفاظ کو یاد کرنے میں دشواری ہوتی، یا اس کے بجائے ایک جیسے لفظ کہہ دیتے اور پھر فوراً خود پر ہنسنے لگتے۔ آخر آخر میں ان کے پاس صرف مٹھی بھر لفظ ہی باقی رہ گئے تھے، اور اس سے کچھ زیادہ ٹھوس بات کہنے کی متعدد کوششوں کا نتیجہ اس آخری جملے کی صورت میں نکلتا جو وہ ادا کرسکتے تھے: "یہ عجیب ہے۔"

جب بھی وہ "یہ عجیب ہے" کہتے، ان کی آنکھوں سے بڑی بیکراں حیرت کا اظہار ہوتا، یہی کہ وہ جانتے تو بہت کچھ ہیں لیکن کچھ کہہ نہیں پا رہے۔ اشیا اپنے نام کھو کر صرف ایک غیر معیّن حقیقت میں مدغم ہوگئیں۔ اکیلا میں ہی تھا جو ان سے گفتگو کر کے اس بے نام لامحدودیت کو واضح، گو عارضی طور پر، موسوم اشیا میں تبدیل کرسکتا تھا۔

ان کی بڑی بڑی نیلگوں آنکھیں اب بھی ان کے سال خوردہ چہرے سے پہلے ہی کی طرح ذہانت کے ساتھ تکتیں۔ میں انھیں اکثر باہر سیر کے لیے لے جاتا۔ ہم بلاک کے گرد ایک چکر لگاتے۔ اس سے زیادہ کی طاقت ان میں نہیں رہی تھی۔ انھیں چلنے میں دشواری ہوتی تھی۔ وہ بہت چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے، اور ذرا سی تھکن محسوس کرتے تو جسم آگے کو جھکنے لگتا، اور توازن کھو بیٹھتے۔ ہمیں اکثر رک جانا پڑتا تا کہ وہ دیوار سے پیشانی لگا کر ذرا دم لے لیں۔

ان چہل قدمیوں کے دوران ہم موسیقی کے بارے میں گفتگو کرتے۔ جب ابھی والد ٹھیک سے بولنے پر قادر تھے، میں نے ان سے کئی سوال نہیں پوچھے تھے۔ اب میں اس کا ازالہ کرنا چاہتا تھا۔ سو ہم موسیقی پر باتیں کرتیں۔ یہ بڑی غیر معمولی گفتگو ہوتی۔ ایک شریک کچھ نہیں جانتا تھا لیکن بہت سے لفظوں کا مالک تھا، دوسرا سب کچھ جانتا تھا لیکن الفاظ سے محروم تھا۔

علالت کے دس سال والد بیتھووِن کی سوناٹاؤں سے متعلق اپنے طویل مطالعے پر بڑی مستعدی سے کام کرتے رہے۔ وہ بولنے کے مقابلے میں لکھتے بہتر تھے، لیکن لکھنے کے دوران بھی حافظہ اکثر ہاتھ سے نکل جاتا، حتیٰ کہ آخر میں تحریر کسی کی سمجھ میں نہ آتی — یہ ایسے الفاظ کا مرکب ہوتی جن کا سرے سے وجود ہی نہیں تھا۔

ایک بار انھوں نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ پیانو پر 'اوپس 111' سوناٹا کے ویری ایشنز کھلے ہوئے تھے۔ "دیکھو،" انھوں نے موسیقی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا (ان کی پیانو نوازی کی صلاحیت بھی جاتی رہی تھی)، "دیکھو۔" پھر، بڑی طویل جد و جہد کے بعد، وہ کسی طرح یہ اضافہ کرنے میں کامیاب ہو گئے، "اب میں سمجھ گیا!" وہ کوئی اہم بات مجھے بتانے کی مسلسل کوشش کرتے رہے، لیکن مستعملہ الفاظ بالکل سمجھ سے باہر تھے، اور یہ دیکھ کر کہ میں ان کی بات نہیں سمجھ پا رہا ہوں، انھوں نے مجھے حیرت سے دیکھا اور کہا، "یہ عجیب ہے۔"

بے شک میں جانتا تھا کہ وہ کیا بات کرنا چاہتے تھے۔ وہ اس موضوع میں زمانے سے منہمک رہے تھے۔ بیتھووِن کو زندگی کے آخری دور میں ویری ایشن کی ہیئت سے یکا یک رغبت محسوس ہونے لگی تھی۔ بادی النظر میں یہ ہیئتوں میں سب سے زیادہ سطحی ہی نظر آئے گی، ایک تیکنیکی دکھاوا، ایسا کام جو بیتھووِن کے مقابلے میں کسی آرائشی جھالر بنانے والے کو

زیادہ زیب دیتا ہو۔ لیکن بیتھووِن نے اسے بڑی مقتدر ہیئت بنا دیا تھا (موسیقی کی تاریخ میں پہلی بار)، حتیٰ کہ اس میں اپنا نفیس ترین غور وفکر سمو دیا تھا۔

مانا کہ یہ بہت معروف باتیں ہیں، لیکن والد جس بات کے متلاشی تھے وہ یہ تھی کہ ہم اس سے کیا نتیجہ نکالیں۔ اُس نے ویری ایشنز کا انتخاب آخر کس لیے کیا؟ اس انتخاب کے پیچھے کیا تھا؟

اور اسی لیے انھوں نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا تھا، موسیقی کی طرف اشارہ کیا تھا، اور کہا تھا، "اب میں سمجھ گیا!"

4

والد کی خاموشی، جن کی گرفت سے سارے لفظ نکلے جارہے تھے، ایک سو پینتالیس تاریخ دانوں کا سکوت، جنھیں یاد کرنے کی ممانعت کی گئی ہے، وہ کثیر آواز خاموشی جو میرے ملک میں چہار اطراف سے اڈر رہی ہے، اس تصویر کا پس منظر بناتی ہے جس کے سامنے میں تمینا کے نقش ونگار پیش کر رہا ہوں۔

وہ مغربی یورپ کے ایک چھوٹے سے قصباتی شہر کے کیفے میں گاہکوں کو کافی پلاتی رہی۔ لیکن اب اور دوستانہ شائستگی کی فضا میں حرکت نہیں کر رہی تھی جو کبھی گاہکوں کو وہاں کھینچ لاتی تھی۔ اسے اب اور ان کی باتیں سننے کی خواہش نہیں رہی تھی۔

ایک دن جب بی بی کاؤنٹر کے قریب بار اسٹول پر براجمان تھی اور اس کی ننھی سی بچی چیختی چلاتی فرش پر رینگ رہی تھی، تمینا ضبط کھو بیٹھی۔ اس نے بی بی کو لمحہ بھر موقع دیا کہ خود ہی بچی کو چپ کرائے اور پھر کہا، "کیا تم اسے اتنا اودھم مچانے سے نہیں روک سکتیں؟"

بی بی کو برا لگ گیا۔ "آخر تم بچوں سے اتنی نفرت کیوں کرتی ہو؟"

یہ سوچنے کی کوئی وجہ نہیں کہ تمینا بچوں سے نفرت کرتی تھی۔ اس کے علاوہ، اسے بی بی کی آواز میں ایک بالکل غیر متوقع جارحیت محسوس ہوئی۔ یہ جانے بغیر کہ یہ آخر کیسے ہوا، اس نے بی بی سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔

پھر ایک صبح کام پر نہیں آئی۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ مالک کی بیوی یہ دیکھنے گئی کہ کوئی بات تو نہیں ہوگئی۔ اس نے دروازے کی گھنٹی بجائی، لیکن کسی نے جواب نہیں دیا۔ وہ اگلے روز پھر آئی، اور ایک بار پھر — کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے پولیس کو آنے کے لیے کہا۔ جب انھوں نے دروازہ توڑ دیا تو اپارٹ مینٹ بڑے قرینے سے جما جمایا ملا جس میں کوئی چیز غائب معلوم نہیں ہو رہی تھی، نہ کوئی چیز مشتبہ نظر آ رہی تھی۔

تمینا اگلے چند دن بھی کام پر حاضر نہیں ہوئی۔ پولیس نے کیس کی طرف مراجعت کی، لیکن کسی نئی بات کا سراغ نہیں ملا۔ سو انھوں نے تمینا کو 'مستقل غائب' لوگوں کی فہرست میں فائل کر دیا۔

5

اس فیصلہ کن دن جینز پہنے ہوئے ایک نوجوان آدمی کاؤنٹر پر آ بیٹھا۔ اس وقت تمینا کیفے میں بالکل تنہا تھی۔ نوجوان نے ایک کوک کا آرڈر دیا اور سیال کی آہستہ آہستہ چسکیاں لینے لگا۔ اس نے تمینا کی طرف دیکھا؛ تمینا باہر خلا میں تکنے لگی۔

یک بیک نوجوان نے کہا، "تمینا۔"

اگر یہ اس پر رعب ڈالنے کے لیے تھا، تو وہ ناکام رہا۔ اس کا نام پتا کر لینے میں کسی خاص حکمت عملی کی ضرورت نہیں تھی۔ آس پڑوس کے سارے گاہکوں کو اس کا نام معلوم تھا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم غمگین ہو،" اس نے بات جاری رکھی۔

اس کا بھی مطلوبہ اثر نہ ہوا۔ وہ جانتی تھی کہ فتح کرنے کے سو طریقے تھے اور ان میں عورت کے نسوانی اعضا تک پہنچنے والی سب سے کارگر راہ اس کی اداسی سے ہو کر جاتی تھی۔ اس کے باوجود اس نے نوجوان کی طرف پہلے سے زیادہ دلچسپی کے ساتھ دیکھا۔

وہ باتیں کرنے لگے۔ تمینا کو نوجوان کی جو بات دلکش معلوم ہوئی اور جس نے اس کی توجہ کو اس پر مرکوز رکھا وہ اس کے سوالات تھے۔ یہ نہیں کہ وہ کیا پوچھ رہا تھا، بلکہ کچھ پوچھ تو رہا تھا۔ مدتوں سے کسی نے کب اس سے کسی چیز کے بارے میں پوچھا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے

ایک ابدیت گزر گئی ہو! اگر کبھی کسی نے واقعی اسے سے سوال جواب کیے تھے تو یہ اس کا شوہر ہی تھا، اور یہ اس لیے کہ محبت ایک مسلسل سوال جواب کا نام ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے محبت کی اس سے بہتر کسی تعریف کا علم نہیں۔

(جس کا مطلب ہے کہ پولیس سے بہتر ہم سے کوئی اور محبت نہیں کرتا، میرا دوست ہوبل اعتراضاً کہے گا۔ بالکل۔ چونکہ ہر بلندی کی اپنی پستی ہے، محبت پولیس کی ٹوہتی ہوئی نگاہیں رکھتی ہے۔ بعض اوقات لوگ باگ بلندی کو پستی سے گڈ مڈ کر دیتے ہیں، اور مجھے اس پر بالکل حیرت نہیں ہوگی اگر اکیلے لوگ در پردہ یہ آرزو کرتے ہوں کہ انھیں بھی وقتاً فوقتاً جرح کے لیے بلا لیا جائے کہ اسی بہانے وہ کسی سے اپنی زندگی کے بارے میں کچھ بات چیت کر سکیں۔)

6

نوجوان اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑے وہ سب سنتا ہے جو وہ سنانا چاہتی ہے، پھر کہتا ہے کہ جس چیز کو وہ یاد کرنا کہہ رہی ہے، حقیقت میں کچھ اور ہی ہے، کہ وہ سحر زدگی کے عالم میں ہے اور اپنے کو فراموش کرتا ہوا دیکھ رہی ہے۔

تمینا تائید میں سر ہلا دیتی ہے۔

نوجوان بولے جاتا ہے۔ وہ جب اداسی سے پیچھے مڑ کر دیکھتی ہے، تو یہ اپنے شوہر سے وفاداری کے باعث نہیں۔ اسے تو اب شوہر دکھائی ہی نہیں دیتا؛ وہ تو صرف خلا میں تکتی رہتی ہے۔

خلا میں؟ تو پھر اس کے لیے پیچھے مڑ کر دیکھنا اتنا دشوار کیوں ہو جاتا ہے؟

یہ یادیں نہیں، نوجوان وضاحت کرتا ہے؛ یہ پچھتاوا ہے۔ تمینا کبھی بھول جانے پر خود کو معاف نہیں کرے گی۔

"تو آخر میں کیا کروں؟" تمینا پوچھتی ہے۔

"اپنے بھولنے کو بھول جاؤ،" نوجوان جواب دیتا ہے۔

"ایسا کیسے کیا جائے، اس کی بابت کوئی مشورہ دے سکتے ہو؟" تمینا تلخی سے ہنستی ہے۔

"کیا تمھیں کبھی اس سارے بکھیڑے سے دور ہو جانے کی خواہش نہیں ہوئی؟"

"ہاں، ہوئی ہے،" تمینا اقرار کرتی ہے۔ "بہت زیادہ۔ لیکن کہاں جاؤں؟"

"کسی ایسی جگہ کے بارے میں کیا خیال ہے جہاں چیزیں بادِ صبا کی طرح لطیف ہوتی ہیں، جہاں ان کا کوئی وزن نہیں ہوتا، جہاں کوئی پچھتاوا نہیں ہوتا؟"

"ہاں،" تمینا خواب آلود آواز میں کہتی ہے، "ایسی جگہ جہاں چیزوں کا کوئی وزن نہیں ہوتا۔"

اور جیسا کہ پریوں کی کہانی میں، جیسا کہ خوابوں میں ہوتا آیا ہے (نہیں، یہ پریوں کی کہانی ہی ہے، یہ خواب ہی ہے!)، تمینا کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل آتی ہے جہاں اس نے زندگی کے کئی سال گزار دیے ہیں، اور نوجوان کے ساتھ کیفے سے نکل جاتی ہے۔ باہر ایک سرخ رنگ کی اسپورٹس کار کھڑی ہے۔ نوجوان کود کر اسٹیرنگ وہیل کے پیچھے جا بیٹھتا ہے اور اپنے برابر کی نشست تمینا کو پیش کرتا ہے۔

7

تمینا نے جو پچھتاوا محسوس کیا وہ میں سمجھتا ہوں۔ والد کے انتقال پر اسی پچھتاوے کا خاصا سخت حملہ مجھ پر بھی ہوا تھا۔ میں ان سے بہت کم پوچھنے پر خود کو معاف نہیں کر سکا تھا، ان کی بابت اس قدر کم جاننے پر، انھیں کھو دینے پر۔ حقیقت میں یہ وہی پچھتاوا تھا جس نے مجھے سجھایا کہ جس روز انھوں نے 'اوپس 111' سوناٹا کی طرف اشارہ کیا تھا تو وہ مجھے کیا بتانا چاہتے تھے۔

مجھے ایک تمثیل کے ذریعے اس کی وضاحت کی کوشش کرنے کی اجازت دیں۔ سمفنی ایک موسیقانہ رزمیہ ہے۔ ہم اسے خارجی دنیا کی بیکراں وسعتوں تک لے جانے والے سفر سے تشبیہ دے سکتے ہیں، بلکہ اس سے بھی آگے، اور اس آگے کے بھی ماورا۔ ویری ایشن بھی ایک طرح کا سفر ہوتے ہیں، لیکن یہ سفر خارجی دنیا میں نہیں ہوتا۔ آپ کو پاسکال کا وہ pensée یاد ہوگا جس میں بتایا گیا ہے کہ آدمی کس طرح لامحدود طور پر بڑے اور اتنے ہی لامحدود طور پر چھوٹے پاتال کے درمیان زندگی کرتا ہے۔ ہیئتِ ویری ایشن کا سفر اس 'دوسری'

لامتناہیت کی سمت میں لے جاتا ہے، داخلی تنوع کی لامتناہیت جو سب اشیا میں مستور ہوتی ہے۔

جو چیز بیتھوون نے اپنے ویری ایشنز میں دریافت کی وہ ایک اور فضائے بسیط تھی، ایک اور سمت۔ اس مفہوم میں یہ ویری ایشنز سفر اختیار کرنے کا ایک چیلنج ہیں، 'سفر کرنے کی ایک اور دعوت'۔

ویری ایشن وہ ہیئت ہے جو غایت درجے کا ارتکاز چاہتی ہے۔ یہ موسیقی نویس کو زیرِ نظر معاملے تک خود کو محدود کرنے کا مجاز بنا دیتی ہے، سیدھے اس کے قلب میں اتر جانے کا۔ خیال (subject matter) موضوع (theme) ہوتا ہے، جس کی اکثر زیادہ سے زیادہ سولہ تالیں ہوتی ہیں۔ بیتھوون ان سولہ تالوں کی گہرائی میں اتنا عمیق اتر جاتا ہے جیسے کسی معدن میں زمین کے امعا و احشا تک پہنچ گیا ہو۔

دوسری لامتناہیت کا سفر کسی طرح بھی رزمیے کے سفر سے کم جاں بازی کا مقتضی نہیں ہوتا، اور کسی ماہر طبیعیات کے ذرّے کے حیرت انگیز احشا میں اتر جانے سے قریبی مماثلت رکھتا ہے۔ ہر ویری ایشن کے ساتھ ساتھ بیتھوون اصلی موضوع سے دور تر ہوتا جاتا ہے، جس کی آخری ویری ایشن سے مشابہت بس اس سے زیادہ نہیں ہوتی جو پھول کی خردبین کے نیچے اپنے پیکر سے ہو سکتی ہو۔

آدمی جانتا ہے کہ کائنات کے جملہ آفتابوں اور نجوم کو گرفت میں لانا ممکن نہیں، لیکن اس دوسری لامتناہیت سے بھی محروم کر دیے جانے کی سزا اس کے لیے ناقابل برداشت ہوتی ہے، وہ لامتناہیت جو اتنے پاس ہے، اس کی پہنچ سے اتنی زیادہ قریب۔ تمینا نے اپنی محبت کی لامتناہیت کو گم کر دیا تھا، میں نے اپنے والد کو، ہم سبھی جو کچھ بھی کرتے ہیں، نتیجہ ناکامی ہی نکلتا ہے، کیونکہ یہ کاملیت ہے جو ہماری جستجو کا ہدف ہوتی ہے، ہمیں چاہیے کہ معاملے کے عین قلب کا رخ کریں، اور ہم کبھی اس تک پوری طرح پہنچ نہیں سکتے۔

ہم بڑے اطمینان سے قبول کر لیتے ہیں کہ خارجی لامتناہیت ہمارے لیے نارسا ہے؛ لیکن اس دوسری لامتناہیت کو ہاتھ سے جانے دینے پر ہمارا احساسِ جرم قبر تک ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ ستاروں کی لامتناہیت پر غور کرتے ہوئے ہم اپنے باپوں کی لامتناہیت کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔

سو اب اس میں تعجب کیسا کہ ویری ایشن کی ہیئت نے بالغ بیتھوون کے لیے ایک شدید جذبے کی شکل اختیار کر لی تھی، جو (تمینا کی طرح اور میری طرح) بخوبی جانتا تھا کہ ہمیں جس سے محبت رہی ہے — وہ سولہ تالیں اور ان کے لامتناہی امکانات کی اندرونی کائنات — اسے کھو دینے سے زیادہ ناقابلِ برداشت اور کوئی چیز نہیں۔

8

یہ پوری کتاب ویری ایشنز کی ہیئت میں ایک ناول ہے۔ اس کے انفرادی حصے، کسی سفر کی انفرادی منزلوں کی طرح، ایک موضوع، ایک خیال، ایک واحد صورتِ حال کی سمت میں، جس کا مفہوم فاصلے میں معدوم ہوتا جا رہا ہو، ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہیں۔

یہ ناول تمینا کے بارے میں ہے، اور جب کبھی تمینا غیر موجود ہو، تو تمینا کے لیے۔ وہی اس کا خصوصی کردار اور خصوصی سامع ہے، اس کے علاوہ ساری کہانیاں اُسی کی کہانی کے ویری ایشنز ہیں اور آئینے کی طرح اس کی زندگی میں آ شامل ہوتی ہیں۔

یہ ناول ہنسنے ہنسانے اور بھول جانے کے بارے میں ہے، بھول جانے اور پراگ کے بارے میں، پراگ اور فرشتوں کے بارے میں۔ سرِ راہے، یہ ذرا بھی اتفاقی امر نہیں ہے کہ جو نوجوان آدمی اسٹیرنگ وہیل کے پیچھے بیٹھا ہوا ہے اس کا نام رفائیل ہے۔

دیہی علاقہ بتدریج خرابے میں تبدیل ہو گیا۔ وہ جتنی زیادہ دور گئے، ہریالی کم سے کم ہوتی گئی، اور گیروا رنگ اسی تناسب سے بڑھنے لگا: کھیتوں اور درختوں کی تعداد گھٹ گئی، ریت اور مٹی بڑھنے لگی۔ کار یکبارگی شاہراہ سے جھوک کھا کر تنگ سے راستے پر آ گئی جو تقریباً فوراً ہی ڈھلواں چڑھائی کے پاس آ کر ختم ہو جاتا تھا۔ نوجوان نے کار روک دی۔ وہ باہر نکلے۔ چڑھائی کے کنارے پر کھڑے انھیں اپنے کوئی تیس فٹ نیچے دریا کے مٹیالے کنارے کی تنگ سی پٹی نظر آ رہی تھی۔ پانی گدلے مٹیالے رنگ کا تھا اور تاحدِ نظر چلا گیا تھا۔

"ہم کہاں ہیں؟" تمینا نے رندھی رندھی آواز میں پوچھا۔ وہ رفائیل سے کہنا چاہتی تھی کہ وہ لوٹ جانا چاہتی ہے، لیکن اس کی ہمت نہیں ہوئی۔ اسے خوف تھا کہ وہ نا کر دے گا،

اور ایسا کیا، تو اس سے اس کی تشویش فزوں ہو جائے گی۔

وہ وہاں کھڑے تھے، ڈھلان کے سرے پر، ان کے سامنے پانی تھا، چاروں طرف مٹی، گھاس سے معرا نم مٹی، اس قسم کا علاقہ جو کان کنی کے لیے مناسب ہوتا ہے۔ اور حقیقت میں ایک متروکہ بل ڈوزر وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔

اچانک تمینا کو محسوس ہوا کہ یہ سب پہلے کا دیکھا ہوا ہے؛ یہ بالکل چیکوسلوواکیہ کے اسی قطعۂ زمین کی طرح تھا جہاں اس کے شوہر نے آخری ملازمت کی تھی۔ جب اسے اس کی معمولہ نوکری سے برطرف کر دیا گیا تھا تو اسے نے پراگ کے کوئی پچھتر میل باہر بل ڈوزر چلانے کا کام تلاش کر لیا تھا۔ ہفتے کے دوران وہ اسی جگہ پر ایک ٹریلر میں رہتا تھا، اور چونکہ وہ اس سے ملنے صرف اتوار کے دن ہی پراگ آ سکتا تھا، ایک بار وہ ہفتے کے دوران خود اس سے ملنے گئی تھی۔ اور وہ سیر کے لیے بالکل اسی قسم کے دیہی علاقے میں گئے تھے۔ چکنی مٹی والی، بے گیاہ و شجر، گیروے اور پیلے رنگ کی نم زمین ان کے پیروں کے نیچے تھی، اور نیچے نیچے اڑتے ہوئے سرمئی بادل اوپر۔ وہ پہلو بہ پہلو چلتے رہے، ربر کے بوٹ پہنے ہوئے جو کیچڑ میں دھنس جاتے اور رپٹ پڑتے۔ وہ دنیا میں تنہا تھے، دونوں اندوہ، محبت، اور ایک دوسرے کے بارے میں بے حد فکرمندی سے لبریز۔

مایوسی کا وہی احساس یہاں بھی اس پر حملہ آور ہوا، اور وہ اس پر خوش تھی کہ ماضی کا ایک کھویا ہوا ٹکڑا اچانک، غیر متوقع طور پر اس کے پاس لوٹ آیا ہے۔

وہ یاد بالکل گم ہو گئی تھی۔ آج پہلی بار وہ اس کے پاس لوٹ آئی تھی۔ اسے خیال آیا کہ کیوں نہ اسے نوٹ بک میں لکھ ڈالے۔ اسے تو ٹھیک سے وہ سال بھی یاد تھا!

اس کا پھر جی چاہا کہ نوجوان سے لوٹ چلنے کے لیے کہے۔ نہیں، وہ اس سے یہ غلط کہہ رہا تھا کہ اس کا غم و اندوہ بس سارابیئت ہے اور مظروف نہیں! نہیں، نہیں، اس کا شوہر اس کے غم و اندوہ میں اب بھی زندہ ہے، بس اتنا ہی ہے کہ کھو گیا ہے، اور اس کو تلاش کرنا اس کا فرض ہے! ساری دنیا میں اس کا کھوج لگانا! ہاں، ہاں! اب وہ سمجھ گئی ہے۔ بالآخر! اگر ہم ایک جگہ یہ آس لگائے بیٹھے رہیں کہ ہماری یادیں خود بخود ہمارے پاس لوٹ آئیں گی تو کبھی کچھ یاد نہیں کر سکیں گے! یادیں تو ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اگر ہم انھیں پانا چاہتے ہیں

تو ہمیں خود سفر کرنا ہوگا اور انھیں ان جگہوں سے برآمد کرنا ہوگا جہاں وہ چھپی بیٹھی ہیں!

وہ نوجوان کو یہ سب بس بتانے اور اس سے واپس چلنے کو کہنے ہی والی تھی کہ انھیں نیچے سے سیٹی بجانے کی آواز سنائی دی۔

9

رفائیل نے تمینا کا ہاتھ دبوچ لیا۔ اس کی گرفت مضبوط تھی، سو فرار کا خیال بھی نہیں آ سکتا تھا۔ ڈھلوان سے ایک تنگ، پھسلواں راستہ پیچ وخم کھاتا ہوا نیچے کی طرف جا رہا تھا، اور وہ اسے لیے لیے اس پر چلنے لگا۔

کنارے پر، جہاں چند لمحوں پہلے تک کسی کا نام ونشان بھی نہیں تھا، کوئی بارہ سالہ لڑکا کھڑا ہوا تھا۔ وہ کھینے والی کشتی کو عرشے سے باندھنے والا رسّا اٹھائے ہوئے تھا جو پانی کے کنارے کھڑی اوپر نیچے ڈول رہی تھی۔ لڑکا تمینا کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

اس نے مڑ کر رفائیل پر نظر ڈالی۔ وہ بھی مسکرا رہا تھا۔ وہ باری باری دونوں کو دیکھنے لگی۔ پھر رفائیل ہنسنے لگا۔ لڑکے نے بھی اس کی دیکھا دیکھی ہنسنا شروع کر دیا۔ یہ بڑی عجیب ہنسی تھی — کوئی قابلِ مضحکہ بات سرے سے ہوئی ہی نہیں تھی — تاہم خوشگوار اور چھوت کی طرح اڑ کر لگنے والی۔ یہ تمینا کو للکار رہی تھی کہ اپنی فکروں کو بھول جائے، اس میں کسی مبہم سی چیز کے آثار تھے — مسرت، شاید، یا سکون۔ اور چونکہ تمینا اپنی درماندگی کو اتار پھینکنے کی خواہش مند تھی، وہ بھی اطاعت گزاری سے ان کے ساتھ ساتھ ہنسنے لگی۔

"دیکھا تم نے؟" رفائیل نے کہا۔ "ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔"

جب تمینا نے کشتی میں قدم رکھا تو وہ اس کے نیچے ڈولنے لگی۔ وہ کشتی کے عقبی حصے سے قریب ترین نشست پر بیٹھ گئی۔ وہ بھیگی ہوئی تھی۔ اس نے گرما کا ہلکا پھلکا سا لباس پہنا ہوا تھا، اور نمی فوراً ہی کپڑوں سے ہوتی ہوئی اس کے کولھوں سے جا لگی۔ اسے لجلجاہٹ سی محسوس ہوئی اور تشویش نے ایک بار پھر اسے آ لیا۔

لڑکے نے دھکا دے کر کشتی کنارے سے دور کی اور چپو تھام لیے۔ تمینا نے سر موڑا۔

رفائیل کنارے پر کھڑا ان کو دور ہوتا ہوا دیکھ رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ تمینا کو اس مسکراہٹ میں کسی غیر معمولی چیز کا گمان ہوا۔ ہاں! مسکراتے ہوئے، اس نے بڑے ہولے سے سر ہلایا! اس نے بڑے ہولے سے سر ہلایا!

10

تمینا نے کیوں یہ دریافت نہیں کیا کہ کہاں جا رہی ہے؟

جب آپ کو منزل کی پروا نہ ہو تو پھر آپ یہ نہیں پوچھتے کہ کہاں جا رہے ہیں!

وہ لڑکے کو اپنے سامنے بیٹھے کشتی کھیتے دیکھتی رہی۔ وہ اسے کمزور سا معلوم ہوا۔ چپو اس کے لیے بہت بھاری تھے۔

"تھوڑی دیر اگر میں کشتی چلاؤں تو کیسا رہے گا؟" اس نے تجویز پیش کی، اور لڑکے نے بڑے اشتیاق سے سر ہلایا اور چپو چھوڑ چھاڑ دیے۔

انھوں نے اپنی جگہیں بدل لیں۔ اب لڑکا عقبی حصے میں بیٹھا تمینا کو کشتی کھیتے دیکھ رہا تھا۔ اس نے نشست کے نیچے سے ایک چھوٹا سا ٹیپ رکارڈر باہر نکالا۔ جلد ہی فضا برقی گٹاروں اور صداؤں سے بھر گئی۔ لڑکا تان پر جسم تھرکانے لگا۔ تمینا کراہت سے دیکھا کی۔ لڑکا بالکل کسی بالغ کی طرح ترغیب انگیز انداز میں کولھے ٹھمکا رہا تھا۔ تمینا کو یہ بے حد فحش معلوم ہوا۔

اس نے نظریں جھکا لیں تاکہ اسے نہ دیکھ سکے۔ لڑکے نے آواز اونچی کر دی اور دھیمے دھیمے خود بھی ساتھ ساتھ گانے لگا۔ جب تمینا نے پھر ٹک اس کی طرف دیکھا تو لڑکے نے پوچھا، "تم کیوں نہیں گا رہیں؟"

"مجھے گانے کے بول معلوم نہیں۔"

"کیا مطلب، تم بول نہیں جانتیں؟" اس نے پوچھا، ہنوز تال پر جسم جھٹکتے ہوئے۔ "ہر کوئی اس گانے سے واقف ہے۔"

تمینا کو تھکن محسوس ہونے لگی۔ "اب کیوں نے کچھ دیر کشتی تم چلاؤ؟" وہ بولی۔

"نہیں، تمھی چلاتی رہو۔" اس نے جواب دیا، خندہ بہ لب۔

لیکن تمینا واقعی تھک گئی تھی۔ اس نے چپو اندر کھینچ لیے اور تھوڑا سا ستائی۔ "ہم وہاں جلدی پہنچ جائیں گے؟"

لڑکے نے آگے کی سمت میں اشارہ کیا۔ تمینا نے دیکھنے کے لیے گردن موڑی۔ اب وہ کنارے کے کافی قریب آ گئے تھے۔ یہ اس منظر سے بہت مختلف نظر آ رہا تھا جو وہ پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ یہ سبز و شاداب تھا — سارے کا سارا گھاس اور درخت۔

جلد ہی کشتی زمین سے آ لگی۔ کنارے پر لگ بھگ دس بچے گیند کھیل رہے تھے، اور انھوں نے بڑے تجسّس کے ساتھ انھیں دیکھا۔ تمینا اور لڑکا کشتی سے باہر آئے۔ لڑکے نے کشتی کو کھونٹے سے باندھ دیا۔ ریتیلے ساحل سے آگے چیڑ کے درختوں کی ایک لمبی دہری قطار دور تک چلی گئی تھی۔ دس منٹ درختوں کے درمیانی راستے پر چلتے ہوئے وہ ایک خوب پھیلی ہوئی، پستہ قد، سفید رنگ کی عمارت کے پاس پہنچے۔ اس کے سامنے بہت سی بڑی بڑی، عجیب و غریب، رنگین چیزیں پڑی تھیں — اسے کرید ہوئی کہ یہ کس کام آتی ہوں گی — اور بہت سے والی بال کھیلنے کے جال۔ تمینا کو اچانک احساس ہوا کہ کوئی چیز بے ربط معلوم ہو رہی ہے۔ بالکل، جال زمین سے بہت کم اونچائی پر لگے ہوئے تھے۔

لڑکے نے منہ میں دو انگلیاں ڈالیں اور سیٹی بجائی۔

11

ایک لڑکی جھٹ سے باہر آئی جو نو سال سے زیادہ کی نہ ہوگی۔ اس کا چھوٹا سا دلکش چہرہ تھا اور وہ گوتھک پینٹنگز کی کنواریوں کی طرح عشوہ طرازی سے پیٹ آگے کو نکالے ہوئے چل رہی تھی۔ اس نے کوئی خاص دلچسپی لیے بغیر تمینا پر اس عورت کی سی نظر ڈالی جو اپنے حسن سے کامل مطمئن ہو اور ہر اس چیز سے جو اس سے براہ راست تعلق نہ رکھتی ہو اپنی لاتعلقی کا مظاہرہ کرکے اسے جتا دینا اپنے خلاف شان نہ سمجھتی ہو۔

اس نے سفید عمارت کا دروازہ کھول دیا۔ وہ سیدھے ایک طویل و عریض کمرے میں آئے جس میں بستروں کی بھرمار تھی (وہاں کوئی پیش دالان یا راہداری نہیں تھی)۔ لڑکی کچھ

دیر چاروں طرف دیکھتی رہی، بظاہر بستروں کی تعداد گن رہی تھی، پھر ایک بستر کی طرف اشارہ کیا۔ "تم یہاں سوؤ گی۔"

"تمھارا مطلب ہے کہ مجھے ڈورمیٹوری میں سونا پڑے گا؟" تمینا نے احتجاج کیا۔

"ایک بچے کو اپنے لیے پورا کمرا نہیں چاہیے ہوتا۔"

"کیا مطلب ہے تمھارا؟ میں بچہ وچہ نہیں!"

"یہاں ہم سب بچے ہی ہیں!"

"لیکن چند بڑے بھی ہوں گے!"

"نہیں، کوئی بڑے نہیں۔"

"تو پھر میں یہاں کیا کر رہی ہوں؟" تمینا چلائی۔

بچی نے اس کے اشتعال پر کوئی توجہ نہ دی اور دروازے کی طرف واپس چلی گئی۔ باہر نکلنے سے پہلے مڑی اور بولی، "میں نے تمھیں گلہریوں کے ساتھ رکھا ہے۔"

تمینا کی سمجھ میں نہیں آیا۔

"میں نے تمھیں گلہریوں کے ساتھ رکھا ہے،" بچی نے کسی غیر مطمئن استاد کی آواز میں دہرایا۔ "تمام بچوں کی ٹولیاں مقرر کی گئی ہیں جن کے نام جانوروں کے نام پر رکھے گئے ہیں۔"

تمینا نے گلہریوں کی بابت گفتگو کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ واپس جانا چاہتی تھی۔ اس نے پوچھا کہ اس لڑکے کا کیا ہوا جو اسے یہاں لایا تھا۔

لڑکی نے نہ سننے کا تظاہر کیا اور اپنی بات کیے گئی۔

"مجھے ان سب باتوں کی کوئی پروا نہیں!" تمینا نے چیخ کر کہا۔ "میں واپس جانا چاہتی ہوں! وہ لڑکا کہاں ہے؟"

"چلانا بند کرو!" کوئی بالغ بھی اتنا تحکم آمیز نہ ہو سکتا ہوگا جتنی وہ خوبصورت بچی تھی۔ "تم میری سمجھ سے بالا ہو،" وہ بولے گئی، اور یہ جتانے کے لیے کہ وہ کتنی متحیر ہے، سر ہلاتی رہی۔ "اگر واپس جانا چاہتی ہو تو یہاں آئی ہی کیوں تھیں؟"

"میں یہاں نہیں آنا چاہتی تھی!"

"چلو، بس کرو، تمینا، جھوٹ مت بولو۔ کوئی بھی اتنا لمبا سفر یہ جانے بغیر اختیار نہیں کرتا

کہ یہ کہاں ختم ہوگا۔ تمھیں جھوٹ نہ بولنا سیکھنا چاہیے۔"

تمینا نے بچی کی طرف پیٹھ پھیر لی اور باہر درختوں کے حاشیے والے راستے کی طرف بھاگ پڑی۔ کنارے پر پہنچ کر اس نے لنگر کی جگہ کو دیکھا جہاں گھنٹا بھر پہلے لڑکے نے کشتی باندھی تھی۔ لیکن کشتی کا کہیں نام ونشان نہ تھا — اور تو اور، کھونٹے تک کا نہیں۔

وہ دوڑنے لگی۔ وہ پورے ساحل کا معائنہ کرنا چاہتی تھی۔ لیکن ریتیلا ساحل جلد ہی دلدلی علاقے میں تبدیل ہوگیا، اور پانی تک واپس پہنچنے کے لیے اسے چکر کاٹ کر آنا پڑا۔ ساحل کی پٹی ایک ہموار خم کا تتبع کررہی تھی، اور کوئی گھنٹا بھر کی تلاش کے بعد (جس میں نہ کشتی کا سراغ ملا نہ کسی عرشے کا)، اس نے خود کو پھر اسی مقام پر پایا جہاں درختوں کے حاشیے والا راستہ ساحل تک جاتا تھا۔ سو اسے احساس ہوا کہ وہ ایک جزیرے پر ہے۔

وہ راستے پر ہولے ہولے چلتی ہوئی واپس ڈورمیٹوری آئی، جہاں اسے دس بچوں کا ایک گروہ ملا — چھ سے بارہ سال کی عمروں والے لڑکے اور لڑکیاں — جو دائرہ بنائے کھڑے تھے۔ جب انھوں نے اسے دیکھا تو سب کے سب چلائے، "تمینا، ہمارے ساتھ آ کر کھیلو!"

انھوں نے اسے داخل کرنے کے لیے دائرہ کھول دیا۔

ٹھیک تبھی اسے رفائیل کا مسکرانا اور سر ہلانا یاد آ گیا۔

اس پر دہشت طاری ہوگئی، اور بچوں کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ سیدھی ڈورمیٹوری میں بھاگ گئی اور اپنے بستر میں کنڈلی مار لی۔

12

اس کا شوہر اسپتال میں مرا تھا۔ وہ جس قدر بھی ممکن ہوتا اس کے پاس رہتی، لیکن اس کی وفات رات کے وقت ہوئی، تن تنہا۔ جب وہ اگلے دن وہاں پہنچی اور اس کا بستر خالی پایا، تو اس بوڑھے آدمی نے جو کمرے میں اس کے شوہر کا شریک تھا کہا، "تم شکایت نامہ ضرور داخل کرنا۔ یہ مُردوں کے ساتھ بڑا ذلیل برتاؤ کرتے ہیں!" بوڑھے کی آنکھوں میں خوف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ بہت دنوں زندہ نہیں رہے گا۔ "وہ اسے ٹانگوں سے پکڑ کر فرش پر گھسیٹتے

ہوئے لے گئے تھے۔ سمجھ رہے تھے کہ میں سو رہا ہوں۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے اس کے سر کو دہلیز سے ٹکراتے ہوئے دیکھا تھا۔"

موت کے دو چہرے ہیں۔ ایک عدم؛ اور دوسرا وہ دہشت ناک مادّی وجود جو لاش ہوتی ہے۔

تمینا کی کم سنی میں موت اس کے سامنے پہلی شکل میں نمودار ہوتی تھی، بشکلِ عدم، اور موت کے خوف (جو بہر حال مبہم سا خوف تھا) کا مطلب تھا کہ ایک دن وہ باقی نہ رہے گی۔ جوں جوں عمر بڑھتی گئی، یہ خوف کم ہوتا گیا، تقریباً غائب ہو گیا (اب اس خیال سے اسے ذرا بھی خوف نہیں آتا تھا کہ ایک دن وہ درختوں کو اور نہیں دیکھ سکے گی، یا آسمان کو)، اور وہ زیادہ سے زیادہ توجہ موت کی دوسری شکل کو دینے لگی، موت کی مادی شکل۔ اسے لاش بننے سے خوف آنے لگا۔

اسے لاش بننا غایت درجے کی تذلیل معلوم ہوا۔ ایک لمحہ آپ انسان ہیں اور حیا آپ کی محافظ ہے — برہنگی اور پردہ داری کی حرمت — دوسرے میں آپ مر چکے ہیں، اور اچانک آپ کا جسم دوسروں کے رحم و کرم پر ہے کہ جو چاہیں اس کے ساتھ کرتے پھریں۔ کوئی بھی آپ کے کپڑے اتار سکتا ہے، آپ کی چیر پھاڑ کر سکتا ہے، آپ کے احشا کا معائنہ کر سکتا ہے، اور — تعفن سے بچنے کے لیے اپنی ناک پکڑے ہوئے — آپ کو سرد خانے میں گھسیٹ سکتا ہے یا شعلوں کے سپرد۔ شوہر کو جلوانے اور اس کی راکھ کو ہواؤں میں منتشر کرانے کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ خود کو اس خیال سے اذیت نہیں پہنچانا چاہتی تھی کہ اس کے محبوب جسم کا کیا حشر ہوگا۔

اور پھر چند ماہ بعد جب اسے خودکشی کرنے کا خیال آیا تو اس نے سمندر میں کہیں بہت دور ڈوبنے کا فیصلہ کیا تاکہ اس کے جسم کی بے حرمتی کی شاہد صرف مچھلیاں ہی ہوں، گونگی مچھلیاں۔

میں نے تامس مان کی کہانی کا ذکر پہلے کیا ہے۔ ایک نوجوان جسے موذی مرض لاحق ہے ریل گاڑی میں سوار ہوتا ہے اور کسی نامعلوم شہر میں کمرے کرایے پر لیتا ہے: ایک کمرے میں کپڑوں کی الماری ہے، اور ہر رات ایک تکلیف دہ طور پر حسین ننگی عورت اس کے باہر قدم رکھتی ہے اور اسے ایک طویل تلخ و شیریں کہانی سناتی ہے، اور وہ عورت اور اس

کی کہانی موت ہیں۔

وہ عدم کی میٹھی نیلگوں موت ہیں۔ کیونکہ عدم لامتناہی خالی پن ہے، اور خالی مقام نیلگوں ہوتا ہے، اور نیلگونی سے زیادہ حسین اور آسودگی بخش کوئی اور شے نہیں ہوتی۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ نووالیس (Novalis)، شاعرِ مرگ، نیلگونی کا عاشق تھا اور جہاں جاتا تھا اسے ڈھونڈ نکالتا تھا۔ موت کی مٹھاس نیلگوں ہوتی ہے۔

ٹھیک ہے، مان کے نوجوان ہیرو کا عدم حسین تھا، لیکن اس کے جسم کا کیا بنا؟ کیا اسے بھی ٹانگوں سے پکڑ کر دہلیز پر گھسیٹا گیا؟ کیا اس کا شکم بیچ سے چاک کیا گیا؟ کیا اسے گڑھے میں ڈال دیا یا آگ میں جھونک دیا گیا؟

مان کی عمر اس وقت چھبیس سال تھی، اور نووالس تیس سال کی عمر سے پہلے ہی مر گیا تھا۔ بدقسمتی سے میں عمر میں زیادہ بڑا ہوں، اور ان کے برخلاف یہ سوچنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ جسم پر کیا بیتتی ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ موت نیلگوں نہیں، اور تمینا بھی اسے اتنا ہی جانتی ہے جتنا میں۔ موت بڑا مشقت طلب کام ہے۔ میرے والد کو مرنے میں کئی دن کے شدید تپ سے گزرنا پڑا تھا، اور جس طرح انھیں پسینہ آ رہا تھا اس سے میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ بڑی سخت مشقت سے دوچار تھے۔ موت ان کے سارے ارتکاز کی طالب تھی؛ اور یہ ان کی طاقت سے باہر نظر آ رہا تھا۔ وہ تو یہ بھی نہیں دیکھ سکتے تھے کہ میں ان کے بستر کے پاس بیٹھا ہوا ہوں؛ ان کے پاس توجہ دینے کا وقت ہی کہاں تھا۔ وہ مرنے کے لیے جو مشقت کر رہے تھے اس نے انھیں بالکل نچوڑ ڈالا تھا۔ ان کا ارتکاز اتنا ہی گہرا تھا جتنا اس گھڑسوار کا ہوتا ہے جو اپنے جانور کو کسی دور افتادہ منزل کے طرف دوڑائے لیے جا رہا ہو، اپنی بچی کھچی طاقت کے صرفے پر۔

ہاں، وہ گھڑسواری کر رہے تھے۔

وہ کہاں جا رہے تھے؟

کہیں دور اپنے جسم کو چھپانے۔

نہیں، یہ کوئی اتفاق نہیں کہ موت کے بارے میں ساری نظمیں اسے ایک سفر کے طور پر پیش کرتی ہیں۔ مان کا نوجوان ہیرو ریل گاڑی میں سوار ہوتا ہے، تمینا ایک سرخ رنگ کی

اسپورٹس کار میں کود کر بیٹھتی ہے۔ آدمی کہیں جا کر اپنے جسم کو چھپانے کی لاانتہا خواہش رکھتا ہے۔ لیکن سفر بے سود ہے۔ جب سفر ختم ہوتا ہے، وہ اسے بستر میں پاتے ہیں اور اس کے سر کو دہلیز پر پٹخ دیتے ہیں۔

13

تمینا بچوں کے جزیرے میں کیوں ہے؟ میں جہاں اس کا تصور کرتا ہوں تو کیوں؟

مجھے نہیں معلوم۔

شاید اس لیے کہ جس دن میرے والد کا انتقال ہوا فضا بچوں کے گائے ہوئے مسرت بھرے نغموں سے گونج رہی تھی۔

ایلبہ (Elbe) کے مشرق میں ہر طرف 'پایونیر' تنظیموں کے تحت بچوں کی ٹولیاں بنی ہیں۔ وہ گردنوں کے گرد سرخ رنگ رومال باندھتے ہیں، بڑوں کی طرح مجلسوں میں جاتے ہیں، اور گاہے بگاہے "Internationale" گاتے ہیں۔ ان کی ایک بڑی نفیس رسم یہ بھی ہے کہ کسی بہت ہی ممتاز بڑے کی گردن میں سرخ رومال باندھیں اور اسے 'اعزازی پایونیر' کا خطاب دیں۔ بڑوں کو یہ بہت اچھا لگتا ہے، اور بڑا جتنا زیادہ عمر رسیدہ ہوتا ہے، اتنا ہی زیادہ وہ بچوں سے اپنے کفن کے لیے سرخ رومال وصول کرنا پسند کرتا ہے۔

ان سبھوں نے ایک ایک عدد ایسا ہی رومال وصول کیا ہے — لینن، اسٹالن، مشتر بوف اور شولوخوف، البرائٹ اور بریزنیف۔ اور اُس دن ہوساک قصرِ پراگ میں بڑی دھوم دھام کی تقریب میں اپنے حصے کا رومال وصول کر رہا تھا۔

والد کا بخار تھوڑا سا اتر گیا تھا۔ یہ مئی کا مہینہ تھا، اور میں نے باغ کی طرف والی کھڑکی کھول دی تھی۔ ہمارے سامنے والے مکان سے ٹیلی وژن پر نشر کی جانی والی تقریب کی کارروائی سیب کے درختوں پر کھلے ہوئے پھولوں سے ہوتی ہوئی آ رہی تھی۔ ہم نے بچوں کو ان کی باریک آوازوں میں گاتے ہوئے سنا۔

اتفاق سے اس وقت ڈاکٹر اپنے دورے پر نکلا ہوا تھا۔ وہ والد پر، جن میں اب ایک

لفظ ادا کرنے کی سکت بھی باقی نہیں رہی تھی، جھکا، پھر میری طرف مڑ کے عام سے لہجے میں کہا، "یہ اغما میں ہیں۔ ان کا دماغ جھڑ رہا ہے۔" میں نے دیکھا کہ والد کی بڑی بڑی نیلگوں آنکھیں کچھ اور کشادہ ہوگئی ہیں۔

ڈاکٹر کے رخصت ہونے پر میں اتنا پریشان ہوا کہ کچھ کہنا چاہا، فوراً، تاکہ ڈاکٹر کے کہے کو دماغ بدر کرسکوں۔ سو میں نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا اور کہا، "یہ سن رہے ہیں؟ کیسا مذاق ہے! ہوساک کو 'اعزازی پایونیر' کا خطاب دیا جا رہا ہے!"

اور والد ہنسنے لگے۔ وہ مجھے یہ بتانے کے لیے ہنسے کہ ان کا دماغ زندہ ہے اور میں ان سے بولے جاؤں، مذاق کیے جاؤں۔

یکبارگی ہوساک کی آواز سیب کے درختوں سے ہوتی ہوئی ہم تک پہنچی۔ "بچو! تم ہی مستقبل ہو!"

اور پھر، "بچو! پیچھے مڑ کر کبھی نہ دیکھو!"

"میں کھڑکی بند کیے دیتا ہوں،" میں نے کہا۔ "ہم اسے بہت سن چکے، ہیں نا؟" میں نے والد کی طرف دیکھ کر آنکھ میچکی، اور انھوں نے اپنی بیکراں دل آویز مسکراہٹ سے میری طرف دیکھتے ہوئے ہاں میں سر ہلا دیا۔

چند گھنٹوں بعد ان کا بخار بڑی تیزی سے پھر بڑھ گیا۔ وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے اور اگلے چند دنوں تک بڑی مشقت سے اسے دوڑاتے رہے۔ انھوں نے پھر کبھی مجھے نہیں دیکھا۔

14

لیکن وہ کر بھی کیا سکتی تھی کہ اب یہاں بچوں کے ساتھ تھی؟ کشتی بان غائب ہو چکا تھا اور کشتی کو بھی ساتھ لیتا گیا تھا، اور وہ پانی کی بیکراں پہنائی میں گھری ہوئی تھی۔

وہ لڑے گی۔

یہ افسوس، کتنے افسوس کی بات ہے۔ مغربی یورپ کے چھوٹے سے شہر میں اس نے تو

کبھی اپنی انگلی تک نہیں اٹھائی تھی۔ کیا وہ واقعی یہاں جنگ آزمائی کے لیے تیار ہے، بچوں کے درمیان (بے وزن اشیا کی دنیا میں)؟

اور اس کے پاس لڑنے کا کوئی منصوبہ بھی ہے؟

جس دن وہ یہاں وارد ہوئی تھی، وہی دن جب اس نے کھیلنے سے انکار کر دیا تھا اور اپنے بستر کے ناقابلِ تسخیر قلعے کی طرف دوڑ پڑی تھی، اسے ان کی اٹھتی ہوئی دشمنی فضا میں محسوس ہوئی تھی۔ اس نے اس کے اوسان خطا کر دیے تھے۔ اس نے اس کی پیشگی روک تھام کی کوشش کی اور انھیں ہم نوا بنانا چاہا، جس کا مطلب تھا اسے خود کو ان کے رنگ میں رنگ لینا ہوگا، ان کی زبان قبول کرنی ہوگی۔ وہ ان کے سب کھیلوں میں شرکت کے لیے خود بخود کہے گی، انھیں اپنے خیالات اور برتر جسمانی طاقت پیش کرے گی، اور اپنی دلکشی سے ناگہانی ان پر غالب آ جائے گی۔

ان کے رنگ میں رنگ جانے کا مطلب اپنی تنہائی سے کنارہ کش ہونا تھا۔ اُس پہلے دن اس نے ان کے ساتھ غسل خانے میں جانے سے انکار کر دیا تھا۔ اسے سبھوں کی نظروں کے سامنے اپنی صفائی کرنے میں شرم محسوس ہوئی۔ لیکن اب وہ روز ان کے سامنے یہی کرتی۔

خوب بڑا، ٹائلوں والا غسل خانہ بچوں کی زندگی اور خفیہ خیالات کے مرکز میں استادہ تھا۔ ایک دیوار کے سہارے دس ٹوائلیٹ بولز تھے، اور دوسری کے سہارے دس سِنک۔ جب ایک ٹولی اپنے نائٹ گاؤن اٹھا کر ٹوائلیٹ پر بیٹھتی، تو دوسری سِنکوں کے سامنے ننگ دھڑنگ کھڑی ہوتی۔ ٹوائلیٹ پر بیٹھے ہوئے بچے سِنک پر کھڑے ننگ دھڑنگ کو تکتے رہتے، اور سِنک کے پاس والے ننگ دھڑنگ اپنے کندھوں کے اوپر سے ٹوائلیٹوں پر بیٹھے ہوؤں کو دیکھتے، اور پورا کمرا دبی دبی جنسیت سے بھر جاتا، جو تمینا میں زمانوں کی فراموش کردہ کسی چیز کی مبہم سی یاد کو جگا دیتا۔

جس اثنا میں تمینا اپنے نائٹ گاؤن ہی میں ٹوائلیٹ پر بیٹھی ہوتی، سِنک کے پاس کھڑے ہوئے ننگ دھڑنگ شیر چشم مجسّم بن جاتے۔ جب ٹوائلیٹ فلش کیے جاتے، گلہریاں کھڑی ہو کے اپنے لمبے لمبے نائٹ گاؤن اتار دیتیں، اور شیر سِنک چھوڑ کر بیڈ روم کا رخ کرتے، بلّیوں کے پاس سے گزرتے ہوئے جو ابھی ابھی خالی کیے ہوئے ٹوائلیٹوں کو جا رہی

ہوتیں، جہاں وہ بھی اپنی باری میں سنک کے پاس دوسری گلہریوں کے ساتھ کھڑی تمینا کے سیاہ موعانے اور بڑے بڑے پستانوں کو گھورنے لگتیں۔

اسے اب کوئی شرم محسوس نہ ہوتی۔ اسے لگتا کہ اس کی بالغ جنسیت نے اسے ان سب کے درمیان جن کے پیڑو کے منطقے چکنے اور ہموار تھے ملکہ بنا دیا تھا۔

15

اچھا، تو بظاہر جزیرے کا سفر اس کے خلاف کوئی سازش نہیں تھا، جیسا کہ اس نے شروع میں خیال کیا تھا، ڈورمیٹوری اور اپنے بستر پر نظر ڈالتے ہی۔ اس کے برعکس، اسے محسوس ہوا کہ وہ انتہائے کار اسی جگہ پہنچ گئی ہے جس کی اس نے ہمیشہ تمنا کی تھی؛ وہ وقت میں سرک کر اس مقام پر پہنچ گئی ہے جہاں اس کے شوہر کا وجود نہ اس کی یاد میں باقی رہا ہے نہ اس کی خواہش میں، اور جہاں، نتیجتاً، نہ وہ دباؤ محسوس کرتی ہے نہ پچھتاوا۔

وہ، جسے شرم و حیا کا ہمیشہ ہی بڑا بھرپور احساس رہا تھا (شرم و حیا محبت کی باوفا پرچھائیں تھی)، اب سینکڑوں اجنبی آنکھوں کے سامنے اپنی برہنگی کی نمائش کر رہی تھی۔ شروع میں یہ اسے تکلیف دہ اور ناخوشگوار معلوم ہوا، لیکن پھر وہ رفتہ رفتہ اس کی عادی ہوگئی۔ اس کی برہنگی اب اور بے حیائی نہیں رہی تھی؛ یہ اپنے سارے معنی سے تہی ہوگئی تھی، بے کیف ہوگئی تھی (کم از کم اس نے تو یہی خیال کیا)، گونگی، اور بے جان۔ وہ جسم جس کا ایک ایک انچ سرگزشتِ عشق کا حصہ تھا، اپنی معنویت کھو بیٹھا تھا، اور معنویت کے اس فقدان میں راحت بھی تھی اور سکون بھی۔

لیکن اب اگر اس کی بالغ جنسیت ڈھل رہی تھی تو کیا ہوا، آسائشوں کی ایک پوری دنیا اس کے دور دراز ماضی سے آہستہ آہستہ ابھرنے لگی تھی۔ گہرائیوں میں مدفون یادیں اوپر آنے لگی تھیں۔ مثال کے طور پر یہ (تعجب کیسا کہ وہ اسے ایک زمانے سے فراموش کر چکی تھی؛ بالغ تمینا نے اسے ناقابلِ بیان طور پر ناشائستہ اور بے ڈھنگا خیال کیا ہوتا): ابتدائی اسکول کے پہلے ہی سال اسے اپنی نوجوان حسین استانی سے والہانہ لگاؤ ہوگیا تھا اور وہ مسلسل یہ

خواب دیکھتی رہی تھی کہ اسے استانی کے ساتھ غسل خانے جانے کی اجازت مل جائے۔

اور اب یہاں وہ ٹوائلیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی، مسکرا رہی تھی اور آنکھیں تھوڑی میچ رہی تھی۔ اس نے استانی کے قالب میں اپنا تصور کیا اور اس چھوٹی سی جھائیوں والی لڑکی کا جو، بچی تمینا کے قالب میں، برابر بیٹھی ہوئی تجسس سے اسے چوری چھپے دیکھ رہی تھی۔ اس نے چھوٹی، جھائیوں والی لڑکی کی شہوت انگیز نگاہ سے خود کو اس قدر ایک جانا کہ اسے اپنی یاد کی عمیق ترین گہرائیوں میں ایک قدیم نیم بیدار برانگیختگی کی جھرجھری محسوس ہوئی۔

16

تمینا کے طفیل گلہریاں تقریباً سبھی کھیل جیت گئیں، سو انھوں نے اسے اس کا وافر انعام دینے کا فیصلہ کیا۔ سارے انعامات یا جرمانے غسل خانے میں دیے جاتے تھے، اور تمینا کا انعام یہ تھا کہ وہاں اس کی ہمہ تن خدمت کی جائے۔ حقیقت میں، اسے خود کو چھونے کی بالکل اجازت نہ ہوگی۔ اس کے واسطے سب کچھ فرماں بردار خدمت گار گلہریاں ہی انجام دیں گی۔

اور انھوں نے اس کی خدمت اس طرح کی۔ اول، جب وہ ٹوائلیٹ پر تھی، انھوں نے بڑی احتیاط سے اسے پونچھا پانچھا؛ پھر، اسے کھڑا کیا، ٹوائلیٹ کو فلش کیا، اس کا نائٹ گاؤن جسم سے علاحدہ کیا، اور اسے سنک کے پاس لائیں؛ پھر، ان سبھوں نے اس کے پستانوں اور عانے کو دھونے دھلانے کی کوشش کی اور یہ دیکھنے کی کہ وہ ٹانگوں کے بیچ میں کیسی نظر آتی ہے اور چھوئیں تو کیا محسوس ہوتا ہے۔ گاہے بگاہے وہ انھیں دھکا دے کر دور کرنے کی کوشش کرتی، لیکن یہ آسان نہ تھا۔ وہ مٹھی بھر بچوں کے ساتھ تنگ ظرفی کیسے کر سکتی تھی جو، سچ تو یہ ہے، محض اپنے ساختہ کھیلوں کے اصولوں کی پابندی کر رہے تھے اور اپنی دانست میں خدمت گزاری سے اسے انعام دے رہے تھے۔

آخر کار وہ اسے واپس اس کے بستر پر لے گئے، جہاں ایک بار پھر انھوں نے اس سے بھڑنے اور جسم پر جہاں تہاں تھپتھپانے کے نت نئے بہانے نکال لیے۔ وہ اتنے سارے اس کے گرد ہجوم کر رہے تھے کہ اس کے لیے یہ پہچاننا مشکل ہو گیا کہ کون سا ہاتھ یا منہ کس کا

تھا۔ اسے ان کے دبانے اور ہر حصے کو ٹٹولنے کا ہی احساس ہو رہا تھا، خاص طور ان حصوں کا جن میں وہ ان سے مختلف تھی۔ اس نے آنکھیں موند لیں اور جسم کو جھولتے ہوئے محسوس کیا، جیسے پالنے میں۔ اسے ایک عجیب، دھیمی دھیمی سی جنسی لذت کی انتہا کو پہنچنے کا تجربہ ہو رہا تھا۔

اسے اس عمل کی لذت اپنے ہونٹوں کے گوشوں کو جھٹکے دیتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے آنکھیں پھر سے وا کیں اور دیکھا کہ ایک بچہ اس کے چہرے کو تک رہا ہے اور ایک اور بچے کے چہرے سے کہہ رہا ہے، "دیکھو! دیکھو!" اب اس پر دو چہرے جھکے ہوئے تھے، جو بڑی حریص نظروں سے اس کے ہونٹوں کی رفتہ رفتہ بڑھتی ہوئی پھڑپھڑاہٹ کا تعاقب کر رہے تھے۔ گویا کسی انجر پنجر ڈھیلے کی گئی گھڑی کے پرزوں کا معائنہ ہی کیوں نہ کر رہے ہوں یا کسی مکھی کا جس کے پر توڑ ڈالے گئے ہوں۔

لیکن یوں لگتا تھا جیسے اس کی آنکھیں اس سے بالکل مختلف چیز دیکھ رہی ہوں جو اس کا جسم محسوس کر رہا تھا، اور وہ اپنے اوپر جھکے ہوئے بچوں اور محسوس ہونے والی پنگورے جیسی خاموش لذت کے درمیان ٹھیک تعلق پیدا نہ کر سکی۔ سو اس نے آنکھیں دوبارہ موند لیں اور اپنے جسم سے تفریح لینے لگی، کیونکہ یہ زندگی میں پہلی بار ہوا تھا کہ اس کا جسم روح کی غیر حاضری میں لطف اندوز ہو رہا تھا، وہ روح جو کچھ تصور کرنے اور یاد کرنے سے عاجز، خاموشی کے ساتھ کمرے سے چلی گئی تھی۔

17

میری عمر پانچ سال کی تھی کہ والد نے بتایا: key signature سروں کا مجموعہ بادشاہ کا بیٹا توری دربار ہوتا ہے جس پر وہ (پہلا قدم) اور اس کے دو دستِ راست (پانچواں اور چوتھا قدم) حکمرانی کرتے ہیں۔ احکام کی بجا آوری کرانے کے لیے ان کے پاس چار اور عمائد ہوتے ہیں جن میں سے ہر ایک کا بادشاہ اور اس کے دست راست سے خاص تعلق ہوتا ہے۔ دربار میں پانچ اضافی سُر (tones) بھی ہوتے ہیں، جنھیں 'نیم سُرتی' (chromatic) کہا جاتا ہے۔ یہ دوسری کلیدوں (keys) میں اہم کام سرانجام دیتے ہیں، لیکن یہاں انھیں

صرف مہمان کہا جاتا ہے۔

چونکہ بارہ سروں (notes) میں سے ہر ایک کا اپنا فرض منصبی، لقب اور وظیفہ ہوتا ہے، ہم موسیقی کا جو پارہ بھی سنیں وہ محض آواز سے زیادہ ہی ہوتا ہے: یہ ہمارے سامنے ایک مخصوص عمل کو بتدریج وا کرتا ہے۔ بعض مرتبہ واقعات ایک دوسرے میں بے حد الجھے ہوئے ہوتے ہیں (جیسے مالر (Mahler) یا — اس سے بھی زیادہ — بارتوک (Bartók) یا استراونسکی (Stravinsky) میں): دوسرے درباروں کے شاہزادے مداخلت کرتے ہیں، اور جلد ہی یہ کہنا مشکل ہوجاتا ہے کہ کس سر کا تعلق کس دربار سے ہے اور اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ خفیہ طور پر دہرے تہرے جاسوس کا کام نہیں کررہا۔ تاہم غایت درجے کا سادہ لوح سامع بھی کم و بیش دریافت کرلیتا ہے کہ کیا پیش آ رہا ہے۔ پیچیدہ ترین موسیقی بھی ایک 'زبان' ہی ہوتی ہے۔

تو یہ میرے والد نے مجھے بتایا تھا۔ اب جو آنے والا ہے وہ میرا اپنا ہے۔ ایک دن ایک عظیم آدمی نے حساب لگایا کہ ہزار سال گزرنے پر موسیقی کی زبان گھس گھسا کر رہ گئی ہے اور ایک ہی پیغام کی تکرار کے علاوہ اور کچھ نہیں کرسکتی۔ اس نے سروں کی درجہ بندی کو انقلابی فرمان کے ذریعے منسوخ کرکے سبھوں کو مساوی بنا دیا اور ایک مستحکم نظام کا تابع کردیا: کسی سر کو اجازت نہیں تھی کہ دوسروں کے مقابلے میں کسی پارے میں کثرت سے آئے، نتیجے میں کوئی بھی اپنی سابقہ جاگیردارانہ رورعایتوں پر حق نہیں جتا سکتا تھا۔ تمام درباروں کی مستقلاً چھٹی کردی گئی، اور ان کی جگہ ایک واحد سلطنت وجود میں آئی، جس کی بنیاد مساوات پر تھی اور جو بارہ سری نظام کہلائی۔

شاید اصوات کی بلند آہنگیاں اپنی حقیقت سے زیادہ دلچسپ تھیں، لیکن سامعین جو کلیدوں کی درباری ریشہ دوانیوں کا ہزار سال تک اتباع کرنے کے عادی ہوگئے تھے اس کا کچھ بنا نہ سکے۔ بہر حال، بارہ سری نظام کی حکومت جلد ہی ختم ہوگئی۔ شوئن برگ (Schönberg) کے بعد واریس (Varèse) آیا، اور اس نے کلیدوں کے ساتھ ساتھ سروں کا بھی صفایا کردیا (انسانی آواز کے سر اور موسیقی کے آلات کے سر)، اور ان کی جگہ اصوات کی غایت درجے کی لطیف بازیگری رکھ دی جو، اگرچہ پرکشش ہے، موسیقی کے علاوہ کسی اور چیز کی تاریخ کی ابتدا کی اشارہ کناں ہے، کوئی چیز جس کا دارومدار دوسرے اصولوں، دوسری زبان پر ہے۔

جب مِلان ہبل میرے پراگ کے اپارٹ مینٹ میں چیک قوم کے روسی ریاست میں گم ہوجانے کے امکان پر محوِ کلام تھا، اس وقت ہم دونوں ہی یہ جانتے تھے کہ یہ خیال، اگرچہ جائز سہی، ہم سے ماورا تھا اور کہ ہم کسی ایسی چیز کی بات کر رہے تھے جو 'ناقابلِ تصور' تھی۔ ہرچند کہ آدمی فانی ہے، وہ مکان یا زمان کے خاتمے کا تصور نہیں کرسکتا، تاریخ یا کسی قوم کے خاتمے کا: اس کی زندگی تو متخیلہ لاتناہیت میں ہے۔

ترقی کے خیال پر ریجھے ہوئے لوگ کبھی یہ شک نہیں کرتے کہ ہر آگے کو اٹھایا ہوا قدم خاتمے کی راہ پر اٹھایا ہوا قدم بھی ہوتا ہے اور کہ تمام نشاط انگیز 'آگے اور اوپر' کے نعروں کے پیچھے موت کی ہوسناک آواز چھپی ہوتی ہے اور ہمیں عجلت کرنے پر اکسا رہی ہوتی ہے۔

(اگر آج 'آگے' کا لفظ کسی بھوت کی طرح سارے عالم پر سوار ہے، تو کیا یہ بیشتر اس وجہ سے نہیں کہ اِن دنوں موت ہمارے اس قدر پاس آکر کلام کرتی ہے؟)

جن دنوں آرنلڈ شوئن برگ اپنی بارہ سُری سلطنت کھڑی کر رہا تھا، موسیقی پہلے سے کہیں زیادہ پرمایہ تھی اور اپنی آزادی پر مدہوش۔ یہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ انجام اتنا قریب ہے۔ کوئی تھکن نہیں۔ کوئی جھٹ پٹا نہیں۔ شوئن برگ بے باک تھا، اتنا کہ صرف جوانی ہی اتنی بے باک ہوسکتی ہے۔ اسے جائز طور پر فخر تھا کہ اس نے 'آگے' جانے کا واحد راستہ ہی اختیار کیا ہے۔ موسیقی کی تاریخ جرأت اور خواہش کے وفور میں اپنے ختم کو پہنچی۔

18

اگر یہ درست ہے کہ موسیقی کی تاریخ اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے، تو اب موسیقی کا کیا بچا ہے؟ سکوت؟

ذرا بھی نہیں۔ موسیقی تو اور بھی زیادہ ہے، اپنے شاندار ترین دنوں سے بھی کہیں زیادہ۔ یہ تو کھلے میں بولنے والوں سے ابلی پڑتی ہے، اپارٹ مینٹوں اور ریستورانوں کے بدبخت ساؤنڈ سسٹموں سے، ٹرانزسٹر ریڈیوں سے جنھیں لوگ سڑکوں پر لیے لیے پھرتے ہیں۔

شوئن برگ مرچکا ہے، ایلنگٹن مرچکا ہے، لیکن گٹار امر ہے۔ پیش پا افتادہ ہارمونیز، گھسی پٹی میلوڈیز، اور ایک تھاپ جو جتنی زیادہ اونچی ہوتی جاتی ہے اتنی ہی زیادہ بے کیف۔

موسیقی کا بس یہی باقی بچ رہا ہے، موسیقی کی ابدیت کا۔ ہر کس و ناکس سروں کی ان آسان سی آمیزشوں کی بنیاد پر یکجا ہوسکتا ہے۔ وہ خود زندگی ہیں جو اپنی پرخروش 'یہ رہی میں!' کا ڈنکا بجا رہی ہے۔ میل جول کا کوئی احساس زندگی کے اس سادہ سے میل جول سے زیادہ گونج دار، زیادہ یک زبان نہیں ہے۔ یہ عرب اور یہودی کو یکجا کرسکتا ہے، چیک اور روسی کو۔ جسم ایک مشترکہ تھاپ پر پھڑک رہے ہیں، اس آگہی پر مدہوش کہ ان کا وجود ہے۔ بیتھووِن کی کسی موسیقی نے کبھی اتنا زیادہ اجتماعی جوش وجذبہ کیا پیدا کیا ہوگا جو گٹار کا مسلسل اور تکرار سے بھرپور ارتعاش پیدا کرتا ہے۔

والد کے انتقال سے سال بھر پہلے، ہم دونوں ایک دن بلاک کے گرد چہل قدمی کررہے تھے، اور وہ موسیقی ہر طرف ہمارا پیچھا کرتی ہوئی معلوم ہورہی تھی۔ لوگ جتنے زیادہ غمگین ہوتے ہیں، اسپیکر اتنا ہی زیادہ چیختے چلاتے ہیں۔ وہ ایک مقبوضہ ملک کو تاریخ کی تلخی بھلوا دینے اور اپنی ساری توانائی کو روزمرہ کی زندگی کی مسرتوں کے لیے وقف کروا دینے کے درپے ہیں۔ والد ٹھہر گئے اور اوپر اس آلے کی طرف دیکھنے لگے جس سے شور کی آواز برس رہی تھی، اور مجھے نظر آرہا تھا کہ وہ مجھ سے کوئی بہت اہم بات کہنا چاہتے ہیں۔ بہ سخت کوشش اپنے سارے ارتکاز کو کام میں لاتے ہوئے، تاکہ جو ان کے ذہن میں تھا اسے لفظوں میں ادا کرسکیں، انھوں نے بالآخر کہا: "موسیقی کی ابلہی۔"

ان کا کیا مفہوم تھا؟ کیا یہ ہوسکتا تھا کہ وہ موسیقی کی مذمت کررہے ہوں، جو ان کی زندگی بھر کا عشق تھا؟ نہیں، میں سمجھتا ہوں کہ وہ مجھ سے یہ کہنا چاہتے تھے کہ موسیقی کی مخصوص 'ابتدائی شکل' (primordial state of music) ہے جو اس کی تاریخ سے پہلے کی ہے، معاملے کے کبھی اٹھنے سے پہلے کی، موتیف اور موضوع کی باہمی چھیڑ چھاڑ کا تصور کیے جانے، بلکہ اس پر غور وفکر کیے جانے سے بھی پہلے کی۔ موسیقی کی یہ ابتدائی شکل (موسیقی منفی خیال) انسانی زندگی کے فطری حمق کی عکاس ہے۔ اس فطری حمق سے بلند ہونے کے لیے قلب و ذہن کی بڑی سنگین کاوش درکار ہوتی ہے، اور یہ صدیوں کی یورپی تاریخ پر ایک قوس کی صورت تنا ہوا پرشکوہ محراب تھی جو اس کی پرواز کی انتہائی بلندی پر آ کر آتش بازی کے تماشے میں کسی خدنگ کی طرح فنا ہوگئی۔

موسیقی کی تاریخ فانی ہے، لیکن گٹار کا حمق لازوال ہے۔ ہمارے دور میں موسیقی اپنی ابتدائی شکل میں لوٹ آئی ہے، وہ شکل جو آخری قضیہ کھڑا کرنے اور آخری موضوع کی فکر کے بعد کی ہے — ایک شکل جو تاریخ کے بعد آتی ہے۔

1972 میں جب چیک پوپ سنگر کرل گوٹ (Karel Gott) ملک چھوڑ کر چلا گیا تو ہوساک کی سٹی گم ہوگئی۔ اس نے فوراً بیٹھ کر اسے ذاتی خط لکھا (یہ اگست 1972 تھا اور گوٹ فرانک فورٹ میں تھا)۔ مندرجہ ذیل عبارت اس خط سے لفظ بلفظ ماخوذ ہے۔ میں نے کچھ گھڑا گھڑایا نہیں ہے۔

پیارے کرل،

ہم تم سے خفا نہیں ہیں۔ براہِ کرم واپس آ جاؤ۔ ہم ہر چیز تمھاری مرضی کے مطابق ہی کریں گے۔ ہم تمھاری مدد کریں گے، اگر تم ہماری مدد کرو...

غور کریں۔ ہوساک نے ڈاکٹروں، عالموں، ماہرانِ فلکیات، کھلاڑیوں، ہدایت کاروں، کیمرا مینوں، مزدوروں، انجینئروں، فنِ تعمیر کے ماہروں، تاریخ دانوں، صحافیوں، ادیبوں، اور پینٹروں کو بغیر پلک جھپکائے ترکِ وطن کرنے دیا، لیکن کرل گوٹ کی ہجرت کی تاب نہ لاسکا۔ کیونکہ کرل گوٹ موسیقی منفی حافظہ کی نمائندگی کرتا ہے، وہ موسیقی جس میں بیتھوون اور ایلنگٹن کی ہڈیاں، پلسترینا (Palestrina) اور شوئن برگ کی خاک مدفون ہے۔

فراموشی کا صدر اور موسیقی کا ابلہ ایک دوسرے کے مستحق ہیں۔ دونوں ایک واحد مقصد کے لیے کام کررہے ہیں۔ "ہم تمھاری مدد کریں گے، اگر تم ہماری مدد کرو۔" یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ ایک کو دوسرے کے بغیر قبول کریں۔

19

لیکن اس برج میں بھی جہاں خردِ موسیقی کی بلاشرکتِ غیرے فرمانروائی ہوتی ہے ہمارا جی اس

یک رنگ اور سفاک چیخ و پکار کی تھاپ کے لیے مچل اٹھتا ہے جو باہر سے ہم تک پہنچتی ہے اور جس میں سب ایک دوسرے کے ہم شریک ہوتے ہیں۔ صرف بیتھووِن کی رفاقت میں رہنا بالکل انھیں معنوں میں خطرناک ہے جن میں تمام مرقّہ و مراعاتی حیثیتیں خطرناک ہوتی ہیں۔

تمینا کو شوہر کی معیت میں اپنے پرمسرت ہونے کا اعتراف کرنے پر ہمیشہ خفیف سی ندامت محسوس ہوتی تھی۔ اسے یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ لوگ اس بات پر اس سے نفرت کرنے لگیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ اسے اپنی حیثیت کا صحیح اندازہ نہیں۔ شروع میں اسے محبت ایکمراعات محسوس ہوتی ہے اور بھی مراعاتیں بلا استحقاق ملتی ہیں، چنانچہ اسے اس کی قیمت چکانی پڑے گی۔ یہاں بچوں کے ساتھ رہنا سزا کی ایک شکل ہے۔

لیکن پھر اسے ایک مختلف بات محسوس ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے محبت کی مراعات ملکوتی رہی ہو، لیکن یہ وحشتناک بھی تھی۔ اسیر محبت ہونے کے دوران اس کی زندگی مسلسل تناؤ، خوف و ہراس، اور اضطراب کے عالم میں تھی۔ یہاں بچوں کے درمیان اس کا قیام وہ راحت، وہ انعام ہے جس کا مدتوں سے انتظار رہا ہو۔

اب تک اس کی جنسیت پر محبت کا قبضہ رہا تھا (میں 'قبضہ' اس لیے کہہ رہا ہوں کیونکہ جنسیت محبت نہیں ہے؛ یہ محض وہ علاقہ ہے جو محبت اپنے لیے وقف کر لیتی ہے) اور اسی لیے اپنا ایک ڈرامائی، ذمے دارانہ، اور سنجیدہ پہلو رکھتی تھی، جس کی نگرانی تمینا بڑے کرب کے ساتھ کرتی تھی۔ یہاں بچوں کے ساتھ بے اہمیتی کی اقلیم میں یہ بالآخر وہیں لوٹ گیا جہاں اصلاً ہوا کرتا تھا: محض جسمانی لذت انگیزی کا کھلونا۔

یا دوسرے لفظوں میں کہیں تو، جنسیت جو محبت کے ساتھ اپنے 'شیطانی' بندھنوں سے آزاد ہو کر 'ملکوتی' سادگی کا سرور بن گئی تھی۔

20

جب پہلی بار بچوں نے تمینا کا ریپ کیا تھا تو اس عمل میں ہر قسم کی حیرت ناک چیزوں کا دبا

دبا سا رنگ شامل تھا، لیکن اس میں جو کچھ بھی معنویت رہی ہو وہ جلد ہی تکرار کے باعث جاتی رہی اور یہ ایک روزمرہ کی چیز بن گیا جواب کم سے کم دلچسپ اور زیادہ سے زیادہ کراہت انگیز ہوتی جا رہی تھی۔

جلد ہی بچے آپس میں جھگڑنے لگے۔ وہ جو محبت کے کھیلوں سے جوش میں آتے تھے اپنے سے لاتعلقی کا اظہار کرنے والوں سے نفرت کرنے لگے۔ اور تمینا کے عاشقوں میں وہ جو خود کو اس کے محبوبِ نظر گردانتے تھے اور وہ جو اپنے کو ٹھکرایا ہوا، ان کے درمیان ایک واضح اور قطعی دشمنی پیدا ہوگئی۔ اور یہ تمام معمولی معمولی سی خفگیاں تمینا پر نکالی جانے لگیں اور بارِ خاطر بن گئیں۔

ایک مرتبہ، جب بچے اس کے برہنہ جسم پر جھکے ہوئے تھے (بستر کے پاس کھڑے ہوئے تھے، بستر پر گھٹنوں کے بل جھکے ہوئے تھے، اس کے جسم پر سوار تھے، سر کے پاس اور اس کی ٹانگوں کے بیچ میں دھرنا جمائے بیٹھے تھے)، تو اسے اچانک ایک بڑا چبھتا ہوا درد محسوس ہوا: بچوں میں سے ایک نے اس کی چوچی کی بڑے زور سے چٹکی لے لی تھی۔ اس کی چیخ نکل گئی اور طیش میں آ گئی، سارے بچوں کو بستر سے گرا دیا اور اپنے چاروں طرف بازو جھاڑنے لگی۔

اسے احساس ہوا کہ درد کا باعث نہ اتفاق تھا نہ جنسی طمع؛ ایک بچہ اس سے نفرت کرتا تھا اور اسے جراحت پہنچانے کے درپے تھا۔ اس نے بچوں کے ساتھ اپنی عاشقانہ جھڑپیں ختم کر دیں۔

21

اچانک اس اقلیم کا جس میں اشیا بادِ صبا کی طرح لطیف ہیں سارا سکون درہم برہم ہو جاتا ہے۔

بچے ہاپو ٹاپو کھیل رہے ہیں، ایک چوخانے سے دوسرے میں جست لگا رہے ہیں، پہلے داہنی ٹانگ اٹھاتے ہیں، پھر بائیں، اور پھر دونوں ایک ساتھ۔ تمینا بھی شامل ہو جاتی ہے (میں بچوں کے چھوٹے چھوٹے پیکروں کے درمیان تمینا کے بالا قامت سراپے کا تصور کر سکتا

ہوں، اور جب وہ کودتی ہے، اس کے بال چہرے کے گرد اڑنے لگتے ہیں اور اس کا دل بے لطفی سے بھرا ہوا ہے)، اور کناریاں (canaries) شور مچاتی ہیں کہ اس کا پیر لکیر پر آ گیا ہے۔

گلہریاں، ظاہر ہے، احتجاج کرتی ہیں کہ اس کا پیر لکیر سے نہیں لگا ہے۔ سو دونوں ٹولیاں لکیروں کو جھک کر دیکھتی ہیں کہ ان پر تمینا کے پیر کا نشان ہے یا نہیں۔ لیکن ریت میں کھینچی ہوئی لکیریں بہ آسانی شکل وصورت کھو بیٹھتی ہیں، اور یہی تمینا کے نقشِ قدم کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ متنازعہ فیہ نکتہ ہے اور بچے کوئی پاؤ گھنٹے سے جھگڑ رہے ہیں اور بحثا بحثی میں اور شدت سے الجھتے جا رہے ہیں۔

ایک موقعے پر تمینا ہاتھ کو فیصلہ کن انداز میں لہرا کر کہتی ہے، "اچھا، ٹھیک ہے، میرا پیر لکیر پر آ گیا ہے۔"

گلہریاں تمینا پر غصہ ہونے لگتی ہیں کہ یہ درست نہیں، وہ دیوانی ہو گئی ہے، جھوٹ بول رہی ہے، اس کے پیر نے لکیر کو بالکل نہیں چھوا ہے۔ لیکن وہ بحث ہار چکی ہیں — جب خود تمینا نے اس کی تردید کر دی ہے تو پھر ان کے دعوے میں وزن کہاں رہا — اور کناریاں فتح کا نعرہ بلند کرتی ہیں۔

گلہریاں بپھر گئی ہیں۔ وہ چلا کر اسے "غدار" کہتی ہیں، اور ایک لڑکا اسے اتنی زور سے دھکا دیتا ہے کہ تقریباً گرا دیتا ہے۔ وہ انھیں پکڑنے کی کوشش کرتی ہے، اور وہ اسے اس پر ٹوٹ پڑنے کا اشارہ سمجھتے ہیں۔ وہ بڑی بے جگری سے اپنی مدافعت کرتی ہے۔ وہ ان سے عمر میں بڑی ہے، طاقتور ہے (اور نفرت سے پُر ہے، ہاں بالکل، وہ ان کی لگاتار دھنائی کرتی ہے گویا وہ ہر وہ چیز ہوں جس سے اس نے کبھی اپنی زندگی میں نفرت کی ہو)، اور تھوڑی ہی دیر میں وہاں مجمعے میں کافی خون آلود ناکیں رہ جاتی ہیں، لیکن پھر کہیں سے ایک پتھر اڑتا ہوا آتا ہے اور اس کی پیشانی پر لگتا ہے، وہ تھوڑا سا ڈگمگا جاتی ہے، اور سر پکڑ لیتی ہے۔ اس سے خون بہہ رہا ہے، اور بچے وہاں سے ہٹ جاتے ہیں۔ یکدم سناٹا چھا جاتا ہے، اور تمینا واپس ڈورمیٹوری چلی آتی ہے۔ وہ بستر پر پسر جاتی ہے اور مصمم ارادہ کر لیتی ہے کہ اب کبھی کسی کھیل میں شریک نہیں ہو گی۔

22

میں تمینا کو ڈورمیٹوری کے بیچ میں کھڑا دیکھ سکتا ہوں جو بستر پر لیٹے ہوئے بچوں سے بھری ہوئی ہے۔ وہ ان کی توجہ کا مرکز ہے۔ "چچ، چچ" ایک کونے سے آواز آتی ہے۔ دوسرے بھی شامل ہوجاتے ہیں، اور جلد ہی وہ بڑی ہم آہنگ "چچ، چچ، چچ" میں گھر جاتی ہے۔...

وہ جو بہت زیادہ وقت نہیں گزرا کہ اس کا فخر اور ہتھیار تھے — اس کے زیر ناف کے سیاہ بال، اس کے خوبصورت پستان — اب ان کی تضحیک کا ہدف بن گئے تھے۔ اب بچوں کی نگاہوں میں اس کی بلوغت اس کے بھونڈے پن کا باعث تھی: اس کے پستان اتنے ہی مہمل تھے جتنی رسولیاں، اس کا زیرِ ناف کریہہ طور پر جھبرا، جانوروں کی طرح۔

وہ سارے جزیرے پر اس کا پیچھا کرنے لگے، اس پر دریا برد لکڑیاں اور پتھر اچھالتے۔ وہ چھپنے کی، بھاگ نکلنے کی کوشش کرتی، لیکن جہاں بھی جاتی، ان کے چلانے کی آواز پیچھا کرتی رہتی: "چچ، چچ، چچ..."

کہ زورآور کمزوروں سے بھاگیں، اس سے زیادہ ذلت آمیز کوئی اور چیز نہیں ہے۔ لیکن وہاں وہ اتنے سارے تھے۔ وہ ان سے بھاگتی اور بھاگنے پر شرمساری محسوس کرتی۔

ایک بار وہ گھات لگا کر بیٹھی اور تین کو پکڑ کر ان کی خوب ٹھکائی کر ڈالی۔ ان میں سے ایک نیچے گر پڑا، اور بقیہ دو نے فرار کی کوشش کی۔ لیکن وہ ان سے کہیں زیادہ پھرتیلی ثابت ہوئی؛ اس نے انھیں بالوں سے جا پکڑا۔

اور پھر اوپر سے ایک جال اس پر آ کر پڑا، پھر ایک اور، اور پھر ایک اور۔ ہاں، وہ کبھی والی بال کے جال جو ڈورمیٹوری کے سامنے زمین سے بس تھوڑی سی بلندی پر تنے ہوئے تھے۔ وہ پہلے سے اس کی گھات میں بیٹھے تھے۔ وہ تین بچے جن کی اس نے ابھی ابھی مرمت کی تھی، دراصل اسے دام میں لانے کے لیے بھیجے گئے تھے۔ اور اب وہ وہاں قید پڑی تھی، جالوں میں الجھی پیچ و تاب کھا رہی تھی، ہر سمت میں ہاتھ پانو مار رہی تھی، اور شاداں و فرحاں بچے اسے گھسیٹے لیے جا رہے تھے۔

23

بچے اتنے برے کیوں ہیں؟

لیکن وہ کہاں اتنے برے ہیں۔ حقیقت میں، وہ تو نہایت خورسند ہیں اور مسلسل ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی نہیں چاہتا کہ تمینا صرف اسی کی ہو رہے۔ "دیکھو! دیکھو!" وہ آگے پیچھے چلاتے ہیں۔ تمینا الجھے ہوئے جالوں میں پھنسی ہوئی ہے، رسیاں اس کی کھال ادھیڑے دے رہی ہیں، اور بچے اس کے خون، آنسوؤں، اور تکلیف کی شدت سے مسخ شدہ چہرے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ وہ بڑی فیاضی کے ساتھ تمینا کو ایک دوسرے کو پیش کرتے ہیں۔ اس نے ان کے احساس اخوت کو مستحکم کر دیا ہے۔

اس کی بدقسمتی کی وجہ یہ نہیں ہے کہ بچے برے ہیں، بلکہ یہ کہ وہ ان کی دنیا کی نہیں ہے۔ کوئی بھی مذبح خانے میں بچھڑوں کے ذبح کیے جانے پر واویلا نہیں مچاتا۔ بچھڑے اسی طرح انسانی قانون کے باہر ہوتے ہیں جس طرح تمینا بچوں کے قانون کے باہر تھی۔

اگر کوئی تلخی اور نفرت سے بھرا ہوا ہے تو وہ تمینا ہے، بچے نہیں۔ ان کی ایذا دہی کی خواہش مثبت ہے، زندہ دلانہ ہے: اسے فرحت کہلانے کا ہر حق حاصل ہے۔ کسی کو جو ان کی دنیا کا نہیں تکلیف پہنچانے سے ان کا واحد مقصد اُس دنیا اور اس کے قوانین کا بول بالا کرنا ہے۔

24

وقت اپنا تاوان وصول کر کے رہتا ہے، اور تکرار کے ساتھ ساتھ تمام مسرتیں اور لطافتیں اپنی آب و تاب کھو دیتی ہیں۔ علاوہ ازیں، حقیقت میں بچے اتنے برے نہیں۔ وہ لڑکا جس نے اس پر پیشاب کی دھار ماری تھی، ٹھیک جب وہ اس کے نیچے والی بال کے جالوں میں پھنسی ہوئی تھی، اس نے چند دن بعد تمینا کو بڑی پیاری اور کشادہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔

تمینا بنا کچھ کہے سنے پھر سے کھیلوں میں شامل ہونے لگی۔ ایک بار پھر وہ ایک خانے سے دوسرے میں کودتی ہے، داہنی ٹانگ پہلے، پھر بائیں، پھر دونوں ساتھ ساتھ۔ وہ ان کی

دنیا میں دوبارہ داخل ہونے کی کبھی کوشش نہیں کرے گی، لیکن یہ خیال بھی رکھے گی کہ خود کو اس سے دور نہ پائے۔ وہ کوشش کرتی ہے کہ وہ ٹھیک حدِ فاصل پر ہی رہے۔

لیکن اس سکون، روز مرّہ کی معمولیت، قرینۂ نباہ جو مفاہمت پر قائم ہوا ہے، تو اس میں دائمی تصفیے کی ساری دہشت ناک نشانیاں موجود ہیں۔ جب تمینا کا پیچھا کیا جا رہا تھا، تو وہ وقت اور اس کی بیکرانی کا وجود بھول گئی تھی، لیکن اب جبکہ یورشوں کی بہیمانہ شدت ماند پڑ چکی ہے، وقت کا بنجر صحرا سایوں کی اوٹ سے نمودار ہو گیا ہے — مہیب، جابر، ابدیت سے اس درجہ مشابہ۔

یہ خاطر نشان کر لیں کہ یہ پیکر آپ کی یاد میں انتہائی استقامت سے مرتسم ہو گیا ہے۔

اب اسے ایک خانے سے دوسرے میں کودنا ہے، داہنی ٹانگ پہلے، پھر بائیں، پھر دونوں ساتھ ساتھ، اور پروا کرنے کا ڈھونگ رچانا ہے چاہے اس کا پانو لکیر پر پڑا ہو یا نہ پڑا ہو۔ دن کے بعد دن اسے کودتے رہنا ہوگا، وقت کا بوجھ صلیب کی طرح کندھوں پر اٹھائے ہوئے جو ہر آتے دن کے ساتھ اور وزنی ہوتا جاتا ہے۔

کیا وہ اب بھی پیچھے مڑ کر دیکھتی ہے؟ کیا اسے شوہر اور پراگ اب بھی یاد آتا ہے؟

نہیں۔ اب اور نہیں۔

25

زمانہ پہلے منہدم کیے ہوئے مجسموں کی روحیں پوڈیم کے پاس چکراتی پھر رہی ہیں جہاں فراموشی کا صدر گردن میں سرخ رومال ڈانٹے کھڑا ہوا ہے۔ بچوں نے تالیاں بجائیں اور اس کے نام کا نعرہ لگایا۔

اس واقعے کو ہوئے آٹھ سال بیت گئے ہیں، لیکن میں اب بھی اس کے الفاظ سن سکتا ہوں جو کھلتے ہوئے سیبوں کے درختوں سے تیرتے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔

"بچو، تم ہی مستقبل ہو" اس نے کہا، لیکن آج مجھے احساس ہو رہا کہ ان الفاظ کا مدعا اس سے مختلف تھا جو معلوم ہو رہا تھا۔ بچے مستقبل ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ایک دن وہ بڑے ہوں گے۔ نہیں، اس کی وجہ تو یہ ہے کہ انسانیت رفتہ رفتہ اپنی طفولت کی سمت بڑھ رہی

ہے، اور بچپن مستقبل کا پیکر ہے۔

"بچو، پیچھے مڑ کر کبھی نہ دیکھنا" وہ زور سے کہتا ہے، اور اس کا جو مدعا ہے وہ یہ کہ ہمیں مستقبل کو کبھی اس بات کی اجازت نہیں دینی چاہیے کہ ہماری یادوں کے بوجھ تلے دب کر ڈھیر ہو جائے۔ بچوں کا، بہر حال، کوئی ماضی نہیں ہوتا۔ بس یہی ان کی مسکراہٹوں میں ساحرانہ معصومیت کے راز کا سبب ہے۔

تاریخ آنی جانی تبدیلیوں کے تواتر سے عبارت ہے۔ یہ اٹل ہیں اور یاد سے مستغنی۔ ہوساک ابدیت کا صدر ہے، عارضیت کا نہیں۔ وہ بچوں کا جانب دار ہے، اور بچے زندگی ہیں، اور زندگی "دیکھنا، سننا، کھانا، پینا، پیشاب کرنا، فُضلہ خارج کرنا، پانی میں چھلانگ لگا کر آسمان کو تکنا، ہنسنا، اور رونا" ہے۔

جب ہوساک بچوں سے اپنی تقریر کے خاتمے پر پہنچا (اُس وقت تک میں اپنی کھڑکی بند کر چکا تھا، اور والد اپنے گھوڑے پر دوبارہ سوار ہونے کو تھے) تو یہ ہوا کہ کرل گوٹ پوڈیم پر آ کر گانے لگا۔ ہوساک پر اس کا اتنا شدید اثر ہوا کہ رخسار پر آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی، اور وہ تاب دار تبسم جو اس پر جگمگا رہا تھا اس کے آنسوؤں میں گھل مل گیا، اور ٹھیک اسی لمحے ایک معجزاتی دھنک کی قوس سارے پراگ پر تن گئی۔

بچوں نے اوپر کی طرف دیکھا، قوسِ قزح نظر آئی، اور ہنسنے اور تالیاں بجانے لگے۔

موسیقی کے ایلبے نے اپنا گانا ختم کیا، اور فراموشی کے صدر نے بانہیں پھیلا کر بڑے زور سے کہا، "بچو، زندگی مسرت ہے!"

26

جزیرہ گانے کی چنگھاڑ اور گٹار کے شور سے گونج رہا ہے۔ ڈورمیٹوری کے سامنے کی خالی جگہ میں ٹیپ رکارڈر رکھا ہوا ہے اور ایک لڑکا اس کے پاس کھڑا ہوا ہے۔ تمینا اسے پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہے جس کی کشتی پر وہ مدتوں پہلے جزیرے آئی تھی۔ وہ بڑے ہیجان میں آ گئی ہے۔ اگر یہ وہی ہے تو اس کی کشتی زیادہ دور نہیں ہو سکتی۔ اسے معلوم ہے کہ اسے اس

موقعے کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے۔ اس کا دل دھڑ دھڑانے لگتا ہے، اور وہ واحد چیز جو وہ سوچ سکتی ہے یہ ہے کہ فرار کیسے کرے۔

لڑکا نیچے ٹیپ رکارڈر پر نظریں جمائے ہوئے ہے اور کولھے ٹھمکا رہا ہے۔ بچے اس کے ساتھ شرکت کرنے بھاگ کر آتے ہیں۔ وہ پہلے ایک کندھا آگے کو ہلاتے ہیں، پھر دوسرا، سر پیچھے پھینکتے ہیں، بازو لہراتے ہیں، اشارے والی انگلیاں اوپر یوں اٹھاتے ہیں جیسے کسی کو ڈرا دھمکا رہے ہوں، اور ٹیپ رکارڈر سے ابلتے ہوئے گانے کی سنگت پر خود بھی چلا چلا کر گانے لگتے ہیں۔

تمینا ایک چیڑ کے درخت کے موٹے سے تنے کے پیچھے چھپی کھڑی ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ بچے اسے دیکھ لیں، لیکن ان سے نظریں بھی نہیں ہٹا پاتی۔ وہ بالغ دنیا کی ترغیب کن عشوہ طرازیاں دکھا رہے ہیں، کولھوں کو یوں آگے پیچھے کر رہے ہیں جیسے جفتی کی نقل اتار رہے ہوں۔ ان کے بچہ جسموں پر منڈھی ہوئی حرکات کی شہوت رانی فحاشی اور معصومیت، پاکی اور فجور کے فرق کو فنا کر دیتی ہے۔ جنسیت اپنے سارے معانی سے تہی ہو جاتی ہے، معصومیت اپنے سارے معانی سے تہی ہو جاتی ہے، لفظ ٹوٹ جاتے ہیں، اور تمینا کو مالش ہونے لگتی ہے، جیسے اس کا شکم کھوکھلا ہو گیا ہو۔

اور گٹاروں کی ابلہی گرجتی رہتی ہے، بچے ناچتے رہتے ہیں، ناز و ادا سے اپنے چھوٹے چھوٹے پیٹ لہروں کی صورت حرکت دیتے رہتے ہیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی یکسر بے بضاعت باتیں ہیں جن سے تمینا کو متلی آ رہی ہے۔ حقیقت میں، اس کے پیٹ میں خالی پن کا یہ احساس کسی وزن کی ناقابلِ برداشت کمی کے باعث ہے۔ اور جیسے کوئی انتہا کسی لمحے بھی اپنی ضد میں بدل سکتی ہے، اسی طرح یہ کامل ہلکا پن دہشت ناک 'ہلکے پن کا بوجھ' بن گیا ہے، اور تمینا کو معلوم ہے کہ وہ اسے مزید ایک لمحہ برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ پلٹ کر بھاگ اٹھتی ہے۔

وہ راستے کے ساتھ ساتھ بھاگتی ہوئی پانی کے قریب پہنچتی ہے۔

اب وہ پانی کے کنارے آ گئی ہے۔ وہ چاروں طرف نظر دوڑاتی ہے۔ کوئی کشتی نہیں۔

وہ اس کی تلاش میں جزیرے کے ساحل کا پورا فاصلہ دوڑ کر طے کرتی ہے، جس طرح

پہلے دن کیا تھا۔ اسے کشتی کہیں نظر نہیں آتی۔ آخر کار وہ اسی مقام پر لوٹ آتی ہے جہاں درختوں کے حاشیے والا راستہ آ کر کنارے پر ختم ہوتا ہے۔ بچے ہر طرف دوڑتے پھر رہے ہیں، خوب جوش میں آئے ہوئے ہیں۔

وہ ٹھہر جاتی ہے۔

بچے اسے دیکھ لیتے ہیں اور چلاتے ہوئے اس کی سمت میں چھلانگیں لگاتے ہیں۔

27

وہ پانی میں کود پڑتی ہے۔

اس لیے نہیں کہ وہ خوفزدہ تھی۔ اس نے بہت پہلے ہی سب کچھ سوچ لیا تھا۔ کشتی کو جزیرے پہنچنے میں بہت دیر نہیں لگی تھی۔ اگرچہ اسے دوسرا کنارا نظر نہیں آ رہا تھا، اسے وہاں تیر کر پہنچے کے لیے کوئی فوق البشر طاقت نہیں درکار تھی۔

بچے چیختے چلاتے اس مقام پر پہنچے جہاں سے اس نے پانی میں چھلانگ لگائی تھی، اور کئی پتھر اس کے نزدیک ہی پانی پر آ کر گرے۔ لیکن وہ ایک بہت تیز رفتار پیراک تھی اور جلد ہی ان کے ناتواں بازوؤں کی زد سے دور نکل گئی۔

وہ تیرتی رہی، مدتوں میں پہلی بار وہ اپنا حال اچھا محسوس کر رہی تھی۔ وہ اپنے جسم کو محسوس کر سکتی تھی، اس کی سابقہ توانائی کو۔ وہ ہمیشہ ہی بڑی نفیس پیراک رہی تھی اور اپنے ہاتھوں کے ہر چھپاکے سے لطف اندوز ہوتی تھی۔ پانی سرد تھا، لیکن اس نے اس کا استقبال کیا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اسے بچوں کی تمام غلاظت سے پاک کر رہا ہو، ان کی رال اور ان کی نگاہوں سے۔

وہ بڑی دیر تک تیرتی رہی، اور سورج پانی میں ڈوبنے لگا۔

اور پھر ہر طرف اندھیرا چھا گیا، بڑا دبیز اندھیرا۔ نہ چاند تھا، نہ ستارے، لیکن تمینا نے خود کو اسی سمت میں بہنے دیا۔

28

لیکن آخر وہ کس سمت میں جا رہی تھی؟ پراگ کی؟

اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کا اب بھی وجود تھا۔

مغربی یورپ کے اس چھوٹے سے شہر کی سمت میں؟

نہیں۔ وہ بس دور ہو جانا چاہتی تھی۔

کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مرنے کی خواہش مند تھی؟

نہیں، نہیں، بالکل نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس میں زندہ رہنے کی بڑی جاندار خواہش تھی۔

لیکن اسے کچھ نہ کچھ تو ضرور اس دنیا کا اندازہ ہو گا جس میں رہنا چاہتی تھی۔

حیرت کی بات ہے، اسے نہیں تھا۔ اس کے پاس بس اس کا جسم باقی بچ رہا تھا اور زندہ رہنے کی بڑی بے پناہ خواہش۔ بس یہی دو چیزیں اور کچھ نہیں۔ وہ ان دونوں کو جزیرے سے دور لے جانا اور بچا لینا چاہتی تھی۔ اپنا جسم اور زندہ رہنے کی خواہش۔

29

پھر اجالا ہونے لگا۔ اس نے آنکھوں پر زور ڈال کر دوسرے کنارے کی ایک جھلک دیکھ لینے کی کوشش کی۔

لیکن اسے صرف پانی ہی پانی نظر آیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا، چند سو فیٹ دور، اس سبز جزیرے کا ساحل تھا۔

کیا یہ ہو سکتا ہے کہ وہ پوری رات ایک ہی جگہ پر تیرتی رہی ہے؟ اس پر مایوسی چھا گئی، اور جس لمحے امید جاتی رہی، یوں لگا جیسے اس کے بازو اور ٹانگوں کی طاقت بھی جواب دے گئی ہو، اور پانی ناقابلِ برداشت حد تک سرد محسوس ہوا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور تیرتے رہنے کی کوشش جاری رکھی۔ اسے اب دوسرے کنارے پر پہنچنے کی امید نہیں رہی تھی؛ اب تو

بس وہ صرف یہی سوچ رہی تھی کہ موت کیسے آئے گی، اور وہ پانی کے درمیان کہیں مرنا چاہتی تھی، تمام روابط سے دور، مچھلیوں کے ساتھ تنہا۔ جب اس کی آنکھیں بند تھیں تو وہ ذرا کی ذرا اونگھ گئی ہوگی، کیونکہ یکبارگی پانی اس کے پھیپھڑوں میں اترا آیا تھا اور وہ کھانسنے لگی تھی، اس کا دم گھٹنے لگا تھا، اور ٹھیک اس جان کنی کے عالم میں اسے بچوں کی آوازیں سنائی دیں۔

چھپاکے مارتے اور کھانستے ہوئے اس نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ قریب ہی اسے ایک کشتی دکھائی دی جس میں کئی بچے بیٹھے تھے۔ وہ چلّا رہے تھے۔ یہ دیکھ کر کہ تمینا نے انھیں دیکھ لیا ہے، انھوں نے چلانا بند کر دیا اور کشتی کھیتے ہوئے اس کے پاس آئے اور اسے گھورنے لگے۔ تمینا نے دیکھا کہ وہ کس قدر جوش میں آئے ہوئے تھے۔

اسے یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ وہ اسے بچانے کی کوشش کریں گے اور اسے پھر ان کے ساتھ کھیلنا پڑے گا۔ یکایک اضمحلال کی ایک لہر اسے مغلوب کر گئی۔ اس کے بازو اور ٹانگیں شل ہو گئیں۔

کشتی تقریباً اس کے پاس آ پہنچی تھی، اور پانچ بچوں کے چہرے اشتیاق کے ساتھ نیچے اس کی طرف جھانک رہے تھے۔

اس نے بڑی یاس سے سر ہلایا جیسے کہہ رہی ہو، ”مجھے مرنے دو۔ مجھے مت بچاؤ۔“

لیکن اسے خوفزدہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ بچوں نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کی۔ کسی نے بھی پتوار یا ہاتھ آگے نہیں بڑھایا، کسی نے اسے بچانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ بس اسے گھورتے ہی رہے، مشتاقانہ، آنکھیں پھٹاس کھلی ہوئی۔ وہ اس کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ ایک لڑکے نے اپنے چپّو کو کشتی کے سکّان کی طرح استعمال کیا تاکہ کشتی قریب رکھ سکے۔

ایک بار پھر اس نے پھیپھڑوں میں پانی نگل لیا اور کھانسنے اور اِدھر اُدھر ہاتھ مارنے لگی، اور محسوس کیا کہ وہ خود کو سطحِ آب پر اور قائم نہیں رکھ سکتی۔ اس کی ٹانگیں بتدریج بھاری ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ سیسے کے باٹوں کی طرح اسے نیچے کی سمت کھینچ رہی تھیں۔

اس کا سر پانی کے نیچے ڈبکی مار گیا۔ بڑی شدید جدوجہد سے وہ ایک دو بار اسے پانی سے اوپر اٹھا سکی، اور ہر بار اسے کشتی اور اسے دیکھتی ہوئی بچوں کی نگاہیں نظر آئیں۔

پھر وہ سطح کے نیچے غائب ہو گئی۔

ساتواں حصہ

سرحد

1

دورانِ مباشرت عورت کے بارے میں جو بات اسے سب سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوتی تو وہ اس کا چہرہ تھا۔ عورت کے جسم کی جنبشیں ایک بڑی سی فلمی ریل کو گردش میں لاتی ہوئی معلوم ہوتیں، اور اس کا چہرہ ٹیلی وژن کا وہ پردہ ہوتا جس پر فلم دکھائی جا رہی ہوتی۔ یہ تلاطم، توقع، جوش، تکلیف، آہوں، گدازی، اور کینے سے بھرپور ایک بڑی گرما دینے والی فلم ہوتی۔ بدقسمتی سے، ایڈوِج (Edwige) کا چہرہ خالی پردہ تھا، اور یان (Jan) اسے گھورتا رہتا، ان سوالات کی اذیت میں مبتلا جن کے جواب اسے نہیں مل سکتے تھے۔ کیا وہ اس سے بور ہوگئی ہے؟ کیا وہ تھکی ماندہ ہے؟ کیا اسے ہم بستری ناپسند ہے؟ کیا وہ زیادہ منجھے ہوئے عاشقوں کی عادی ہے؟ یا وہ اس ساکت و صامت سطح کے نیچے کچھ چھپائے ہوئے ہے، تجربات جن کی یان کو ہوا بھی نہیں لگی؟

ظاہر ہے وہ اس سے پوچھ سکتا تھا۔ لیکن وہ ایک عجیب ڈگر کے پابند ہو گئے تھے۔ یوں تو وہ خاصے باتونی واقع ہوئے تھے اور ایک دوسرے سے کھل کر بات بھی کرتے تھے، لیکن ان کے جسموں کے باہم پیوست ہونے کی دیر تھی اور ان کی زبان گنگ ہو جاتی۔

وہ اس صورتِ حال کی کبھی ٹھیک سے وضاحت نہ کر سکا۔ ہوسکتا تھا کہ ان تمام امور میں جن کا تعلق جسمانی لذت اور شہوت سے نہ ہو، ایڈوِج کا پہل کرنا زیادہ قرینِ قیاس تھا۔ اگرچہ وہ عمر میں کم تھی، اس نے کم از کم تین گنا زیادہ الفاظ ادا کیے اور دس گنا زیادہ صلاح مشورے دیے تھے۔ وہ اسے رحمدل، دانا ماں کی طرح سمجھتا تھا جو اس کا ہاتھ تھامے زندگی کی راہوں میں اس کی قیادت کر رہی ہو۔

اکثر اس کا جی چاہتا کہ دورانِ مباشرت ایڈوج کے کانوں میں فحش کلمات کی سرگوشیاں کرے، لیکن اس کے خیالات میں بھی اس کارروائی کا انجام تباہی میں نکلتا۔ اسے یقین تھا کہ اس کا سامنا احتجاج کی ایک نرم وگداز مسکراہٹ اور متواضع چشم پوشی سے ہوگا، اس ماں کی مسکراہٹ سے جو اپنے ننھے کو باورچی خانے کی الماری سے ممنوعہ ٹکی (cookie) چراتے ہوئے دیکھ رہی ہو۔

یا اس کا جی چاہتا کہ کوئی مطلق گھسی پٹی بات کی سرگوشی کرے، جیسے "اچھا لگا؟" دوسری عورتوں کے ساتھ یہ معمولی سا سوال بھی ہمیشہ نامناسب معلوم ہوا تھا۔ محبت کے فعل کو کوئی نام دے کر، خواہ یہ 'یہ' جیسا ننھا سا معصوم لفظ ہی کیوں نہ سہی، وہ دوسرے لفظوں کے لیے راہ ہموار کرتا جو جسمانی محبت کی عکاسی کے لیے آئینوں کے دستے کا کام دیتے۔ لیکن اسے پہلے ہی سے معلوم تھا کہ ایڈوج کیا جواب دے گی۔ ظاہر ہے، اچھا لگا، وہ بڑے سکون کے ساتھ کہے گی۔ کیا تم سچ مچ یہ خیال کرتے ہو کہ میں برضا و رغبت کوئی ایسا کام کروں گی جو مجھے ناپسند ہو؟ یہ کوئی معقول بات نہیں کر رہے ہو، یان، یا کر رہے ہو؟

نتیجے میں، نہ وہ سرگوشی میں فحش کلمات کہتا نہ پوچھتا کہ اچھا لگا۔ وہ خاموش رہتا، دریں اثنا ان کے جسم خالی ریل کو، ایسی ریل جس پر کوئی فلم نہ ہوتی، گھمانے کے طویل اور ہیجان آمیز عمل کی منزلیں طے کرتے۔

وہ اکثر دونوں کی باہم گزاری ہوئی راتوں پر اوس پڑ جانے کا الزام خود کو دیتا۔ اس نے ایڈوج کا ایک مضحکہ خیز خاکا بنا لیا تھا جو اب دونوں کے آڑے آجاتا اور اس کے لیے ایڈوج میں، اس کے حواس اور فحش گہرائیوں میں، دخول کو ناممکن بنا دیتا۔ حالت اتنی خراب ہوگئی تھی کہ اپنی ہر زبان گنگ رات کے بعد وہ عہد کرتا کہ اب اگلی بار ایڈوج کے ساتھ جفتی نہیں کرے گا۔ وہ اس سے ایک ذہین، وفادار، ناقابلِ تلافی دوست کی طرح محبت کرتا تھا، ایک داشتہ کی طرح نہیں۔ لیکن آدمی کے پاس داشتہ کو دوست سے الگ کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ جب بھی وہ ملتے، رات گئے تک بیٹھے باتیں کرتے رہتے، جس کا مطلب تھا ایڈوج شراب پیتی رہے گی اور اسے ہر چیز کے بارے میں اپنی رائے سے آگاہ، اور جب یان بری طرح تھکا ہوا ہوتا تو وہ یکدم رک جاتی اور بڑی پرسعادت اور خیر اندیش مسکراہٹ سے اس کی

طرف دیکھتی، اور یان اس موقعے پر، جیسے کسی ناقابلِ مزاحمت اشارے پر عمل کر رہا ہو، ایڈوج کے پستان کو چھوتا اور وہ کھڑی ہو کے کپڑے تن سے جدا کرنے لگتی۔

وہ میرے ساتھ مباشرت کیوں کرنا چاہتی ہے؟ اس نے کئی بار خود سے پوچھا۔ اسے اس کا جواب کبھی نہیں ملا۔ اسے تو بس اتنا ہی معلوم تھا کہ ان کی خاموش جفتیاں ناگزیر تھیں، اتنی ہی ناگزیر جتنا قومی ترانہ سنتے ہی کسی آدمی کا یکدم کھٹ سے کھڑا ہو جانا، حالانکہ اس سے نہ خود اسے کوئی فائدہ پہنچتا ہے نہ اس کے ملک کو۔

2

گذشتہ دو سو برس کے عرصے میں کالی چڑیا بن چھوڑ کر شہر چلی آئی ہے — پہلے برطانیۂ عظیم میں، اٹھارویں صدی کے ختم پر، پھر چند دہائیوں کے بعد پیرس اور وادیِ رور (Ruhr) میں۔ پوری انیسویں صدی کے دورانیے میں یہ ایک کے بعد ایک یورپ کے شہروں پر قبضہ کرتی رہی۔ 1900 کے لگ بھگ یہ ویانا اور پراگ میں آ بسی، اور پھر مشرق کی سمت میں بوداپیشت، بیلگریڈ، اور استنبول کی طرف عازمِ سفر ہوئی۔

عالم گیری طور پر، انسانی دنیا پر کالی چڑیا کا حملہ بلاشک و شبہ اہل ہسپانیہ کے جنوبی امریکہ پر حملے اور فلسطین میں یہودیوں کی بحالی سے زیادہ اہم ہے۔ ایک نوع کی دوسری نوع سے تعلق میں تبدیلی (مچھلیاں، پرندے، لوگ، پودے) اس تبدیلی سے زیادہ بلند درجہ چیز ہے جو ایک ہی نوع کے مختلف گروہوں کے تعلق میں رونما ہو۔ کرۂ ارض کو اس کی کوئی خاص پروا نہیں کہ بوہیمیا پر کیلٹس (Celts) بستے ہیں یا سلاو (Slav)، یا بسربیا (Bessarabia) پر رومینیوں کا قبضہ ہے یا روسیوں کا۔ لیکن اب اگر کالی چڑیا فطرت کے خلاف جاتی ہے اور انسان کے پیچھے پیچھے اس کی مصنوعی، خلافِ فطرت دنیا میں چلی آتی ہے، تو اشیا کے کرّاتی نظام میں کوئی چیز یقیناً بدل گئی ہے۔

تاہم کوئی متنفس بھی انسانی شہر پر کالی چڑیا کے حملے کے طور پر گذشتہ دو صدیوں کی تاریخ کی تفسیر کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ ہم سب کیا اہم ہے اور کیا اہم نہیں ہے کے ایک بے

چلک تصور کے اسیر ہیں۔ جسے اہم فرض کر لیتے ہیں اس کا بڑی گرم جوشی سے اتباع کرتے ہیں، جبکہ اس دوران میں وہ جسے غیر اہم خیال کرتے ہیں ہماری پیٹھ پیچھے چھاپا ماروں والی جنگ کرتا رہتا ہے، ہماری بے خبری میں دنیا کا نقشا ہی بدل دیتا ہے اور بالآخر ہمیں ناگہانی آ لیتا ہے۔

اگر کوئی یان کی سرگزشت لکھتا تو اس دور کی تلخیص جس کا میں ذکر کر رہا ہوں شاید ان الفاظ میں پیش کرتا:

ایڈوج سے معاشقہ پینتالیس سالہ یان کی زندگی میں ایک نئی منزل کا نشان دہ تھا۔ جو کھوکھلی، بے ضابطہ زندگی وہ اب تک گزار رہا تھا اس سے بالآخر تائب ہو کر اس نے مغربی یورپ کے جس شہر میں اس کی رہائش تھی اسے چھوڑ دینے اور سمندر پار جانے کا فیصلہ کیا، تاکہ اپنی توانائی کو بہتر طور پر اس کام کے لیے وقف کر سکے جس سے اسے اتنی، وغیرہ، وغیرہ، حاصل ہوئی۔

لیکن یان کا یہ فرضی سوانح نگار مجھ سے اس بات کی کیا وضاحت کرے گا کہ اس عرصے میں یان کی مرغوب کتاب ڈیفنیس اور کلوِے (Daphnis and Chloe) کا قدیم قصہ رہا؟ دو تقریباً بچوں کی محبت جو نہیں جانتے کہ جسمانی محبت کیا ہوتی ہے۔ ایک مینڈھے کی ممیاہٹ سمندر کی گھن گرج میں گھل مل جاتی ہے، ایک بھیڑ زیتون کی شاخ کے نیچے چر رہی ہے، اور ڈیفنیس اور کلوے ننگے پڑے ہیں، مبہم، بے انتہا خواہش سے بھرپور۔ وہ چمٹتے ہیں، ایک دوسرے کو بھینچتے ہیں، ایک دوسرے میں گندھ جاتے ہیں۔ اور اس حالت میں بڑی دیر تک پڑے رہتے ہیں، اس سے بے خبر کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ ان کے خیال میں بھینچنا ہی محبت کی مسرتوں کا سب کچھ ہے۔ وہ جنسی خیزش کے عالم میں ہیں، دل دھک دھک کر رہے ہیں، لیکن نہیں جانتے کہ مباشرت کرنے کا کیا مطلب ہوتا ہے۔

ہاں، یان کو یہی پارہ وجد میں لے آتا ہے۔

3

اداکارہ ژاں (Jeanne) بدھ کے مجسموں کی طرح، جو ساری دنیا کی نوادرات کی دکانوں میں بکتے ہیں، آلتی پالتی مارے بیٹھی ہے۔ وہ خوب باتیں کیے جا رہی ہے، اپنے انگوٹھے پر جمی

ہوئی نگاہیں بمشکل اٹھا رہی ہے، جو صوفے کے سامنے پڑی کافی کی میز کے کنارے کے گرد گول گول حرکت کر رہا ہے۔

یہ کوئی اعصابی عمل نہیں تھا، جیسے پیر تھپتھپانا، یا سر کھجانا؛ یہ شعوری اور دانستہ تھا، دلپذیر اور پرلطف؛ اس کا مدعا اپنے گرد طلسمی دائرہ بنانا تھا، اسے نہ صرف اپنی، بلکہ سبھی دوسروں کی توجہ کا مرکز بنانا تھا۔

وہ بڑی بہجت کے ساتھ اپنے انگوٹھے کے سفر کا تعاقب کرتی رہی، بس کبھی کبھار ہی نظر اوپر اٹھا کر یان کو دیکھ لیتی، جو اس کے عین سامنے بیٹھا تھا۔ وہ اسے بتا رہی تھی کہ حال ہی میں اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے۔ اس کا بیٹا، جو اس کے سابق شوہر کے ساتھ کسی اور شہر میں رہتا ہے، گھر سے بھاگ گیا تھا اور کئی دنوں تک غائب رہا۔ اس کے بیٹے کا باپ اتنا وحشی تھا کہ اس نے ژنّ کے اسپتال جانے سے آدھا گھنٹا پہلے فون کیا۔ اداکارہ ژنّ کو بخار آ گیا تھا، سر میں شدید درد ہو رہا تھا، اور ایک نابکار زکام اس پر مستزاد۔ ”میں ناک تک نہیں سنک سکتی تھی، میرے سائے نس اتنا درد کر رہے تھے!“ اس نے بتایا، اپنی بڑی بڑی حسین آنکھوں کو یان کی طرف دمکاتے ہوئے۔ ”میری ناک گوبھی کا پھول بن گئی تھی!“

وہ اس عورت کی طرح مسکرائی جو یہ جانتی ہو کہ سرخ، ٹھسی ہوئی ناک بھی اس پر حسین دکھائی دیتی ہے۔ وہ اپنی ذات کے ساتھ بڑی عدیم المثال ہم آہنگی کے ساتھ رہتی تھی۔ اسے اپنی ناک سے محبت تھی، اور اس ٹھسے سے جس کے ساتھ وہ زکام کو زکام کہتی تھی، اور ناک کو گوبھی کا پھول۔ اس کی سرخ ناک کی نرالی خوبصورتی اس کی حوصلہ مند روح کا تکملہ کرتی اور اس کے انگوٹھے کی مدوّر گردش ان دونوں لبھاوٹوں کو اپنی طلسمی محراب میں اکٹھا کر کے انھیں اس کی شخصیت کی ناقابلِ تحلیل اکائی میں بدل دیتی تھی۔

”پتا ہے، اس بخار نے واقعی میرا برا حشر کیا تھا؟ اور جانتے ہو ڈاکٹر نے کیا کہا؟ بولا، 'ژنّ، تمھیں دینے کے لیے میرے پاس بس ایک ہی مشورہ ہے۔ اپنا ٹیمپریچر لینا چھوڑ دو!'“ وہ ڈاکٹر کے مذاق پر دیر تک خوب ہنسنے کے بعد بولی، ”ارے ہاں، سرِ راہے، خیال تو کرو میری ابھی ابھی کس سے ملاقات ہوئی! پاسر (Passer)!“

پاسر، یان کا پرانا دوست تھا۔ مہینوں پہلے جب وہ اس سے آخری بار ملا تھا تو پاسر

عنقریب آپریشن کرانے والا تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ سرطان ہے، لیکن پاسر نے، جو ناقابلِ بیان توانائی اور اعتماد سے پھٹا پڑ رہا تھا، ڈاکٹروں کے جھوٹ پر یقین کر لیا تھا۔ بہر حال، وہ آپریشن بے حد خطرناک تھا، اور جب ایک بار دونوں تنہا تھے، پاسر نے یان سے کہہ دیا تھا، "اس کے بعد میں مرد نہیں رہوں گا، اگر تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو۔ مرد کی حیثیت سے میری زندگی ختم شد۔"

"پچھلے ہفتے کلےوسوں (Clevises) کی مضافاتی رہائش گاہ پر میری اس سے ملاقات ہوئی تھی،" ژنّ نے بات جاری رکھی۔ "کیسا شاندار آدمی ہے! ہم سبھوں سے عمر میں چھوٹا۔ میں تو بس اس کی گرویدہ ہوں!"

یان کو خوش ہونا چاہیے تھا کہ حسین اداکارہ اس کے دوست کو پسند کرتی ہے، لیکن وہ اس سے بہت زیادہ متاثر نہیں ہوا، کیونکہ سبھی پاسر کو چاہتے تھے۔ ان پچھلے چند سالوں میں سماجی مقبولیت کے غیر معقول بازار میں اس کی ساکھ میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوا تھا۔ عشائیوں میں ہونے والی گفتگو میں پاسر کے بارے میں چند اچھے کلمات کہنا تقریباً ناگزیر رسم سی بن گیا تھا۔

"تمھیں کلےوسوں کی مضافاتی رائش گاہ کے چاروں طرف ان خوش نما بنوں کا پتا ہے؟ خیر، وہاں ککر متے بہت ہوتے ہیں، اور مجھے ککر متے جمع کرنے میں بڑا مزہ آتا ہے! لیکن جب میں نے لوگوں سے کہا کہ میرے ساتھ بنوں کی سیر کو چلیں، تو کسی کا جی نہ چاہا۔ تب پاسر نے کہا کہ وہ چلے گا۔ پاسر! معلوم ہے وہ کتنا شدید بیمار ہے! میں تمھیں بتاتی ہوں، وہ ہم سے عمر میں چھوٹا ہے۔"

اس نے نیچے اپنے انگوٹھے کی طرف دیکھا، جو ہنوز میز کے گرد دائرے کی شکل میں حرکت کر رہا تھا، اور کہا، "خیر، تو ہم دونوں ککر متے اکٹھے کرنے نکل پڑے۔ بڑا مزہ آیا! ہم بنوں میں خوب پھرتے پھراتے رہے اور پھر ایک چھوٹا سا کیفے ڈھونڈ نکالا، چھوٹا سا غلیظ دیہاتی کیفے۔ بالکل ویسا جس کی میں متوالی ہوں! ایسا جہاں آدمی سستی سی سرخ شراب کا آرڈر دیتا ہے، جہاں مزدور آ کر پیتے پلاتے ہیں۔ پاسر شاندار تھا! میں بس اس کی گرویدہ ہوں!"

4

اس دور میں جب یہ سب کچھ ہوا، مغربی یورپ کے ریتیلے ساحلوں پر ہر گرما میں ایسی عورتوں کا جمگھٹا رہتا جو جسم پر بالائی کپڑے نہیں پہنتی تھیں، اور آبادی برہنہ پستانوں کے حمایتیوں اور مخالفوں میں بٹی ہوئی تھی۔ کلے وس خاندان — ماں، باپ، اور چودہ سالہ بیٹی — اپنے ٹیلی وژن کے سامنے بیٹھا اس موضوع پر ہونے والا مباحثہ دیکھ رہا تھا جس میں ہر ممکنہ معاصر ذہنی رجحان کے نمائندے شرکت کررہے تھے۔ نفسیاتی تجزیے کے ماہر نے ننگے پستان کی بڑی آتش بیانی سے مدافعت کی، سماجی طور وطریق کو بندشوں سے آزاد کرنے کا حوالہ دیا، اور اس نے فرد کو شہوت پرستانہ سرابوں کی جکڑ بند سے نجات دلانے میں جو کردار انجام دیا ہے اس کا۔ مارکسی نے ٹاپ لیس کے قضیے میں کبھی کوئی موقف اختیار کرکے نہ دیا (کمیونسٹ پارٹی کی رکنیت میں مذہبی پاکیزگی کے کٹر حامی اور آزاد منش دونوں ہی شامل تھے، اور سیاسی اعتبار سے ایک کو دوسرے کے خلاف کھڑا کرنا خلافِ مصلحت تھا)؛ اس کے بجائے، اس نے بحث کو بڑی استادی سے بورژوا معاشرے کے دورخی اصولوں کے زیادہ بنیادی مسئلے کی طرف موڑ دیا، جو تباہی کی طرف گام زن تھا۔ عیسائی نقطۂ نظر والے نے بالائی جسم کے کپڑوں کی مدافعت کو اپنے پر فرض گردانا، لیکن یہ بس اوپرے دل سے ہی کیا؛ وہ بھی روحِ عصر سے فرار نہیں کرسکتا تھا۔ اس کی حمایت میں جو واحد دلیل وہ پیش کرسکتا تھا وہ بچوں کی معصومیت تھی، جس کے احترام اور مدافعت پر ہر شخص مجبور تھا۔ اس پر ایک بڑی مستعد عورت فوراً ہی حملہ آور ہوگئی اور بولی کہ عریانی کی ریاکارانہ حرمت کے خلاف غلبہ آور ہونے کا بہترین وقت بچپن ہی ہے، اور یہ سفارش کی کہ تمام والدین کو چاہیے کہ گھر پر ننگے گھوما کریں۔

یان، کلے وسوں کے یہاں ٹھیک اس وقت پہنچا جب پنچ صاحب مباحثے کے خاتمے کا اعلان کررہے تھے، لیکن بحث نے گرما گرمی کی جو فضا قائم کردی تھی وہ کافی دیر تک باقی رہی۔ یہ سب آزاد خیال لوگ تھے، چنانچہ عام طور پر انگیا مخالف۔ لاکھوں عورتوں نے جس کرّ وفر کے ساتھ یہ رسوائے زمانہ جزوِلباس اشارہ ملتے ہی اتار پھینکا تھا، ان لوگوں کے حساب سے نوعِ انسانی کے غلامی کی زنجیروں کو اتار پھینکنے کی علامت تھا۔ پستان برہنہ عورتیں

عورتیں کلے وس کے اپارٹ مینٹ میں غیر مرئی امیزنیوں (Amazons) کی طرح گھومتی پھرتی تھیں۔

جیسا کہ میں نے اشارہ کیا ہے، کلے وس خاندان کے افراد اچھے ترقی پسند تھے اور اچھے ترقی پسند خیالات رکھتے تھے۔ ترقی پسند خیالات کی بہت سی قسمیں ہیں، اور کلے وس ان میں سے صرف ممکنہ بہترین قسم ہی کی سرپرستی کرتے تھے۔ ترقی پسند خیالات میں بہترین وہ ہے جو کم از کم اتنا ترغیب انگیز ضرور ہو کہ اس کے حامی اپنے مختلف ہونے پر فخر کر سکیں، لیکن ساتھ ساتھ اتنا مقبولِ عام بھی ہو کہ الگ تھلگ رہ جانے کا خطرہ اپنی کامیابی کے قائل حوصلہ افزا ہجوم کے باعث ناممکن ہو جائے۔ مثال کے طور پر، اگر کلے وس انگیا مخالف ہونے کی جگہ سرے سے لباس کے مخالف ہوتے، اگر وہ یہ کہتے کہ لوگوں کو سڑکوں پر ننگے پھرنا چاہیے، تو اس صورت میں بھی وہ ایک ترقی پسند خیال کی حمایت کر رہے ہوتے، لیکن حتمی طور پر سب سے ممکنہ بہترین ترقی پسند خیال کی نہیں۔ یہ اتنا انتہا پسندانہ ہوتا کہ اس سے عہدہ برا ہونا مشکل ہو جاتا، اس کی حمایت میں ضرورت سے زیادہ توانائی درکار ہوتی (ممکنہ بہترین ترقی پسندانہ خیالات اپنی مدافعت تقریباً خود ہی کرتے ہیں)، اور اس کے حامیوں کو یہ دیکھنے کی تسکین کبھی نہ ہوتی کہ بالکل غیر مقلدانہ موقف اچانک سب کے لیے قابلِ قبول موقف بن گیا ہے۔

جسم کے اوپری حصے کے کپڑوں اور انگیوں کے خلاف انھیں لعن طعن کرتے سن کر یان کو اس چھوٹی سی سطح پیا کہلانی والی لکڑی کی چیز کا خیال آ گیا جو اس کا اینٹوں کی چنائی کرنے والا دادا معمولاً اوپر کو چنی جانے والی دیوار کی سطح پر جما دیا کرتا تھا۔ اس آلے کے وسط میں شیشے کی پلیٹ کے نیچے پانی کے قطرے کے اندر بلبلہ تھا جو اپنے جھکاؤ سے بتا دیا کرتا تھا کہ اینٹیں ہموار چنی گئی ہیں یا نہیں۔ کلے وس خاندان ایک روحانی ہوائی بلبلے کے کام آ سکتا تھا۔ انھیں کوئی خیال پیش کریں، اور وہ اس کی کامل نشان دہی کر دیں گے کہ یہ ممکنہ بہترین ترقی پسندانہ خیال ہے یا نہیں۔

جب وہ یان کی خاطر بحث کی روداد اپنے الٹ پلٹ انداز میں بیان کر چکے تو پاپا کلے وس نے اس کی طرف جھک کر مذاقاً کہا، "بہ شرطے کہ چھاتیوں کو خوش نما ہونا چاہیے، بس اصلاح کامیاب رہے گی، کیوں کیا خیال ہے تمھارا؟"

اب سوال یہ ہے کہ پاپا کلےوس نے اپنی رائے کا اظہار ٹھیک انھیں الفاظ میں کیوں کیا؟ وہ ایک بے مثال میزبان تھے، اور ہمیشہ اپنے مہمانوں کے سامنے باتوں کو پیش کرنے کا مناسب طریقہ تلاش کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ چونکہ یان عورت باز مشہور تھا، پاپا کلےوس نے برہنہ چھاتیوں سے رضامندی کا اظہار ہزار سالہ غلامی کے خاتمے پر اس کے گہرے 'اخلاقی' جوش کے حوالے سے نہیں کیا؛ بلکہ، انھوں نے بیچ کی راہ نکالی اور (اپنے تئیں یان کے ذوق کی پاس داری کرتے ہوئے گوخود اپنے تیقنات کے خلاف) اس کا اظہار ایک خوش وضع پستان پر 'جمالیاتی' جوش کے حوالے سے کیا۔

انھوں نے بے لاگ اور موقع شناس دونوں ہی ہونے کی کوشش کی۔ کھلم کھلا یہ کہنے کی جرأت نہیں کی کہ بہتر ہے بدصورت چھاتیاں ڈھکی چھپی ہی رہیں۔ گو اس بیّن طور پر ناقابل قبول خیال کا اظہار نہیں کیا گیا تھا، یہ بالکل صاف طور پر ان کے بیان سے برآمد ہوتا تھا، اور ان کی چودہ سالہ بیٹی کی چاند ماری کے لیے بڑا آسان سا ہدف بن گیا۔

"اور بیئر سے پھولی ہوئی توندیں، ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟" وہ پھٹ پڑی۔ "بیئر سے پھولی ہوئی ان بدہیئت توندوں کے بارے میں کیا کہیں گے جو مرد لوگ ساحلِ آب پر نہایت بے شرمی سے نچاتے پھرتے ہیں؟"

"بہت خوب کہا!" ماما کلےوس نے ہنستے اور تالیاں بجاتے ہوئے نعرۂ تحسین بلند کیا۔

پاپا کلےوس بھی اس میں شامل ہو گئے۔ انھیں فوراً ہی یہ بات نظر آ گئی کہ ان کی بیٹی درست کہہ رہی تھی اور وہ بدقسمتی سے ایک بار پھر اپنے مصالحت کوشی کے رجحان کے ہاتھوں مارے گئے ہیں جس پر بیوی اور بیٹی اکثر ان کی لعن طعن کیا کرتی تھیں۔ حقیقت میں وہ اتنے شدید صلح پسند واقع ہوئے تھے کہ مصالحت کا اقرار کرنے پر بھی راضی تھے، اپنی رائے سے منحرف ہونے اور بیٹی کی انتہا پسندانہ رائے کو ماننے کے لیے تیار۔ اور چونکہ بیٹی جس بیان پر حملہ آور ہوئی تھی وہ ان کے خیال میں وہی موقف تھا جو عین ممکن ہے یان اختیار کرتا، خود ان کا اپنا موقف نہیں، بیٹی کی بلاتردد حمایت کرنے اور اپنی پدرانہ جبلّتوں کی تسکین کرنے کے اس بہانے کے لیے وہ شکر گزار تھے۔

ماں باپ دونوں کی تحسین سے جوش میں آ کر لڑکی بولے گئی۔ "آپ لوگوں کے خیال

میں ہمارے اوپر کے کپڑے نہ پہننے کی وجہ آپ لوگوں کو بھڑکانا ہے۔ نہیں، یہ ہم اپنی خاطر کرتی ہیں، کیونکہ ہمیں پسند ہے، کیونکہ یہ اچھا لگتا ہے، کیونکہ اس طرح ہمارے جسم سورج سے قریب آتے ہیں! آپ لوگ ہمیں جنسی کھلونوں کے علاوہ کچھ اور سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے!"

ماما اور پاپا کلے وِس نے ایک بار پھر تحسین کے ڈونگرے برسائے، گو اس بار ان کی دادِ تحسین میں تھوڑی سی مختلف گمک تھی۔ بیٹی کا بیان درست ہی تھا، لیکن اس کی عمر کو دیکھتے ہوئے قدرے نامناسب بھی۔ اگر ایک آٹھ سالہ لڑکا یہ کہے، "ماں، فکر نہ کرو۔ اگر کوئی تمھیں روکے ووکے گا تو میں تمھاری حفاظت کروں گا،" تو لڑکے کے والدین اس کی واہ واہ کریں گے۔ ظاہر ہے، اس کی نیت قابلِ داد ہے۔ لیکن چونکہ اس سے کچھ زیادہ ہی اعتماد جھلکتا ہے، والدین اپنی واہ واہ کو ایک طنزیہ مسکراہٹ سے قدرے معتدل کر دیں گے۔ بس یہی طنزیہ مسکراہٹ کلے وِسوں کی دوسری واہ واہ میں اعتدال لا رہی تھی، اور ان کی بیٹی نے، جس نے در پردہ طنز کو محسوس کر لیا تھا اور ناپسند کیا، ضدّی پن سے دہرایا، "وہ دن لد لیے، ہمیشہ کے لیے۔ آپ لوگ مجھے کبھی کسی کا جنسی کھلونا بنتے نہیں دیکھیں گے۔"

اس بار والدین نے بس ہلکے سے سر ہلا دیا — سپاٹ چہرے کے ساتھ، تاکہ اس قسم کے بیانات دینے کے لیے اسے اور شہ نہ ملے۔

لیکن یان کم از کم اس کی طرف ایک فقرہ اچھالنے سے خود کو باز نہ رکھ سکا۔ "کاش تم جانتیں کہ جنسی کھلونا نہ بننا کتنا آسان ہے۔"

اس نے یہ نرمی سے کہا، لیکن آواز میں اتنے دردمندانہ اخلاص کے ساتھ کہ کمرے کی فضا میں دیر تک اس کی گونج باقی رہی۔ یہ ایک ایسی بات تھی جسے وہ خاموشی سے نظر انداز نہیں کر سکتے تھے، لیکن اس پر ردِعمل ظاہر کرنے سے بھی معذور تھے۔ ایک طرف یہ کسی تائید کی مستحق نہیں تھی، کیونکہ ترقی پسندانہ نہیں تھی؛ نہ دوسری طرف کسی تردید کی، کیونکہ خاص طور پر ترقی پسندی کے مخالف بھی نہیں تھی۔ یہ بیانوں میں بدترین بیان تھا؛ یہ فیشن ایبل مسائل کے دائرے سے باہر تھا۔ یہ نیکی اور بدی سے ماورا تھا، اپنی ناموزونیت میں مطلق۔

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ در آیا، جس کے دوران یان گھبراہٹ سے مسکرایا، جیسے اپنے

کیے پر معذرت چاہ رہا ہو۔ پھر پاپا کلے وس نے، جنھیں اپنے بھائی بند انسانوں کے درمیان خلیج پاٹنے میں ید طولیٰ حاصل تھا، گفتگو کا رخ بدل کر پاسر کی طرف کر دیا جس سے وہ سبھی واقف تھے۔ پاسر کے ضمن میں ان کی پسندیدگی انھیں دوبارہ ایک دوسرے کے قریب لے آئی۔ کلے وس نے پاسر کی رجائیت کی داد دی، زندگی سے اتنے مستحکم طور پر چمٹے رہنے کی کہ جسے کسی ڈاکٹر کی تشخیص بھی متزلزل کرنے پر قادر نہیں تھی۔ اور اب پاسر کا وجود سمٹ کر اس تنگ سی پگڈنڈی میں محدود ہو گیا تھا جس پر کسی عورت کا گزر نہ تھا، نہ جہاں کھانا پینا ہی تھا، اور نہ حرکت ۔۔ مستقبل سے تہی۔ وہ ابھی حال ہی میں ان کے مضافاتی مقام پر ان سے ملنے آیا تھا۔ اداکارہ ژنّ بھی وہاں آئی تھی۔

یان سوچ رہا تھا کہ کلے وس سطح پیا ژنّ پر کیا ردِعمل ظاہر کرے گا، جس کے انانیت پرست طور وطریق خود اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھے۔ لیکن بلبلہ یہ بتا رہا تھا کہ یان کا قیاس غلط رہا ہے۔ کلے وس غیر مشروط طریقے پر ژنّ کے پاسر سے برتاؤ کو پسند کرتا تھا۔ ژنّ نے خود کو پاسر کے لیے بالکلیہ وقف کر دیا تھا۔ وہ بڑی شفقت سے اس کے ساتھ پیش آئی تھی۔ خاص طور پر اِن الم انگیز وقتوں میں جن سے وہ دوچار تھی۔

"المیہ وقت؟" بھلکڑ یان نے حیرانی سے پوچھا۔

کیا یہ ممکن ہے کہ یان نے سنا نہیں تھا؟ ژنّ کا لڑکا گھر سے بھاگ گیا تھا اور دنوں غائب رہا تھا! اسے کا باقاعدہ نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا! لیکن پاسر پر نظر ڈالنے کی دیر تھی، جو بہر حال موت کے منہ میں کھڑا تھا، اور وہ اپنے بارے میں سب کچھ بھول بھال گئی۔ اسے مایوسی سے نکالنے کے لیے بڑی زندہ دلی سے چلائی، "میرے ساتھ کُکر متے اکھاڑنے کون چلے گا؟" اچھا، تو پاسر نے کہا کہ وہ چلتا ہے، سو ہم سب نے معذرت کر لی۔ ہم دیکھ سکتے تھے کہ وہ پاسر کے ساتھ خلوت کی جویا تھی۔ تین گھنٹے وہ بنوں میں مٹر گشت کرتے رہے۔ پھر تھوڑی سی مے نوشی کے لیے ایک کیفے میں جا رکے۔ پاسر کو چلنے اور شراب پینے کی ممانعت ہے۔ وہ تھکن سے چور چور، لیکن شادماں، لوٹا۔ اگلے دن انھیں اسے اسپتال لے جانا پڑا۔

"جو میں نے سنا ہے اس کے مطابق، بڑی بری حالت میں ہے،" پاپا کلے وس نے کہا۔ "تمھیں چاہیے کہ اس سے ملنے جاؤ،" اس نے ملامتی انداز میں اضافہ کیا۔

5

آدمی کی شہوانی زندگی کی ابتدا میں، یان نے اپنے سے کہا، برانگیختگی تو ہوتی ہے، تسکین نہیں؛ اور آخر میں، تسکین تو ہوتی ہے، برانگیختگی نہیں۔

بے تسکین برانگیختگی ڈیفنیس ہے؛ تسکین بلا برانگیختگی وہ لڑکی تھی جو کرایے پر ملنے والی کھیلوں کی اشیا کی دکان میں کام کرتی تھی۔

سال بھر ہوا جب وہ پہلی بار اس سے ملا اور اپنے اپارٹ مینٹ چلنے کی دعوت دی تھی تو اس نے ایک ناقابلِ فراموش بات کہی۔ "مجھے یقین ہے کہ تیکنیکی اعتبار سے یہ اچھا ثابت ہوگا؛ رہا جذباتی اعتبار، تو اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

یان نے کہا کہ جہاں تک خود اس کا تعلق ہے، تو وہ یقین رکھے کہ معاملہ جذباتی پہلو کے حساب سے بھی ٹھیک رہے گا۔ لڑکی نے اس کی بات اسی طرح قبول کرلی جس طرح دکان پر اسکیز کی ضمانتی رقم قبول کرتی تھی، اور جذبات کے بارے میں کبھی دوبارہ کچھ نہیں کہا۔ رہی تیکنیک، تو لڑکی نے اسے تقریباً تھکا مارا تھا۔

وہ اورگیزم کی دیوانی تھی۔ یہ اس کا مَت تھا، اس کا واحد مقصد، حفظانِ صحت کا اصول، تندرستی کی علامت؛ لیکن یہ فخر بھی تھا، کیونکہ یہ اسے کم خوش قسمت عورتوں سے ممتاز کرتا تھا، جیسے تفریحی کشتی یا مشہور و معروف منگیتر کا ہونا۔

اور یان کے لیے دونوں چیزوں میں سے ایک بھی بہم پہنچانا آسان نہیں تھا۔ "اور تیز،" وہ اسے شہ دیتی، "اور تیز،" اور پھر "ہولے ہولے،" اور ایک بار پھر "خوب زور سے، خوب زور سے۔" وہ کسی پتواری کی طرح تھی جو دوڑ کی کشتی کے عملے پر احکام جھاڑ رہی ہو۔ صرف اپنے شہوت خیز منطقوں میں پوری طرح منہمک، وہ اس کے ہاتھ کی صحیح وقت پر صحیح مقام تک قیادت کرتی۔ وہ جب بھی اس کی طرف دیکھتا تو اسے اس کی بے صبری آنکھیں اور بے تابی سے پچھاڑیں کھاتا جسم ہی نظر آتا — ایک سفری آلہ جس کا کام وہ چھوٹے موٹے ارتعاشات پیدا کرنا تھا جو اس کا مفہوم اور مقصدِ حیات بن گئے تھے۔

آخری بار جب وہ اس کے اپارٹ مینٹ سے نکلا تو اسے اچانک ہرتز (Hertz) کا

خیال آ گیا، جو وسطی یورپ کے ایک چھوٹے سے شہر میں جہاں اس کا بچپن گزرا تھا اوپرا کا ہدایت کار تھا۔ وہ اپنی گلوکار عورتوں سے اس کا طلبگار رہوتا کہ وہ اپنے پورے پورے رول تخلیے میں خاص برہنہ ریہرسلز کے دوران اس کے سامنے ادا کریں۔ یہ اطمینان کر لینے کے لیے کہ وہ اپنے جسموں کو صحیح حالت میں برقرار رکھتی ہیں، وہ ان سے ان کی مقعد میں پینسل ڈلواتا۔ جس سمت میں پینسل اشارہ کرتی اس سے ریڑھ کی ہڈی کے رخ کا اندازہ ہوجاتا، اس طرح جز رس ہدایت کار گلوکارہ کے ہر قدم، جسم کی ہر جنبش پر سائنسی صحت کے ساتھ قابو رکھتا۔

ایک مرتبہ ایک نوجوان سوپرانو (soprano) برہم ہوگئی اور جا کر منتظمین سے شکایت کر دی۔ ہرتز نے اپنی مدافعت میں کہا کہ اس نے کبھی کسی گلوکارہ کی عصمت دری نہیں کی ہے، کہ اس نے تو کبھی انھیں چھوا تک نہیں ہے، جو بالکل درست تھا، لیکن اس سے اس کی پینسل والی حرکتیں اور بھی کج رو نظر آنے لگیں۔ بالآخر ہرتز کو شہر چھوڑنا پڑا۔

اس کے معاملے کو بہت شہرت ملی، اور یان نوعمری ہی سے اوپرا کے تماشے دیکھنے لگا۔ وہ تمام عورتوں کو — ان کی مبالغہ آمیز حرکات، خمیدہ سروں، اور پھٹا س کھلے منھوں کے ساتھ — برہنہ تصور کرتا۔ جب اورکیسٹرا آہ وزاری کرتا اور اور عورتیں اپنے بائیں پستان سنبھالتیں، تو اسے ان کے ننگے چوتڑوں کے باہر پینسلیں نکلی نظر آتیں۔ اس کا دل دھڑ دھڑانے لگتا۔ وہ ہرتز کی برانگیختگی سے خود برانگیختہ ہوجاتا! (وہ دن ہے اور آج کا دن، وہ اوپرا کو کسی اور روشنی میں دیکھنے کا اہل نہیں، اور آج بھی جب وہ کسی اوپرا گھر میں داخل ہوتا ہے، تو خود کو وہ چھوٹا سا بچہ محسوس کرتا ہے جو چپ چپاتے کوئی گندی فلم دیکھنے گھس گیا ہو۔)

ہرتز بدی کا برتر کیمیا گر تھا، یان نے اپنے سے کہا۔ اس نے برانگیختگی کا نسخہ مقعد میں گھسی پینسل کی شکل میں دریافت کیا تھا۔ یان کو شرمساری محسوس ہوئی۔ ہرتز نے کبھی اپنے کو نڈھال کر دینے والی فرمائشی کارگزاری کے جھانسے میں نہیں آنے دیا ہوتا جو یان نے ابھی ابھی اس لڑکی کے جسم پر انجام دی تھی جو کھیلوں کی کرایے پر دی جانے والی اشیا کی دکان پر کام کرتی تھی۔

6

جس طرح کالی چڑیا کا حملہ یورپی تاریخ کے معکوس پہلو کی نمائندگی کرتا ہے، اسی طرح وہ کہانی جو میں سنا رہا ہوں یان کی زندگی کے الٹے رخ پر وقوع پذیر ہوتی ہے۔ میں نے اسے واقعات کے ان منتشر ٹکڑوں سے جوڑا ہے جن پر یان نے شاید کبھی کوئی خاص توجہ نہ دی تھی، کیونکہ اس کی زندگی کا سامنے کا رخ دنیا جہان کی دوسری فکروں اور پریشانیوں میں الجھا ہوا تھا: امریکہ میں نوکری کی پیشکش، اشد پیشہ ورانہ ذمے داریاں، روانگی کی تیاری۔

زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ سڑک پر اس کی باربرا سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ باربرا نے اس سے ملامتی انداز میں پوچھا کہ وہ اس کے گھر آنے کے دعوت نامے کیوں کبھی قبول نہیں کرتا۔ باربرا کا گھر اجتماعی جنسی تقریبات کے لیے مشہور تھا۔ یان کو رسوائی کا خوف تھا اور برسوں سے اس کی دعوت قبول کرنے سے انکار کرتا چلا آ رہا تھا۔ لیکن اس بار وہ مسکرا دیا اور بولا، "بڑی خوشی سے۔ ضرور آؤں گا۔" اسے معلوم تھا کہ اب وہ دوبارہ اس شہر میں کبھی قدم دھرنے والا نہیں، چنانچہ اب احتیاط وحتیاط کی کیا ضرورت تھی۔ اس نے باربرا کے گھر کا تصور اس طرح کیا کہ شادماں برہنہ جسموں سے بھرا ہوا ہے، اور اپنے سے کہا کہ بہر حال یہ کوئی اتنی گئی گزری الوداعی تقریب تو کیا ثابت ہوگی۔

ہاں، یان خدا حافظ کہہ رہا تھا۔ اب یہ بات اس کے ذہن میں آ گئی تھی کہ چند ماہ میں وہ سرحد پار کر رہا ہوگا۔ لیکن 'سرحد' کا لفظ عام جغرافیائی اصطلاح کے مفہوم میں ایک اور سرحد کا پیکر بھی ذہن میں لوا لاتا تھا، ایک ناقابلِ گرفت اور غیر مادی سرحد جس کے بارے میں وہ اِن دنوں رہ رہ کر سوچتا رہا تھا۔

یہ کیسی سرحد تھی؟

اس نے جس عورت سے دنیا میں سب سے زیادہ محبت کی تھی (اُس وقت اس کی عمر تیس سال تھی) وہ اس سے کہا کرتی تھی (اور یہ سن کر وہ بے حد مایوس ہوجائے گا) کہ اس کی زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ ہاں بالکل، وہ زندہ رہنا چاہتی تھی، اسے زندگی سے عشق تھا، لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس کا "میں زندہ رہنا چاہتی ہوں" مکڑی کے جال کے تاروں سے کاتا گیا

تھا۔ ایک شخص کے لیے اس سرحد کو پار کرنا اتنا آسان، اتنا زیادہ آسان ہوتا ہے جس کے ماورا ہر شے معنی کھو بیٹھتی ہے: محبت، اعتقاداتِ صمیم، ایمان، تاریخ۔ انسانی زندگی — اور اسی میں اس کا راز پنہاں ہے — اس سرحد کے فوری قرب و جوار میں واقع ہوتی ہے، بلکہ اس سے براہ راست وابستگی کے عالم میں؛ وہ اس سے میلوں دور نہیں ہوتی، بلکہ انچ کے ذرہ برابر۔

7

ہر آدمی کی دو شہوانی سرگزشتیں ہوتی ہیں۔ عام طور پر لوگ پہلی کے بارے میں ہی گفتگو کرتے ہیں: معاشقوں اور یک شبی مباشرتوں کی فہرست۔

لیکن دوسری سرگزشت بعض اوقات زیادہ دلچسپ ہوتی ہے: عورتوں کی ایک پوری قطار جن کی ہمیں خواہش تھی، وہ جو ہماری گرفت سے بھاگ نکلی تھیں۔ یہ ضائع کردہ مواقع کی ماتمی تاریخ ہوتی ہے۔

لیکن عورتوں کی ایک تیسری، پراسرار، اور پریشان کن قسم بھی ہوتی ہے: وہ عورتیں جو ہمیں کبھی حاصل نہیں ہوسکتی تھیں۔ ہم انھیں چاہتے تھے، وہ ہمیں چاہتی تھیں، لیکن ہمیں یہ دیکھ لینے میں دیر نہیں لگتی تھی کہ وہ ہماری پہنچ سے دور ہیں، کہ ان کے لیے ہم 'سرحد کے اُس پار' ہیں۔

یان ریل گاڑی میں بیٹھا ہوا کچھ پڑھ رہا تھا کہ ایک خوبصورت لڑکی جس سے وہ واقف نہیں تھا ڈبے میں آ بیٹھی (واحد خالی سیٹ یان کے سامنے والی تھی) اور اسے دیکھ کر سر ہلایا۔ اس نے بھی سر ہلا دیا، اور غور کرنے لگا کہ ان کی ملاقات کہاں ہوئی ہوگی۔ وہ اپنی کتاب کی طرف پلٹا لیکن اس پر توجہ نہ دے سکا۔ اسے لڑکی خود کو دیکھتی، اس کے بارے میں سوچتی، اس سے کسی بات کی توقع کرتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"تمھیں کہاں دیکھا تھا؟" اس نے کتاب بند کرتے ہوئے پوچھا۔

یان کو یاد کرنے میں دقت پیش آ رہی تھی تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ وہ پانچ سال پہلے بعض لوگوں کے گھر پر ملے تھے جن سے یان بالکل واقف نہیں تھا۔ لیکن بالآخر

اسے یاد آ ہی گیا اور اس نے لڑکی سے چند سوالات کیے: وہ اس وقت ٹھیک کیا کر رہی تھی، اس کی ٹولی میں کون کون شامل تھے، اب کہاں کام کرتی ہے، اور کیا یہ کام اسے پسند ہے۔

اپنے اور عورت کے درمیان بعجلت چنگاری پیدا کرنے کی اسے عادت تھی۔ لیکن اس بار اسے یوں لگا جیسے وہ افرادِ عملہ سے متعلق دفتر کے کسی رکن کی طرح ملازمت کے متلاشی کسی امیدوار کا انٹرویو لے رہا ہو۔

اس نے بولنا بند کیا اور کتاب کھول کر پڑھنے کی کوشش کی، لیکن اس خیال کو نہیں جھٹک سکا کہ ایک ایسی غیر مرئی تفتیشی کمیٹی اس کا مشاہدہ کر رہی ہے جس نے اس کے جملہ کوائف کا بہی کھاتا رکھا ہوا ہے اور اس کی ہر جنبش کا اندراج کر لیتی ہے۔ وہ بڑی ڈھٹائی سے صفحوں کو تکنے لگا، یہ جانے بغیر کہ ان پر کیا لکھا ہے، اسے بس مبہم سا شعور تھا کہ کمیٹی بڑے صبر کے ساتھ ان منٹوں کا حساب رکھ رہی ہے جن میں وہ مہر بہ لب رہا ہے۔ یہ سب اس کے فائنل گریڈ کا حصہ ہے۔

اس نے کتاب پھر بند کر دی، بارِ دگر لڑکی سے ایک تر و تازہ گفتگو کرنے کی کوشش کی، اور ایک بار پھر محسوس کیا کہ اس سے کام نہیں چلے گا۔

اس نے فیصلہ کیا کہ اس کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ وہ دونوں لوگوں سے کھچا کھچ بھرے ڈبے میں تھے، چنانچہ اس نے لڑکی کو ڈائننگ کار میں چلنے کی دعوت دی جہاں انھیں تنہائی نصیب ہو سکتی تھی۔ یہاں گفتگو قدرے آزادانہ رہی، لیکن چنگاری پیدا کرنے سے وہ ہنوز کوسوں دور تھا۔

وہ اپنے ڈبے میں لوٹ آئے۔ اس نے دوبارہ کتاب کھول لی، اور دوبارہ اس کا اور چھور پلے نہیں پڑا۔

کچھ دیر تک وہ اس کے سامنے خاموشی کے ساتھ بیٹھی رہی، پھر اٹھ کر کوری ڈور میں گئی اور کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔

یان بری طرح سٹپٹا گیا۔ اسے لڑکی پسند تھی لیکن اس کے سارے طرزِ عمل میں ایک دبا دبا سا التہاب تھا۔

اس نے ایک آخری بار صورتِ حال کو سدھارنے کی کوشش کی۔ وہ بھی کوری ڈور میں

آ کر لڑکی کے برابر کھڑا ہو گیا۔ بتایا کہ اس کو نہ پہچاننے کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس کے بالوں کا انداز بدلا ہوا ہے۔ اس نے لڑکی کے بال پیشانی سے پیچھے کی طرف کیے اور اس کے اچانک بالکل مختلف چہرے کی طرف دیکھا۔

"ارے ہاں، اب پہچان گیا" وہ بولا۔ ظاہر ہے وہ نہیں پہچانا تھا۔ لیکن بات یہ نہیں تھی۔ ساری بات تو یہ تھی کہ وہ اس کی پیشانی کو زور کے ساتھ ہاتھ سے دبانا چاہتا تھا، اس کے چہرے کو تھوڑا سا جھکانا چاہتا تھا، اور اس کی آنکھوں میں جھانکنا چاہتا تھا۔

اس نے زندگی میں کتنی بار ہاتھ مختلف عورتوں کے سروں پر رکھ کر کہا تھا، "ذرا دیکھوں تو سہی، اس طرح کیسی لگتی ہو۔" یہ وہ تحکمانہ لمس، وہ آمرانہ نگاہ تھی جو کھڑے کھڑے سیلاب کا رخ موڑنے میں کامیاب رہ چکی تھی۔ اس میں مکمل غلبہ حاصل کر لینے کے بے حد اہم منظر کی توقع جھلکتی محسوس ہو رہی تھی (اور مستقبل سے اس کی یاد آوری کرنے کی)۔

لیکن اس بار یہ بے اثر ہی رہا۔ اس کی اپنی نگاہ اس نگاہ سے کہیں زیادہ کمزور تھی جو اسے اپنے اوپر ایک بوجھ کی طرح پڑتی ہوئی محسوس ہوئی، تفتیشی کمیٹی کی تشکیک آمیز نگاہ، جو خوب آگاہ تھی کہ وہ اپنے کو دہرا رہا ہے، اور صاف صاف کہہ رہی تھی کہ ہر تکرار محض نقالی ہے اور ہر نقالی بے قدر و قیمت۔ ناگاہ یان نے خود کو لڑکی کی نگاہ سے دیکھا۔ اسے اپنے قابلِ رحم لمس اور نگاہ کی گنگ نقالی نظر آئی، ایک گھسا پٹا سینٹ وائٹس (St.Vitus) کا رقص جس کی ساری معنویت برسوں کی تکرار سے جاتی رہی ہو۔ اپنی بے ساختگی، اپنی واضح اور براہ راست اثر انگیزی کھو کر، یہ اچانک ناقابلِ برداشت طور پر بوجھل معلوم ہونے لگا تھا، جیسے سو پاؤنڈ کے بٹے اس کے بازو سے باندھ دیے گئے ہوں۔ لڑکی کی نگاہ نے اس کے اِرد گرد بڑھتے ہوئے ثقل کی پُراسرار فضا قائم کر دی تھی۔

وہ اپنا ریاض جاری نہ رکھ سکا۔ اس نے لڑکی کا سر آزاد کر دیا اور کھڑکی کے باہر گزرتے ہوئے باغوں کو دیکھنے لگا۔

گاڑی منزلِ مقصود پر پہنچی۔ جب وہ اس سے نکل رہے تھے، وہ بولی کہ قریب ہی رہتی ہے اور اسے آنے کی دعوت دی۔

اس نے انکار کر دیا۔

بعد میں وہ ہفتوں اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ آخر اس نے ایسی لڑکی سے کیسے نا کہہ دیا تھا جو اسے پسند تھی؟

وہ لڑکی سے سرحد کی دوسری طرف کھڑا ہوا تھا۔

8

مرد کی نگاہ کا حال اکثر بیان ہوا ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ عورت پر سرد مہری سے پڑتی ہے، اسے ناپتی ہے، تولتی ہے، اس کا اندازہ کرتی ہے، اور انتخاب — دوسرے لفظوں میں، اسے ایک شے بنا ڈالتی ہے۔

لیکن جو بات لوگ کمتر جانتے ہیں وہ یہ ہے کہ عورت اس نگاہ کا مقابلہ کرنے میں بالکل ہی نہتی نہیں ہوتی۔ اگر یہ اسے ایک شے بنا دیتی ہے، تو وہ آدمی کی طرف ایک شے کی طرح ہی دیکھتی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے یکبارگی کسی ہتھوڑی کی آنکھیں نکل آئیں اور وہ اس مزدور کو دیکھنے لگے جو اسے کیل ٹھونکنے کے لیے استعمال کر رہا ہو۔ جب مزدور کی نظر ہتھوڑی کی بداطوار آنکھ پر پڑتی ہے تو اس کا سارا اعتماد رفوچکر ہو جاتا ہے اور ضرب اس کے انگوٹھے پر آ کر پڑتی ہے۔

مزدور ہتھوڑی کا مالک ہو سکتا ہے، لیکن غلبہ ہتھوڑی ہی کا رہتا ہے۔ ایک اوزار قطعیت سے جانتا ہے کہ اس کا استعمال کیسے ہونا چاہیے، جبکہ اس کو استعمال کرنے والے کو بس اس کا تخمینی اندازہ ہی ہوتا ہے۔

دیکھنے کی صلاحیت ہتھوڑی کو ایک جاندار کی جون میں لے آتی ہے، لیکن ایک اچھے کاریگر کو اس کی ہٹ دھرم نگاہ کی تاب لانے کا پتا ہونا چاہیے اور مستحکم ہاتھ سے اسے دوبارہ ایک شے میں بدل دینا چاہیے۔ سو یوں لگتا ہے کہ عورت دوسمتوں میں بڑی بیکراں تبدیلیوں سے دوچار ہوتی ہے: اوپر شے سے وجود میں، نیچے وجود سے شے میں۔

مزدور ہتھوڑی کے کھیل میں اب یان بار بار ہارنے لگا تھا۔ عورتوں نے اب اسے بری نظر سے دیکھنا شروع کر دیا تھا، کھیل کا سارا مزہ کرکرا کر دیا تھا۔ کیا اس لیے کہ انھوں نے

اپنی دائم قسمت کی تنظیم اور اصلاح شروع کر دی تھی؟ یا یہ کہ یان کی عمر بڑھتی جا رہی تھی اور وہ عورتوں اور ان کی نگاہوں کو مختلف انداز سے دیکھنے لگا تھا؟ کیا دنیا بدل رہی تھی، یا وہ خود بدل رہا تھا؟

کہنا مشکل تھا۔ ایک بات بہرحال یقینی تھی: ریل گاڑی والی لڑکی نے اسے اوپر نیچے بڑی بے اعتنائی اور شک سے دیکھا تھا۔ ہتھوڑی اس کے اٹھانے سے پہلے ہی ہاتھوں سے پھسل چکی تھی۔

بہت زمانہ نہیں ہوا کہ اس کی اَروِن (Ervin) سے مڈبھیڑ ہوئی تھی، جس نے اس سے باربرا کی شکایت کی تھی۔ باربرا نے اَروِن کو مدعو کیا تھا۔ وہاں اسے دو ناواقف لڑکیاں ملیں۔ وہ کچھ دیر باتیں کرتے رہے، اور پھر ناگہانی، باربرا باورچی خانے سے ایک پرانا دھرانا ٹائمر اٹھا لائی۔ ایک لفظ بھی کہے بغیر وہ اور لڑکیاں اپنے کپڑے اتارنے لگیں۔

"معلوم ہے میں کیا کہہ رہا ہوں؟" اس نے شکایت کی۔ "وہ کپڑے اتنی بے حسی اور کاہلی سے اتار رہی تھیں جیسے میں کوئی کتّا یا پھولوں کا گملا ہوں۔"

پھر باربرا نے اسے بھی کپڑے اتار دینے کا حکم دیا تھا۔ وہ دونوں نئی لڑکیوں سے بھوگ ولاس کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا، سو اس نے باربرا کے حکم کی تعمیل کی۔ جب وہ الف ننگا ہو گیا، باربرا نے ٹائمر کی طرف اشارہ کر کے کہا، "اچھی طرح دیکھ لو۔ اگر ایک منٹ کے اندر اندر استادہ نہیں ہو جاتا تو تمھیں کان پکڑ کر باہر نکال دیا جائے گا۔"

"لڑکیاں نیچے میری میانی کی طرف دیکھنے لگیں، اور جوں جوں لمحے تیزی سے گزرنے لگے، انھوں نے بڑا قبیح قہقہہ لگایا۔ اس کے بعد انھوں نے مجھے باہر کر دیا!"

یہ وہ موقع تھا جب ہتھوڑی تعمیراتی مزدور کو خصّی کر دینے کا فیصلہ کیے بیٹھی تھی۔

"یہ اَروِن، یہ پرلے درجے کا گستاخ اور حرامی آدمی ہے، اور میں نے دل ہی دل میں باربرا کی سزا دینے والی چھاپا ماروں سے ہمدردی محسوس کی،" یان نے ایڈوج سے کہا۔ "اور بہرکیف، اَروِن اور اس کے یار دوست عورتوں کے ساتھ بالکل اسی قسم کی حرکتیں کرتے رہے ہیں۔ ایک بار ایک لڑکی اس کے یہاں آئی جو جفتی کے لیے بالکل تیار تھی، اور انھوں نے اسے ننگا کر کے صوفے سے باندھ دیا۔ لڑکی نے باندھے جانے کا برا نہیں منایا، یہ سب

'اُسی' کا حصہ ہی تو تھا۔ اہانت آمیز بات تو یہ ہے کہ انھوں نے اس کے ساتھ سرے سے کچھ کیا ہی نہیں، اسے چھوا تک نہیں، بس بیٹھے بیٹھے نظر بازی کرتے رہے۔ لڑکی کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی جبری عصمت دری کی گئی ہو۔"

"اور بالکل برحق محسوس کیا،" ایڈوج نے کہا۔

"لیکن میں سمجھ سکتا ہوں کہ اس کی لونڈیوں کو برہنہ کیے جانے، باندھے جانے، اور نظر بازی کا ہدف بننے میں واقعی کچھ نہ کچھ مزہ ضرور آیا ہوگا۔ اُروِن کو اپنے تجربے میں کوئی مزہ نہیں آیا، اوپر سے خصیے بھی گنوا بیٹھا۔"

کافی رات ہوگئی تھی۔ وہ ایڈوج کے اپارٹ مینٹ میں کافی کی میز کے پاس وہسکی کی آدھی خالی بوتل کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔"اس سے تمھارا مطلب؟"

میرا مطلب،" یان نے کہا،" کہ جب مرد اور عورت ایک ہی عمل کرتے ہیں، تو یہ ایک ہی عمل نہیں ہوتا۔ مرد ریپ کرتا ہے، اور عورت خصی۔"

"گویا تمہارے مطابق مرد کو خصی کرنا بری بات ہے، جبکہ عورت کے ساتھ زبردستی کی جفتی خوبصورت عمل ہے۔"

"میرا مطلب ہے،" یان نے اپنی مدافعت میں کہا،" ریپ شہوانیت کا لازمی جز ہے، جبکہ خصی بنا دینا اس کی نفی ہے۔"

ایڈوج نے وہسکی ایک ہی گھونٹ میں پی ڈالی۔"اگر ریپ شہوانیت کا لازمی جز ہے،" اس نے برہمی سے کہا،" تو پھر شہوانیت مجموعی طور پر عورت کے خلاف ہے اور ہمیں ایک نئی قسم کی شہوانیت کی ضرورت ہے۔"

یان نے وہسکی کی چسکی لی اور کچھ دیر تک غور کیا۔ پھر اس نے بات آگے بڑھائی۔ "کئی سال پہلے اس ملک میں جہاں میں رہا کرتا تھا، چند دوستوں اور میں نے مل کر ان آوازوں کی بیاض تیار کی جو جفتی کے دوران ہماری داشتاؤں کے منہ سے نکلتی ہیں۔ اور پتا ہے سب سے زیادہ نکلنے والا لفظ کیا تھا؟"

ایڈوج کو پتا نہیں تھا۔

"لفظ 'نہیں'۔ 'نہیں' کا لفظ بار بار دہرایا جاتا: نہیں، نہیں، نہیں، نہیں، نہیں، نہیں

...لڑکی جفتی کرنے آتی، لیکن جب مرد بانہیں اس کے گرد ڈالتا، تو وہ اسے دھکا دے کر 'نہیں' کہتی، محبت کے عمل کو اس حسین ترین لفظ کی سرخ بتّی دکھادیتی اور اسے ریپ کے میناتوری چربے میں تبدیل کردیتی۔ اس وقت بھی جو اوجِ لذّت کی ڈگر پر ہوتیں، وہ نہیں، نہیں، نہیں، نہیں، نہیں ہی کیے جاتیں، اور بہت سی تو ٹھیک اس کے درمیان بھی 'نہیں' ہی کی چیخ مارتیں۔ اُس وقت سے 'نہیں' میرے لیے لفظوں کی ملکہ بن گیا ہے۔ کیا تم بھی 'نہیں' کہا کرتی تھیں؟"

ایڈوج نے کہا کہ وہ 'نہیں' کبھی نہیں کہتی تھی۔ ایسی چیز کیوں کہتی جو اس کا مدعا نہ رہی ہو؟ ''جب عورت "نہیں" کہتی ہے تو اصل میں اُس کا منشا "ہاں" ہوتا ہے۔' جب مرد یہ کہتے ہیں تو مجھے ہمیشہ اس سے نفرت محسوس ہوتی ہے۔ یہ اتنی ہی احمقانہ بات ہے جتنی ساری کی ساری انسانی تاریخ۔"

"ہاں، لیکن وہ تاریخ ہمارا ہی حصہ ہے۔ ہمیں اس سے مفر نہیں،" یان نے اعتراض کیا۔ "عورت جو اپنی عزت بچانے کی خاطر بھاگ جاتی ہے۔ عورت جو اپنے کو پیش کرتی ہے، مرد جو لے لیتا ہے۔ عورت جو خود کو پردوں میں چھپاتی ہے، مرد جو اس کے کپڑے کھسوٹ ڈالتا ہے۔ تو یہ سب پیکر ہیں جنھیں وقت نے شرف بخش دیا ہے، ان میں سے ایکو ایک، اور سب کے سب ہمارا ہی حصہ ہیں!"

"وقت کے شرف بخشے ہوئے اور احمقانہ! مقدس پیکروں سے بھی زیادہ احمقانہ! اگر عورتیں پرانی ریتوں کی تابعداری سے بے زار ہوجائیں تو؟ اگر وہ ایک سی چیزوں کو دہراتے دہراتے تھک جائیں تو؟ اگر وہ نئے پیکر تراشنا چاہیں، قواعد کا ایک نیا دستہ وضع کرنا چاہیں تو؟"

"ٹھیک ہے کہ یہ پیکر احمقانہ ہیں، اور یہ بھی درست ہے کہ یہ اپنے کو دوام بخشنا چاہتے ہیں۔ لیکن اگر ہماری عورت کے جسم کی طلب کا دارومدار انھیں پر ہو تو؟ اگر ہم قدم بڑھا کر انھیں اپنی ذات سے اکھاڑ پھینکیں، تو اس صورت میں کیا مرد عورت کے ساتھ جفتی کر سکے گا؟"

ایڈوج نے زور کا قہقہہ بلند کیا۔ "اگر تمھاری جگہ میں ہوتی تو اس کی پروا نہ کرتی!" پھر اس نے یان پر ایک مادرانہ نظر ڈالی۔ "اور یہ خیال مت کرو کہ سارے آدمی تم جیسے ہوتے ہیں۔ یہ تم کیسے بتا سکتے ہو کہ جب مرد عورت کے ساتھ تنہا ہوں تو کیا اور کیسے ہوتے ہیں؟"

یان کو واقعی نہیں معلوم تھا کہ جب مرد عورت کے ساتھ تنہا ہوں تو کیا اور کیسے ہوتے ہیں۔ چھا جانے والی خاموشی کے دوران ایڈوج کے چہرے پر شادمانی کی وہ کیفیت ابھرنے لگی جس کا مطلب تھا کہ دیر ہو رہی ہے، وہ وقت قریب آ رہا ہے جب یان اس کے جسم پر خالی رِیل کو پھرکانا شروع کر دے گا۔

"اور پھر یہ بھی ہے،" اس نے کچھ سوچ کر اضافہ کیا، "جفتی کرنا کچھ اتنا اہم بھی نہیں۔"

"واقعی، تم سوچتی ہو اتنا اہم نہیں؟" اس نے پوچھا، صرف یہ اطمینان کر لینے کے لیے کہ اس نے ٹھیک سنا ہے۔

"نہیں،" وہ اس کی طرف نرمی سے مسکراتے ہوئے بولی، "جفتی کرنا اتنا اہم نہیں۔"

ایک ثانیے میں وہ بالکل بھول گیا کہ وہ کس بات پر بحث رہے تھے۔ اس نے اہم بات دریافت کی: ایڈوج جسمانی محبت کو علامت کے طور پر دیکھتی تھی، ایک علامتی فعل، دوستی کی تصدیق۔

وہ پہلی رات تھی جب اسے یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ وہ تھکا ہوا ہے۔ وہ اس کے پہلو میں ایک پاکباز دوست کی طرح لیٹ گیا اور رِیل کو آزاد چھوڑ دیا۔ اور جب وہ ہولے ہولے اس کے بالوں کو تھپتھپانے لگا تو اسے آسودگی کی اطمینان افروز دھنک ان کے آپسی مستقبل کے اوپر محراب کی طرح پھیلتی نظر آئی۔

9

دس سال پہلے ایک شادی شدہ عورت یان کے یہاں بے قاعدگی سے آیا کرتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے تھے لیکن بمشکل ہی کبھی ملتے ملاتے تھے کیونکہ عورت ملازمت کرتی تھی اور اگر اس سے ملنے کے لیے وقت نکال بھی لیتی تو انھیں معاملے میں عجلت برتنی پڑتی تھی۔ پہلے وہ کچھ دیر بیٹھ کر باتیں کرتے، لیکن بس بہت تھوڑی سی دیر ہی۔ پھر یان کھڑا ہوتا، اس کے پاس آتا، اسے بوسہ دیتا، اور بانہوں میں بھر لیتا۔

جب وہ اسے گرفت سے آزاد کرتا، تو وہ علاحدہ ہو جاتے اور جلدی جلدی کپڑے

اتارنے لگتے۔ وہ اپنی جیکٹ کرسی پر پھینکتا۔ عورت سویٹر اتار کر کرسی کی پشت سے لٹکا دیتی۔ وہ جھکتی اور پینٹی ہوز نیچے کھسکانے لگتی۔ وہ پتلون اتارتا اور وہیں گر جانے دیتا۔ وہ جلدی میں ہوتے۔ وہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے ہوتے، آگے کو جھکے جھکے وہ پہلے ایک اور بعد میں دوسری ٹانگ پتلون کے پائینچوں سے نکالتا (وہ انھیں خوب اونچا اٹھاتا جیسے کہ ایک سپاہی پریڈ کے دوران اٹھاتا ہے)، اور وہ نیچے ٹخنوں کے پاس پینٹی ہوز کو اٹھانے کے لیے جھکتی اور ان میں سے پیر نکال لیتی، اور ٹانگوں کو اسی کی طرح خوب اوپر اٹھاتے ہوئے۔

ہر مرتبہ یہی ہوتا۔ اور پھر ایک دن نئی بات ہوئی۔ وہ اسے کبھی نہیں بھولے گا: عورت نے اوپر اس کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔ وہ ایک تقریباً پیار بھری مسکراہٹ تھی، ہمدردی اور تفاہم سے لبریز، ایک شرمیلی مسکراہٹ جو لگتا تھا خود پر معذرت خواہ ہو، تاہم ایسی مسکراہٹ جو واضح طور پر اس پوری صورت حال کی مہملیت پر ایک ناگہانی بصیرت کی زائیدہ ہو۔ بس وہ صرف یہی کر سکتا تھا کہ خود کو مسکرانے نہ دے۔ کیونکہ صورتِ حال کی مہملیت اگر عادت کے نیم ابہام سے پیدا ہوئی تھی — دو افراد کی مہملیت جو روبرو کھڑے نہایت جلد بازی سے ٹانگیں ہوا میں پھینک رہے تھے — تو اس کا خود اسے بھی متاثر کرنا لازمی تھا۔ اور حقیقت میں، وہ قہقہہ مارنے سے بس بال برابر ہی دور تھا۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ اگر مارا، تو پھر وہ جفتی کرنے سے رہے۔ قہقہہ ایک کشادہ دام کی طرح تھا جو کمرے میں ان کے ساتھ ہی گھات لگائے بیٹھا تھا، گو ایک پتلی سی دیوار کے پیچھے۔ قہقہے اور جفتی کے درمیان بس ایک انچ کے محض ایک ٹکڑے ہی کا فاصلہ تھا، اور اسے پھلانگنے سے اسے دہشت ہو رہی تھی؛ بس انچ کا ایک ٹکڑا ہی اسے سرحد سے علاحدہ کیے ہوئے تھا، اور سرحد پار اشیا کے مزید کوئی معنی نہیں رہ جاتے تھے۔

اس نے ضبط سے کام لیا۔ مسکراہٹ کو روکے رکھا۔ پتلون اتار پھینکی، عورت کے پاس آیا، اور اس کے جسم کو چھوا، اس امید میں کہ ہنسی کے شیطان کی دور بھگا سکے۔

10

اسے خبر ملی کہ پاسر کی صحت تیزی سے گرتی جا رہی ہے۔ صرف مورفین اسے زندہ رکھے ہوئے

ہے، اور وہ دن میں چند گھنٹوں سے زیادہ اپنے آپ میں نہیں ہوتا۔ اس کے بڑی الگ تھلگ جگہ پر واقع سینی ٹوریم جانے کے لیے یان نے ٹرین لی اور اس سے اکثر جا کر نہ ملنے پر سفر کی ساری مدت خود کو لعنت ملامت کرتا رہا۔ وہ اتنا زیادہ عمر رسیدہ نظر آ رہا تھا کہ یان اسے دیکھ کر دہل گیا۔ سر پر چند باقی ماندہ لچھے اُسی تجیلی خمیدگی کو ظاہر کر رہے تھے جو پہلے کبھی اس کے بھورے بھورے بال ظاہر کرتے تھے، لیکن اس کا چہرہ اپنی پرانی آب و تاب کی بس یاد ہی رہ گیا تھا۔

پاسر نے حسبِ معمول زندہ دلی سے اس کا استقبال کیا۔ اس کی بانہہ پکڑ کر بڑی گرم جوشی سے اپنے کمرے میں لے گیا جہاں وہ میز کے پاس آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

زمانہ پہلے جب یان اس سے پہلی بار ملا تھا تو پاسر نے اس سے نوعِ بشر کی عظیم امیدوں کا ذکر کیا تھا، اس کی مٹھی میز پر ضربیں لگاتی رہی تھی اور اس کی آنکھیں بے انتہا جوش سے دمکتی رہی تھیں۔ لیکن اب کی بار اس نے نوعِ بشر کی امیدوں کے بجائے خود اپنے جسم کی امیدوں ہی کا ذکر کیا۔ ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق اگر وہ اگلے دو ہفتے پے بہ پے انجکشنوں کی یورش اور درد کی شدت کو سہار جائے تو ٹھیک ہو جائے گا۔ جب وہ یان کو یہ بتا رہا تھا، اس کی مٹھی میز کوٹتی رہی اور آنکھیں جوش سے جگمگاتی رہیں۔ جسم کی امیدوں پر اس پرجوش تقریر میں نوعِ بشر کی امیدوں کی ناسٹلجیائی بازگشت تھی۔ دونوں طرح کے جوش اپنی موہومیت میں برابر تھے، لیکن پاسر کی آنکھوں کی تپش دونوں ہی پر ضوفشاں تھی۔

پھر اس نے اداکارہ ژنّ کا ذکر چھیڑ دیا۔ پاکیزہ سی مردانہ نوع کی کم آمیزی کے ساتھ اس نے یان سے اعتراف کیا کہ وہ زندگی میں آخری بار ہوش و حواس کھو بیٹھا ہے۔ وہ دیوانگی کی حد تک ژنّ کی محبت میں گرفتار ہو گیا ہے، پوری طرح جانتے ہوئے کہ اس کی موجودہ حالت میں یہ غایت درجے کی احمقانہ دیوانگی ہے۔ اس نے دمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ بنوں میں اپنی اور ژنّ کی سرگشت کا حال سنایا، اور کس طرح وہ کھمبوں کو کسی دفینے کی طرح تلاش کرتے پھرے تھے، اور اس کیفے کا ذکر بھی کیا جہاں مے خوری کے لیے رک گئے تھے۔

"وہ لاجواب تھی! معلوم ہے میں کیا کہہ رہا ہوں؟ اس نے متفکر نرس کا سوانگ نہیں رچایا، مجھے ترحم آمیز نظروں سے نہیں دیکھا جو آدمی سے یہ کہتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں کہ وہ ایک

اپاہج ہے، بس ایک تبرک۔ نہیں، اس نے قہقہے بلند کیے اور میرے ساتھ شراب پی۔ ہم ایک پورا لیٹر پی گئے! میں پھر سے خود کو اٹھارہ سال کا محسوس کرنے لگا تھا! یہ میں تھا، قبر میں پانو لٹکائے ہوئے، اور میرا جی گانے کو چاہ رہا تھا!" پاسر نے مٹھی میز پر ماری اور یان کو ضیا بار آنکھوں سے دیکھا، جن کے اوپر سفید بالوں کے تین لچھے کبھی اپنے گھنے اور لمبے ہونے کی یاد دلا رہے تھے۔

یان نے کہا کہ ہم سبھی موت کے دروازے پر کھڑے ہیں؛ ساری دنیا، اپنے تشدد، ظلم، اور بہیمیت کے رجحان سمیت، موت کے دروازے پر کھڑی ہے۔ یہ اس نے اس لیے کہا کہ وہ پاسر کو بہت چاہتا تھا اور اسے یہ بات بڑی وحشت خیز معلوم ہوئی کہ یہ آدمی، جو اتنے شاندار انداز میں مٹھی میز پر مار رہا ہے، اس دنیا سے پہلے ہی فنا ہوجائے گا جو محبت کی اس قدر نامستحق تھی۔ اس نے اپنے ارادے کے زور پر دنیا کا خاتمہ طے کرڈالا۔ اس نے میز پر ضرب لگائی اور نوعِ بشر کی امیدوں کے بارے میں بولے گیا۔ کہا کہ ہم بڑی بڑی تبدیلیوں کے دور میں سانس لے رہے ہیں۔

پاسر کو اس مشاہدے سے کہ چیزیں کیسے بدلتی ہیں جو شدید لگن تھی اس میں یان نے کبھی شرکت نہیں کی تھی، گو وہ اس کی تبدیلیوں کی خواہش کو ضرور سراہتا تھا، اور اس کے اس خیال کو کہ یہ انسان کی قدیم ترین خواہش ہے، بنی نوعِ آدم کی سب سے زیادہ قدامت پسندانہ قدامت پسندی ہے۔ لیکن سراہتے وقت وہ پاسر کو اس سے نجات دلانے کا بھی بہت زیادہ کوشاں تھا۔ اب جبکہ پاسر زندگی اور موت کی سرحد پر کھڑا تھا، یان مستقبل کو اس کی نگاہوں میں بالکل نامعتبر بنا دینا چاہتا تھا اور پاسر کو ان چیزوں پر جو ہاتھ سے جاتی رہیں گی افسوس کرنے کی کم سے کم وجہ دینا چاہتا تھا۔

"سبھی کا خیال ہے کہ ہم اہم وقتوں میں زندہ ہیں،" وہ بولا۔ "کلے وِس یہودی-عیسائی دور کے ختم ہوجانے کی بات کرتا ہے، دوسرے یورپ ہی کے ختم ہوجانے کی، اور بعض دوسرے عالمی انقلاب اور کمیونزم کی۔ لیکن یہ سب مہملات ہیں۔ اگر ہمارا زمانہ تاریخ میں فیصلہ کن تبدیلی کی نمائندگی کرتا ہے تو یہ ایک بالکل ہی مختلف سبب کی بنا پر ہے۔"

پاسر نے اس کی طرف ضیا بار آنکھوں سے دیکھا، جن کے اوپر سفید بالوں کے تین

لچھے بھی اپنے گھنے اور لمبے ہونے کی یاد دلا رہے تھے۔

"تمھیں انگریز لارڈ والا لطیفہ یاد ہے؟" یان نے بات جاری رکھی۔

پاسر نے مٹھی زور سے میز پر ماری اور کہا کہ نہیں، اسے یاد نہیں۔

"ایک انگریز لارڈ نے شادی کے بعد والی صبح اپنی لیڈی سے کہا، 'میری پیاری، مجھے امید ہے تم ضرور حاملہ ہوگئی ہوگی۔ یقیناً میں اس قسم کی مضحکہ خیز کود پھاند سے دوبارہ نہیں گزرنا چاہتا۔'"

پاسر مسکرا دیا، لیکن میز پر مٹھی مارے بغیر۔ یہ اس قسم کی کہانی نہیں تھی جس پر اسے جوش آ جاتا۔

"بھئی تم عالمی انقلاب ونقلاب بھول جاؤ! ہم اس عظیم تاریخی دور میں جی رہے ہیں جس میں جسمانی محبت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مضحکہ خیز کود پھاند میں بدل جائے گی۔"

پاسر کے چہرے پر ایک نازک سی مسکراہٹ کا شائبہ ابھرا۔ یان اس سے خوب واقف تھا۔ یہ رواداری کی مسکراہٹ تھی، مسرت یا پسندیدگی کی نہیں۔ ان کی آرا میں ہمیشہ بعد المشرقین رہا تھا، اور جب بھی ان کے اختلافات کھلم کھلا ظاہر ہونے کے قریب پہنچ جاتے، دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر فوراً اسی مسکراہٹ سے کام لیتا، صرف یہ جتانے کے لیے کہ اس سے ان کی دوستی کو گزند پہنچنے کا کوئی خطرہ نہیں۔

11

سرحد کا پیکر بار بار اس کی طرف کیوں لوٹ آتا ہے؟

اس لیے، وہ اپنے کو بتاتا ہے، کہ وہ سن رسیدہ ہوتا جارہا ہے۔ جب بھی کوئی شے دہرائی جاتی ہے، تو اپنے معنی کا ایک حصہ کھو بیٹھتی ہے۔ یا بلکہ، رفتہ رفتہ اپنی قوتِ حیات گم کر دیتی ہے، وہ قوتِ حیات جو خود کار طریقے پر، خلقی طور پر معنی کی پیش قیاسی کرتی ہے۔ چنانچہ، یان کے واسطے سرحد قابلِ قبول تکرار کا ممکن ترین درجہ ہے۔

ایک بار وہ کوئی کھیل دیکھ رہا تھا کہ عمل کے عین بیچ میں ناگہانی حد درجہ ہوشیار وکاہی اداکار بڑے شدید ارتکاز اور سنجیدگی کے ساتھ بے حد ہولے ہولے گننے لگا: ایک، دو، تین،

چار ...، ہر ہر عددِ شمار کو غایت درجے کی توجہ کے ساتھ ادا کرتے ہوئے، یوں گویا یہ عدد اس سے فرار کر گئے ہوں اور وہ انھیں دوبارہ مجتمع کر رہا ہو: پانچ، چھ، سات، آٹھ .... جب وہ پندرہ کو پہنچا، ناظرین ہنسنے لگے، اور جب وہ آہستہ آہستہ اور شدید ترین ارتکاز کے ساتھ سو کو پہنچ گیا، تو لوگ مارے ہنسی کے اپنی نشستوں سے گرے پڑ رہے تھے۔

ایک اور پیشکش کے دوران یہی اداکار ایک پیانو کے سامنے آ بیٹھا اور والز کی بائیں ہاتھ کی سنگت بجانے لگا: اُم پا پا، اُم پا پا۔ اس کا دایاں ہاتھ اس کے پہلو میں لٹکا رہا — کوئی سُرتان نہیں تھی، بس ایک مسلسل اُم پا پا، اُم پا پا — لیکن وہ ناظرین کی طرف بڑی معنی خیز نظروں سے گھورتا رہا، گویا صرف سنگت ہی بے مثال موسیقانہ کارنامہ ہو، بے پناہ جذبے، تحسین، اور بے خودی کی مستحق۔ اور وہ مسلسل اسی طرح پیانو بجاتا رہا — بیس، تیس، پچاس، سو بار: اُم پا پا، اُم پا پا۔ ناظرین مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

ہاں، سرحد کے پار قدم رکھیں اور آپ کو اُس تابعِ تقدیر قہقہے کی آواز سنائی دینے لگے گی۔ اور اگر آپ اور آگے جائیں، قہقہے کے بھی 'ماورا'، تو؟

یان کو جس طرح نظر آتا ہے، کبھی یونانی دیوتا انسانی معاملات سے بہت قریبی سروکار رکھتے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے خود کو کوہِ اولمپس سے نیچے دیکھنے اور ہنسنے ہنسانے تک محدود کر لیا۔ اور اب زمانوں سے پڑے سو رہے ہیں۔

لیکن میرے خیال میں یان یہ سوچنے میں غلطی پر ہے کہ سرحد انسان کی زندگی کو ایک نقطے پر قطع کرنے والا کوئی خط ہے، کہ یہ وقت میں ایک فیصلہ کن تبدیلی، انسانی وجود کی گھڑی میں قطعی ثانیے کی نشان دہی کرتا ہے۔ نہیں، حقیقت میں مجھے یہ یقین ہے کہ سرحد مسلسل ہمارے ساتھ ہوتی ہے، وقت اور ہماری عمر سے قطع نظر؛ خارجی حالات اسے کم یا زیادہ مرئی بنا سکتے ہیں، لیکن یہ ہمہ جا موجود ہوتی ہے۔

یان کے بہت سے احباب جو اسی کی طرح اپنا پیدائشی وطن چھوڑ چکے تھے سارا وقت اس کی آزادی کے لیے لڑنے میں وقف کر رہے تھے۔ ان سبھوں کو یہ احساس ہوا تھا کہ انھیں ان کے ملک سے وابستہ کرنے والا بندھن محض ایک فریب نظر تھا، کہ یہ صرف تقدیر کا ہٹیلا احساس تھا جو انھیں کسی ایسی شے کے لیے خود کو قربان کرنے پر رضامند کر رہا تھا جو ان

کے لیے بالکل کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ وہ سب اس احساس سے واقف تھے، اور ساتھ ہی ساتھ واقف ہونے سے خوفزدہ بھی؛ انھوں نے سر ایک طرف موڑ لیے تاکہ سرحد نظر نہ آئے، تاکہ (سر چکرا دینے والی بلندی اور درمیان میں حائل کھائی دونوں کی ترغیب میں آ کر) دوسری طرف نہ جائیں، جہاں ان کی معذوب قوم کی آواز اتنی ہی بے معنی سنائی دے گی جتنی چڑیوں کی چہچہاہٹ۔

اگر یان اپنے لیے سرحد کی تعریف ایک ایسے خط کے طور پر کرتا ہے جس کا زیادہ سے زیادہ دہرایا جانا ممکن ہو، تو مجھے اسے کی ہدایت کرنی چاہیے۔ سرحد تکرار کی پیداوار نہیں ہے۔ تکرار سرحد کو مرئی بنانے کا محض ایک ذریعہ ہی ہے۔ سرحد کی لکیر گرد سے اَٹی ہوئی ہے، اور تکرار ہاتھ کی وہ حرکت ہے جو اس گرد کو جھاڑ کر ہٹا دیتی ہے۔

میں یان کو وہ اہم تجربہ یاد دلانا چاہتا ہوں جو اسے بچپن میں ہوا تھا۔ وہ اس وقت تیرہ سال کا تھا۔ دوسرے سیاروں پر زندگی کے پائے جانے کے بڑے چرچے ہو رہے تھے، اور وہ یہ خیال باندھا کرتا تھا کہ خلائے بسیط میں پائی جانے والی مخلوق کے جسموں پر اپنے ارضی مترادفات کے مقابلے میں زیادہ شہوانی اعضا ہوتے ہوں گے۔ تیرہ سالہ بچہ جو ایک ناچنے والی کی چرائی ہوئی تصویر پر نظر گاڑ کر چوری چھپے خود کو گرماتا تھا، یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ خود اس کے سیارے کی عورتیں، جنھیں دو عدد چوچیاں اور مخصوص اعضا کی ایک سادہ سی تکون ہی ملی تھی، شہوانی اعتبار سے گھاٹے میں رہی تھیں۔ وہ ایسی مخلوق کے خواب دیکھتا جس کے جسم میں اُس پھکوسی تکون کے بجائے دس یا بیس شہوانی منطقے ہوں گے، ایک جسم جو ننگی آنکھ کو برانگیختگی کے ناپیدا کنار ذرائع بہم پہنچا سکے گا۔

میں جو کہہ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ اس وقت بھی جب وہ جنسی اعتبار سے کنوارا ہی تھا، اسے معلوم تھا کہ نسوانی جسم سے اکتاہٹ کا کیا مطلب تھا۔ اوجِ لذّت کے عملی تجربے سے پہلے ہی وہ برانگیختگی کی انتہائی منزلوں تک کا ذہنی سفر کر چکا تھا۔ اس کے سارے امکانات کو کلیتاً صرف کر چکا تھا۔

چنانچہ اوائل بچپن ہی سے وہ اُس خفیہ سرحد کے سامنے زندہ رہا تھا جس کے ماورا نسوانی پستان سینے پر جھولتے ہوئے گداز گرّے سے زیادہ نہیں ہوتا۔ آغاز ہی سے وہ سرحد

اس کا مقسوم تھی۔ تیرہ سال کی عمر میں جب وہ نسوانی جسم پر نئے شہوانی منطقوں کی آرزو کر رہا تھا تو اس وقت بھی وہ سرحد کے وجود سے اتنا ہی آگاہ تھا جتنا تیس سال بعد۔

12

جھکڑ چل رہے تھے اور کیچڑ اچھل رہی تھی۔ ماتم کرنے والے کھلی قبر کے گرد بے ترتیب سے نیم دائرے کی شکل میں کھڑے ہوئے تھے۔ اس میں یان اور اس کے تقریباً سارے ہی دوست شامل تھے: اداکارہ ژان، کلے وِس خاندان، باربرا، اور، ظاہر ہے، پاسر کا کنبہ کٹم ـــ پاسر کی بیوی اور لڑکا اور لڑکی، جو دونوں آب دیدہ تھے۔

خستہ حال کپڑوں میں ملبوس دو آدمی رسیاں اٹھا رہے تھے جن پر تابوت رکھا ہوا تھا کہ ایک آدمی ہاتھ میں کاغذ کا ایک پرزہ لیے وارد ہوا، گورکنوں کی طرف رخ کیا، کاغذ پر دوبارہ نظر ڈالی اور پڑھنے لگا۔ گورکنوں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، یہ جاننے کے لیے کہ تابوت کو دوبارہ قبر کے پاس رکھ دیں۔ پھر وہ اسے آہستہ آہستہ گڑھے میں اتارنے لگے، بظاہر انھوں نے میت کو ایک چوتھی تقریر کے عذاب سے امان دلانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

تابوت کے اچانک معدوم ہوجانے نے مقرر کو ناگہانی آلیا۔ اس نے اپنی ساری تقریر واحد مخاطب کی ضمیر میں لکھی تھی، اور جب وہ میت کو پند و نصائح دے رہا تھا، اسے اطمینان دلا رہا تھا، اس سے اتفاق کر رہا تھا، اسے دلاسا دے رہا تھا، اس کا شکریہ ادا کر رہا تھا، اور ان سوالوں کے جواب دے رہا تھا جو اس نے خود ہی اس کے منہ میں رکھ دیے تھے، تو اس تمام وقت میں تابوت نیچے قبر میں اترتا جا رہا تھا۔ بالآخر وہ تہہ پر آکر ٹھہر گیا، اور گورکنوں نے رسیاں اوپر کھینچ لیں اور وہیں چپ چاپ کھڑے ہوگئے۔ جب انھیں خیال آیا کہ مقرر کے جوشِ خطابت کا سارا رخ انھیں کے خلاف ہے، تو انھوں نے گھبراہٹ کے مارے نظریں جھکا لیں۔

مقرر جتنا زیادہ صورتِ حال کے بے ڈھنگے پن سے آگاہ ہوتا گیا، اتنا ہی زیادہ وہ بے چارے دونوں آدمی اس کی توجہ میں آنے لگے۔ آخر میں اس نے نگاہیں ان سے جدا

کیں اور ماتم کرنے والوں کے نیم دائرے کی طرف منعطف۔ لیکن اس سے اس کی مخاطب کی ضمیر والی تقریر کو کچھ فائدہ نہ پہنچا۔ وہ جانے والے عزیز کو یوں مخاطب کر رہا تھا جیسے وہ انھیں کے درمیان کہیں چھپا بیٹھا ہو۔

تو اسے کس طرف دیکھنا چاہیے تھا؟ اس نے کرب کے عالم میں نیچے کاغذ کی طرف دیکھا، اور اگر چہ اسے متن منہ زبانی یاد تھا، اس نے آنکھیں اسی پر گڑوئے رکھیں۔

سارے حاضرین ایک نوع کی بے اطمینانی محسوس کر رہے تھے۔ جو ان پر حملہ کرتے ہوئے ہوا کے نیوراتی جھکڑوں سے کچھ اور شدید ہوگئی تھی۔ پاپا کلے وس نے ہیٹ نیچے کھینچ کر کن پٹیوں پر مضبوطی سے جما لیا تھا، لیکن ہوا اتنی تیز تھی کہ وہ اسے سر سے لے اڑی اور کھلی قبر اور پاسر خاندان کے بیچ میں ڈال دیا۔

اسے پہلے یہ تحریک ہوئی کہ ہولے ہولے ان کے پاس جائے اور پھر تیزی سے ہیٹ کی طرف لپکے، لیکن، محسوس ہوا، اس سے یہ ظاہر ہوگا کہ اسے اپنے دوست کی آخری رسومات کے احترام سے زیادہ اپنے ہیٹ کی فکر ہے۔ سو اس کے بجائے اس نے جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑے رہنے کا فیصلہ کیا اور یہ ظاہر کرنے کا کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ یہ غلط فیصلہ تھا۔ ٹھیک جس لمحے ہیٹ قبر کے سامنے کی درمیانی زمین پر آ کر گرا تھا، ماتم کرنے والوں کے لیے مقرر کے الفاظ پر توجہ دینا ناممکن ہوگیا تھا۔ اب وہ اور بھی بے چین ہو گئے تھے۔ اگر چہ ہیٹ بہت زیادہ ہل جل نہیں رہا تھا، لیکن واضح طور پر تجہیز و تکفین کے عمل میں اس سے زیادہ خلل اندازی کر رہا تھا جو کلے وس کے دو چار قدم آگے بڑھ کر اسے اٹھا لینے سے پیش آتی۔ چنانچہ اس نے بالآخر اپنے برابر کھڑے ہوئے آدمی سے کہا "معاف کیجیے گا" اور گروہ کے باہر نکل آیا۔ اب وہ قبر اور ماتم کرنے والوں کے درمیان (کسی چھوٹے سے اسٹیج کے مساوی) خالی جگہ پر کھڑا تھا۔ لیکن جیسے ہی وہ ہیٹ اٹھانے کے لیے جھکا، ہوا کے ایک زور دار جھونکے نے اسے اس کی پہنچ سے دور کر دیا اور مقرر کے پانو کے پاس لا پھینکا۔

اور اب کوئی بھی پاپا کلے وس اور اس کے ہیٹ کے علاوہ کسی اور چیز کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا۔ مقرر کو ہیٹ کا علم نہیں تھا، لیکن اسے بھی احساس ہوگیا تھا کہ کوئی چیز اس کے سامعین کو مضطرب کر رہی ہے۔ جب آخر کار اس نے آنکھیں کاغذ سے اٹھائیں تو نظر آیا

کہ ایک اجنبی اس سے ایک دو فٹ دور کھڑا ہے اور بظاہر قبر کی تہہ میں کود پڑنے کو تیار ہے۔ اس نے ہڑبڑا کر پھر سے نگاہیں کاغذ پر جما دیں، اس امید میں کہ جب دوبارہ انھیں اٹھائے گا تو اس وقت تک یہ ناقابلِ یقین منظر غائب ہو چکا ہوگا۔ لیکن جب اٹھائیں تو وہ آدمی ہنوز وہیں کھڑا اسے تک رہا تھا۔

پاپا کلے وس نہ آگے بڑھ سکتے تھے نہ پیچھے ہٹ سکتے تھے۔ مقرر کے پیروں کی طرف جھپٹنا بڑا ڈھٹائی کا عمل معلوم ہوا، اور ہیٹ کو واپس لیے بغیر لوٹنا بڑی واہیات بات۔ سو وہ وہیں کھڑے رہے، ساکت وصامت، اپنے تذبذب کے باعث وہیں زمین پر گڑے ہوئے، اس مخمصے سے نکلنے کے لیے بے سود ہی کسی نتیجہ خیز تدبیر کی تلاش میں۔

مدد کی شدید تلاش میں اس نے گورکنوں کی طرف دیکھا جو قبر کی دوسری طرف گم صم کھڑے ٹھیک مقرر کے پیروں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ لیکن ہوا ایک بار پھر ہیٹ کو قبر کی طرف پھسلانے لگی۔ کلے وس نے فیصلہ کر ہی ڈالا۔ دو چار جاندار قدم آگے بڑھائے، بازو تانا اور جھک گیا۔ بدقسمتی سے ہیٹ اس کی پہنچ سے اور دور کھسک گیا۔ بالآخر وہ اس تک تقریباً پہنچ ہی گیا تھا کہ وہ لڑھک کر گڑھے میں جا پڑا۔

کلے وس کی پہلی تحریک یہ تھی کہ اس کے تعاقب میں ہاتھ بڑھائے۔ پھر اس نے فیصلہ کیا ایسا انداز اختیار کرے جیسے ہیٹ کا کبھی وجود ہی نہیں رہا ہو اور وہ بس وہاں یوں ہی کھڑا ہوا ہو۔ اس نے بالکل مطمئن اور اور فطری نظر آنے کی حتّی المقدور کوشش کی، لیکن اس صورت میں کہ ساری نگاہیں اس پر لگی ہوئی تھیں یہ آسان نہیں تھا۔ اس نے لوگوں کی نگاہوں سے اجتناب کرنے کے لیے منہ بگاڑا اور چل کر واپس پہلی صف میں پاسر کے سبکیاں لیتے ہوئے لڑکے کے پاس آ گیا۔

چھلانگ لگانے والے آدمی کے خطرناک پیکر کے غائب ہوتے ہی کاغذ والے آدمی کی جان میں جان آئی اور اس نے مجمعے کی طرف نظریں اٹھا کر، جو اب تک بالکل بھول بھال چکا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا تھا، اپنے خطبے کا آخری جملہ ادا کیا۔ پھر وہ گورکنوں کی طرف متوجہ ہوا اور بڑے طمطراق سے کہا، "وکٹر پاسر، وہ جو تمھیں چاہتے ہیں، تمھیں کبھی نہیں بھولیں گے۔ دعا ہے کہ زمین تم پر بھاری نہیں ہوگی۔"

وہ قبر کے کنارے پڑی ہوئی مٹی کے انبار پر جھکا، اس میں گڑا چھوٹا سا بیلچہ اٹھایا، اسے تھوڑی سی مٹی سے بھرا، اور نیچے جوفِ قبر میں جھانکا۔ اس لمحے ماتم کرنے والوں کا سارا مجمع خاموش قہقہے کی لہر سے جھونکے کھانے لگا۔ ان سب کو معلوم تھا کہ مقرر، جو مٹی سے بھرا بیلچہ اٹھائے قبر کے کنارے کھڑا تھا، گڑھے کی تہہ میں رکھے تابوت کو تک رہا تھا اور ہیٹ تابوت پر پڑا ہوا تھا۔ (یہ ایسا ہی تھا جیسے مرنے والا اپنی عزت برقرار رکھنے کی ایک آخری بے سود کوشش میں موقعے کی سنجیدگی کے احترام میں سر ڈھانپ لینے کا خواہش مند ہو۔)

مقرر نے کسی نہ کسی طرح اپنے پر قابو پالیا اور مٹی تابوت پر اس طرح گرادی کہ ہیٹ بچ رہے، اس ڈر سے کہ پاسر کا سر کہیں واقعی اس کے نیچے نہ چھپا ہو۔ پھر اس نے بیلچہ پاسر کی بیوہ کو تھما دیا۔ ہاں، انھیں جام تلچھٹ تک پینا تھا۔ ان سب کو قہقہے کے خلاف جنگ آزمائی کرنی تھی۔ ان سب کو پاسر کی بیوی، لڑکی اور سسکیاں لیتے ہوئے لڑکے کا اتباع کرنا تھا، بیلچے کو مٹی سے بھرنا تھا، اور گڑھے پر جھکنا تھا جس میں ایک تابوت تھا جس پر ایک ہیٹ رکھا ہوا تھا۔ یہ یوں تھا جیسے ناقابلِ مغلوب حد تک جاندار اور پرحوصلہ پاسر نے سر ایک آخری نظر ڈالنے کے لیے اٹھایا ہو۔

13

باربرا کے یہاں بیس کے لگ بھگ مہمان آئے ہوئے تھے اور اس کے کشادہ لونگ روم میں ہر طرف بیٹھے ہوئے تھے — صوفے پر، کرسیوں پر، فرش پر۔ ان کی مکمل سے کچھ کم توجہ کا مرکز ایک لڑکی تھی جو گلے بندھے عریاں رقص کے ٹھمکے لگا رہی تھی۔ وہ کسی صوبائی شہر سے آئی تھی، یان کو بتایا گیا۔

ایک بڑی سی آرام دہ کرسی پر براجمان باربرا اپنا دربار لگائے بیٹھی تھی۔ "تم کچھ زیادہ وقت نہیں لگا رہیں؟" اس نے لڑکی پر ایک سرد سی نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

لڑکی نے پیچھے نظر ڈالی اور کندھے گھما کر اس کراہت کو جتانے کی کوشش کی جو وہ ناظرین میں دلچسپی اور توجہ کی کمی پر محسوس کر رہی تھی۔ لیکن باربرا کی سرد نگاہ کسی قسم کا، حتیٰ کہ

خاموش، اعتذار بھی برداشت کرنے کی سزاوار نہیں تھی، اور لڑکی نے، اگرچہ اپنی مبہم، تاثر سے عاری حرکات تو نہ چھوڑیں، بلاؤز کے بٹن بہر حال کھولنے شروع کر دیے۔

اس لمحے کے بعد سے باربرا نے اس پر مزید توجہ نہ دی۔ وہ ایک مہمان سے دوسرے کی طرف دیکھنے لگی۔ جب بھی اس کی نگاہ کسی جوڑے پر جا پڑتی تو وہ فوراً باتیں کرنا چھوڑ کر عریاں ہوتی ہوئی لڑکی کو دیکھنے لگتے۔ پھر باربرا نے اپنا اسکرٹ اٹھایا، رانوں کے درمیان ہاتھ گھسیڑا، اور ایک بار پھر متحاربانہ انداز میں کمرے کے سارے کونوں کا جائزہ لیا، یہ اطمینان کر لینے کے لیے کہ سب اس کا اتباع کر رہے ہیں، دوسرے لفظوں میں، ٹیم مقابلے سے پہلے تیاری کر رہی ہے۔

خدا خدا کر کے معاملہ سست رفتاری سے ہی سہی لیکن قطعی طور پر شروع ہوا۔ صوبوں سے آئی ہوئی لڑکی، بڑی دیر سے عریاں، ایک مرد کی بانہوں میں پڑی تھی۔ دوسرے لوگ مختلف کمروں میں منتشر تھے۔ باربرا، بہر حال، ایک ہی وقت میں ہمہ جا موجود تھی — ازلی طور پر چوکنّی اور بے حد و حساب توجہ طلب۔ اسے اس بات سے بے اندازہ کوفت ہوتی تھی کہ اس کے مہمان جوڑوں میں بٹ کر اپنے اپنے کونوں کھدروں میں دبک جائیں۔ جب یان نے بانہہ ایک لڑکی کے گرد حمائل کی تو باربرا اس لڑکی کی طرف دیکھ کر بڑے عناد سے بولی، "اگر تم اسے اپنے لیے وقف کر لینا چاہتی ہو تو اپنے گھر بلاؤ۔ یہ ایک پارٹی ہے۔" اور اس نے لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر اسے برابر والے کمرے میں دھکا دے دیا۔

یان ایک خوشگوار گنجے نوجوان کی نگاہ میں آ گیا جو اکیلا بیٹھا ہوا تھا اور باربرا کی مداخلت دیکھ چکا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ گنجا آدمی یان کے پاس آیا، اور یان نے کہا، "میجر باربرا۔"

گنجا آدمی ہنسا اور بولا، "ہمیں اولمپکس میں شمولیت کی مشق کرا رہی ہے۔" دونوں ساتھ ساتھ مل کر باربرا کا مشاہدہ کرنے لگے۔

جفتی میں مشغول ایک مرد اور عورت کے پاس دوزانو ہو کر باربرا نے سر دونوں کے چہروں کے درمیان ٹھونسا اور عورت کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ کر دبائے۔ مرد احترام کے ساتھ اپنی ہم شریک سے الگ ہو گیا، ظاہر ہے یہ سوچتے ہوئے کہ باربرا عورت کو اپنے لیے

چاہتی ہے۔ باربرا نے عورت کے گرد بانہیں ڈال کر مضبوطی سے بھینچا، جبکہ مرد پاس داری اور خاکساری سے اس کے پاس کھڑا رہا۔ ہنوز عورت سے بوس و کنار میں مشغول باربرا نے بازو اٹھا کر ہوا میں دائرہ سا بنایا۔ مرد سمجھ گیا کہ یہ اشارہ اسی کی طرف تھا لیکن یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ وہ اسے ٹھہرے رہنے کا حکم دے رہی ہے یا وہاں سے ہٹ جانے کا۔ وہ بڑی احتیاط سے دیکھتا رہا تاآنکہ حرکت زیادہ شدید اور شتابی ہوگئی۔ بالآخر باربرا نے ہونٹ عورت کے ہونٹوں سے جدا کر کے مرد کو بتایا کہ وہ اس سے کس چیز کی طلبگار ہے۔ مرد نے ہاں میں سر ہلا دیا اور واپس فرش پر آ گیا اور دوسری عورت کے پیچھے جا گھسا، جو اب باربرا اور اس آدمی کے درمیان دبی ہوئی تھی۔

"ہم سب باربرا کے خوابوں کے کردار ہیں،" یان نے کہا۔

"بالکل،" گنجے آدمی نے جواب دیا۔ "لیکن ہمیشہ ہی کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہوتی ہے۔ باربرا اس گھڑی ساز کی طرح ہے جسے خود ہی اپنی گھڑی کی سوئیوں کو حرکت دینی پڑتی ہے۔"

مرد کو صحیح حالت میں لانے کے بعد، اس کی دلچسپی عورت میں ختم ہوگئی جسے وہ ایک لمحہ پہلے تک بڑی شہوت سے چوم چاٹ رہی تھی۔ وہ کھڑی ہوئی اور بڑے نوعمر عاشقین کے پاس آئی جو کمرے کے گوشے میں بظاہر ایک دوسرے سے بے تحاشا لپٹے ہوئے تھے۔ وہ دونوں ابھی تک اپنے آدھے کپڑے پہنے ہوئے تھے، اور لڑکا لڑکی کو اپنے بدن سے ڈھانپنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ اوپرا اسٹیج کے زوائد کی طرح جو بغیر گائے اپنے منہ ہلاتے رہتے ہیں اور زندہ دل مکالمے کا فریب پیدا کرنے کے لیے ہوا میں اِدھر اُدھر بڑی مضحکہ خیزی سے ہاتھ جھاڑتے ہیں، وہ حتّی المقدور یہ واضح کر دینا چاہتے تھے کہ وہ ایک دوسرے میں مکمل جذب ہیں۔ بس اتنا ہی چاہتے ہیں کہ انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔

باربرا بھلا کہاں الّو بننے والی تھی۔ وہ ان کے برابر دوزانو ہوگئی، ان کے بال تھپتھپانے اور باتیں کرنے لگی۔ پھر وہ اگلے کمرے میں گئی اور فوراً ہی تین الف ننگے مردوں کے ساتھ لوٹی۔ وہ دوبارہ عاشقین کے برابر دوزانو ہو کر بیٹھ گئی، لڑکے کا سر ہاتھ میں لے کر چوما۔ تینوں ننگے آدمی، اس کی نگاہ کے حکم پر لڑکی پر جھک گئے اور اس کے بقیہ کپڑے بھی تن سے جدا کر دیے۔

"جب یہ ختم ہوجائے گا تو میٹنگ ہوگی،" گنجے آدمی نے کہا۔ "باربرا ہم سب کو جمع کرے گی، اپنے گرد نیم دائرے میں بٹھائے گی، اٹھے گی، چشما چڑھائے گی، اور ہم سب کو فرداً فرداً بتائے گی کہ ہم نہ کیا ٹھیک کیا ہے اور کیا غلط، مستعدوں کی واہ واہ کرے گی اور کاہلوں کی ڈانٹ ڈپٹ۔"

جب دونوں شرمیلے عاشقین بالآخر ایک دوسرے میں پیوست ہوگئے تو باربرا اٹھی اور یان اور اس کے نئے دوست کا رخ کیا۔ اس نے یان کی طرف بڑی عاجلانہ مسکراہٹ سے دیکھا اور گنجے آدمی کا ہاتھ پکڑ کر دور لے گئی۔ ٹھیک اسی لمحے یان کو صوبوں سے آئی ہوئی لڑکی کا گداز لمس محسوس ہوا جس نے شام کی ابتدا اپنے اسٹرپ ٹیز سے کی تھی۔ باربرا کی گھڑی خوب کام کررہی ہے، یان نے خود سے کہا۔

لڑکی نے بڑی مستعد لگن کے ساتھ اس کی ذمے داری اپنے سر لے لی، لیکن یان کی نظریں کمرے کی دوسری طرف بھٹکتی رہیں جہاں گنجے آدمی کا ذکر باربرا کے ہاتھوں میں تھا۔ دونوں جوڑوں کی یکساں حالت تھی۔ دونوں عورتیں ایک ہی طرح جھکی ہوئی اور ایک ہی طرح مصروف عمل تھیں۔ وہ کیاریوں میں کام کرتی ہوئی مستعد مالنوں کی طرح لگ رہی تھیں، دو جڑواں مالنیں، ایک، دوسری کا ہو بہو عکس۔ مردوں کی آنکھیں چار ہوئیں، اور یان نے گنجے آدمی کے جسم کو ہنسی سے لرزتے دیکھا۔ وہ یوں یکجا تھے جیسے کوئی شے اپنے عکس سے متحد ہوتی ہے: اگر ایک ہلتا، تو دوسرا بھی ہلتا۔ یان نے سر موڑ لیا تاکہ اس سے ملاعبت کرتی ہوئی لڑکی کی دل آزاری نہ ہو۔ لیکن عکسی پیکر اسے مسلسل واپس بلاتا رہا۔ آخرکار جب اس نے دوبارہ دیکھا تو گنجے آدمی کی آنکھیں مارے ہنسی کے سر سے ابلتی نظر آئیں۔ دونوں مرد ٹیلی پیتھی کے متعدد رابطوں سے منسلک ہوگئے تھے۔ نہ صرف یہ کہ ایک جانتا تھا کہ دوسرا کیا سوچ رہا ہے، بلکہ دونوں ہی یہ جانتے تھے کہ دوسرا جانتا ہے۔ بنا بریں، وہ سارے پیکر جو انھوں نے باربرا پر چسپاں کیے تھے ہنوز ان کے دماغوں سے گزر رہے تھے، اور نئے نئے پیکر تراش رہے تھے۔ انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ساتھ ساتھ یہ کوشش بھی کی کہ آنکھیں نہ چار ہونے پائیں۔ انھیں معلوم تھا کہ ان حالات میں خندہ اتنا ہی بے ادبی کی بات تھا جتنی کسی گرجے میں اس وقت جب پادری عبادت گزاروں کو اٹھا رہا ہو۔ لیکن جیسے ہی یہ پیکر ان کی

دماغوں میں کلبلایا، ان کی ہنسی اور زیادہ چھوٹ گئی۔ وہ بہت ناتواں تھے۔ خندہ کہیں زیادہ زور آور تھا۔ ان کے جسم بے قابو ہو کر ہچکولے کھانے لگے۔

باربرا نے نیچے اپنے ساتھی کے چہرے میں جھانکا۔ گنجے آدمی نے انجام کار ہتھیار ڈال دیے اور اپنے میں محبوس ہنسی کو پھٹ پڑنے دیا۔ یہ احساس کر کے کہ ہنسی کا سرچشمہ کہیں اور ہے، وہ مڑی اور یان کی طرف دیکھا۔ "کیا ہوا؟" صوبوں سے آئی ہوئی لڑکی ٹھیک اسی لمحے اس سے پوچھ رہی تھی۔ "تم رو کیوں رہے ہو؟"

ایک کوندے کی طرح باربرا اس کے پہلو میں آدھمکی اور سسیائی، "یہ بھول کر بھی نہ سوچنا کہ تم پاسر کی تجہیز و تکفین والا ناٹک میرے ساتھ بھی نچا سکتے ہو!"

"معاف کرنا"، یان نے کہا، دریں اثنا آنسو رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

اس نے یان سے رخصت ہو جانے کے لیے کہا۔

14

امریکہ سدھارنے سے پہلے وہ ایڈوج کو ایک اجڑے ہوئے جزیرے لے گیا جہاں چند چھوٹے چھوٹے گانو تھے، چراگاہ میں چند کاہل سی بھیڑیں، اور ساحلِ آب کے نجی ٹکڑے پر بنا ہوا واحد ہوٹل۔ دونوں نے اپنے لیے الگ الگ یک نفری کمرا لیا۔

اس نے ایڈوج کے دروازے پر دستک دی۔ "اندر آ جاؤ" کمرے کے دوسرے سرے سے ایڈوج کی آواز آئی۔ شروع میں اسے وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔ "میں یہاں ہوں، موت رہی ہوں،" اس نے غسل خانے سے چلا کر کہا۔ دروازہ کھلا تھا۔

یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اسے اس میں کوئی عار نہیں تھا کہ وہاں اچھا خاصا مجمع لگا ہو اور وہ اعلان کرتی پھرے کہ موت رہی ہے اور ساتھ ساتھ غسل خانے کے نیم وا دروازے سے گفتگو بھی کیے جائے۔ اور اس میں وہ نہ عشوہ طرازی کر رہی ہوتی نہ بے حیائی کا مظاہرہ؛ اس کے برعکس، یہ تو ان دونوں ہی باتوں کو محو کر دینا تھا۔

ایڈوج متعدد بوجھل روایات کو ماننے کی انکاری تھی۔ وہ یہ اقرار کرنے والی نہیں تھی

کہ ننگا چہرہ تو باحیا ہوتا ہے لیکن ننگے چوتڑ بے حیا۔ یہ اس کی سمجھ سے بالا تھا کہ جو نمکین سیال ہماری آنکھوں سے بہتا ہے اسے تو کوئی اونچی اور شاعرانہ چیز سمجھا جائے، لیکن وہ سیال جو ہم اپنے مثانوں سے خارج کرتے ہیں اسے کراہت انگیز۔ یہ سب اسے بالکل احمقانہ لگتا ہے، بناوٹی، اور لایعنی، اور وہ ان کے ساتھ وہی سلوک کرتی تھی جو ایک باغی بچہ کیتھولک بورڈنگ اسکول کے قواعد کے ساتھ کرتا ہے۔

وہ غسل خانے سے اس حالت میں نکلی کہ باچھیں کھلی ہوئی تھیں، اور یان کو اپنے دونوں گالوں پر بوسہ دینے دیا۔ "بیچ پر چلیں؟" اس نے پوچھا۔

اس نے رضامندگی ظاہر کی۔

"چاہو تو اپنے کپڑے یہیں چھوڑ دو۔" وہ اپنی روب اتار کر ایک طرف ڈالتے ہوئے بولی۔ اس کے اندر وہ برہنہ تھی۔

یان کو دوسروں کے سامنے کپڑے اتارتے ہوئے ہمیشہ کچھ عجیب سا لگتا تھا، اور ایڈوج کو اپنی برہنگی میں یوں حرکت کرتے دیکھ کر اس پر رشک آتا تھا۔ جیسے ننگی کاہے کو ہو، ہلکا پھلکا آرام دہ گھر کا لباس پہنے ہو۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس کی حرکات کپڑوں کے مقابلے میں عالمِ برہنگی میں کہیں زیادہ قدرتی نظر آتی تھیں۔ تن سے کپڑے اتار پھینکتے ہوئے وہ جیسے صنفِ نسواں کی کڑی قسمت اتار پھینکتی ہوئی معلوم ہوتی اور ایک خالص شخص بن جاتی جو جنسی صفات سے معرا ہو۔ وہ یہ التباس پیدا کر دیتی گویا جنس کپڑوں میں متمکن ہو اور برہنگی جنسی غیر جانب داری کی حالت ہو۔

وہ جسم برہنہ ہی سیڑھیاں اتر کر بیچ پر آئے، جہاں دوسرے ننگے لوگ ٹولیوں میں بیٹھے ہوئے تھے، باتیں کر رہے تھے، تیر رہے تھے — ننگ منگ مائیں اور ننگ منگ بچے، ننگی دادیاں نانیاں اور ننگے پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں، ننگے جوان اور ننگے بزرگ۔ ننگی چھاتیاں سینکڑوں کے حساب سے، ہر وضع اور ہر حجم کی — دیدہ زیب، کم دیدہ زیب، قبیح صورت، بھاری بھرکم، سوکھی سکڑی۔ یان نے یہ سوگوار نتیجہ نکالا کہ نہ صرف یہ کہ کہنہ پستان جوان چھاتیوں کے برابر کچھ زیادہ جوان نہیں نظر آتے ہیں، بلکہ اس کا الٹ زیادہ صحیح ہے، اور مجموعی طور پر یہ یکساں اوٹ پٹانگ اور بے معنی ہوتے ہیں۔

اور ایک بار پھر وہ سرحد کے مبہم اور پراسرار تصور سے مغلوب ہو گیا۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ وہ لکیر پر کھڑا ہے، اسے پھلانگ رہا ہے۔ پیتا کا ایک عجیب احساس اس پر چھا گیا، اور اس پیتا کی دھند سے ایک کہیں زیادہ عجیب خیال ابھرا: کہ یہودی ہٹلر کی گیس چیمبرز میں ننگ دھڑنگ اور جوق در جوق داخل ہو رہے ہیں۔ وہ ٹھیک سے نہ سمجھ سکا کہ یہ پیکر کیوں بار بار عود کر آ رہا تھا اور اسے کیا بتانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید یہ کہ یہودی 'سرحد کی دوسری طرف' تھے اور برہنگی اس طرف کا لباس ہے۔ کہ برہنگی کفن ہے۔

بیچ پر ان تمام ننگے جسموں کے منظر سے پیدا ہونے والا پیتا کا یہ احساس یان کے لیے زیادہ سے زیادہ ناقابلِ برداشت ہوتا گیا۔ "ہر طرف ننگے جسموں کا نظر آنا بڑا عجیب لگتا ہے،" اس نے کہا۔

"جانتی ہوں،" وہ بولی۔ "اور سب سے زیادہ عجیب بات تو یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک خوبصورت ہے۔ غور سے دیکھو، تمھیں نظر آئے گا کہ بوڑھے جسم، حتیٰ کہ بیمار جسم بھی، اس وقت خوبصورت نظر آتے ہیں جب صرف و محض جسم ہوتے ہیں، بے کپڑوں کے جسم۔ یہ اتنے ہی خوبصورت ہوتے ہیں جتنی فطرت ہوتی ہے۔ ایک بوڑھا درخت کس طرح بھی ایک جوان درخت سے کم حسین نہیں ہوتا؛ ایک بیمار شیر پھر بھی حیوانوں کا بادشاہ ہوتا ہے۔ انسانی بدصورتی دراصل کپڑوں کی پیدا کردہ بدصورتی ہے۔"

یان اور ایڈوج کبھی ایک دوسرے کو نہیں سمجھ سکے تھے، تاہم ہمیشہ ہی ایک دوسرے سے اتفاق کرتے۔ ہر ایک، دوسرے کے الفاظ کا اپنی دانست میں مطلب نکالتا، اور وہ مکمل ہم آہنگی کے ساتھ رہتے، مکمل باہمی غلط فہمی کی زائیدہ مکمل یگانگت۔ وہ اس سے خوب واقف تھا اور اس سے تقریباً لطف لیتا تھا۔

وہ بیچ پر دھیرے دھیرے چلتے رہے، ریت ان کے تلوؤں کے نیچے جلتی رہی، کسی مینڈھے کی میں میں جو سمندر کی گرج میں مدغم ہو رہی تھی، ایک گندی سندی سی بھیڑ جو زیتون کی کسی شاخ کے نیچے کی رندھی رندھی گھاس چر رہی تھی۔ یان کو ڈیفنیس یاد آیا، وہ وہاں لیٹا ہوا ہے، کلوے کی برہنگی سے سحر زدہ۔ اگرچہ وہ شہوت میں آ گیا ہے، لیکن معلوم نہیں کہ کیا کرے، اور یہ احساس جاری رہتا ہے — لامنتہا، بلا تخفیف، غیر مختتم، بیکراں۔ اس کے دل میں

غیر مغلوب خواہش ابھری کہ اُس لڑکے کے پاس واپس جائے، خود اپنے آغاز کی طرف لوٹے، بنی نوعِ آدم کے آغاز کی طرف، محبت کے آغاز کی طرف۔ وہ آرزو کی آرزو کرنے لگا۔ دل کو دھڑکتا ہوا سننے کی آرزو۔ گلوے کے پہلو میں لیٹ جانے کی آرزو، جسمانی محبت سے قطعی نابلد، اوجِ لذّت سے بالکل نابلد۔ اس نے خود کو خالص برانگیختگی میں بدل دینے کی آرزو کی، عورت کے جسم پر مرد کی طویل، پراسرار، ناقابل فہم، جادو جگانے والی برانگیختگی۔ "ڈیفنیس!" اس نے زور سے پکارا۔

بھیڑ ابھی تک رندھی رندھی سی گھاس چر رہی تھی، اور یان نے دوبارہ آہ بھری "ڈیفنیس ... ڈیفنیس، ڈیفنیس ..."

"کیا تم ڈیفنیس کہہ رہے ہو؟"

"ہاں،" وہ بولا۔ "ڈیفنیس۔"

"سن کر خوشی ہوئی،" ایڈوج نے کہا۔ "اس کے پاس لوٹ جانے کا وقت آ گیا ہے۔ اُن وقتوں میں لوٹ جانے کا جب عیسائیت نے ابھی نوعِ انسانی کو اپاہج نہیں کر دیا تھا۔ تمھارا یہی مطلب ہے، ہے نا؟"

"ہاں،" یان نے کہا، اگرچہ اس کا مطلب اس سے بالکل مختلف تھا۔

"اس فطری بہشت کا تصور کرو جس میں وہ رہتا ہوگا،" وہ بولے گئی۔ "بھیڑیں اور چرواہے۔ لوگ جو فطرت سے ہم آہنگ ہوں گے۔ حواس کی آزادی۔ تمھارے لیے ڈیفنیس انھیں باتوں کا نمائندہ ہے، ہے نا؟"

ایک بار پھر یان نے ایڈوج کو اطمینان دلایا کہ بالکل یہی بات اس کے ذہن میں تھی۔ "تم درست کہہ رہے ہو،" ایڈوج نے کہا۔ "اور یہ جزیرۂ ڈیفنیس ہے!"

اور چونکہ اسے ان کی باہمی غلط فہمی کی بنیاد پر اپنے اتفاقات کی پرورش کرنے میں مزہ آتا تھا، یہ اضافہ کیا، "اور وہ ہوٹل جس میں ہم ٹھہرے ہوئے ہیں 'دوسری طرف' ہے۔"

"ہاں،" ایڈوج نے بڑے اشتیاق سے چلا کر کہا۔ "اس غیر انسانی دنیا کی دوسری طرف جس میں ہماری تہذیب ہمیں محصور کیے ہوئے ہے!"

برہنہ لوگوں کی ایک ٹولی ان کی طرف آ رہی تھی۔ جب ایڈوج نے یان کو ان سے

متعارف کرایا، تو انھوں نے ہاتھ ملائے، اپنے اپنے "تم سے مل کر اچھا لگا" کہے، اور فرفر اپنے نام اور القاب بتانے لگے۔ اس کے بعد انھوں نے بہت سی چیزوں کے بارے میں باتیں کیں: پانی کا درجۂ حرارت، ایک ایسے معاشرے کی ریاکاری جو روح اور جسم دونوں کو اپاہج بنا دیتا ہے، جزیرے کا حُسن۔

"یان نے ابھی ابھی اشارتاً کہا ہے کہ ہمیں اسے 'جزیرۂ ڈیفنیس' کہنا چاہیے،" آخری موضوع کی مناسبت سے ایڈوج نے کہا۔ "میرے خیال میں یہ اس نے کام کی بات کہی ہے۔"

سبھی اس خیال پر مسرور ہوئے، اور ایک غیر معمولی توندل آدمی یہ نظریہ وضع کرنے بیٹھ گیا کہ مغربی تہذیب ختم ہو رہی ہے اور جلد ہی ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عیسائی۔یہودی فکر کے بندھنوں سے آزاد ہو جائیں گے — بیانات جو یان پہلے بھی دس، بیس، تیس، سو، پانچ سو، اور ہزار بار سن چکا تھا — اور تھوڑی دیر کے لیے ساحلِ آب کے وہ چند قدم کسی دانش گاہ کی جلسہ گاہ کی طرح معلوم ہونے لگے۔ آدمی مسلسل بولے گیا۔ دوسرے دلچسپی سے سنتے رہے، اور اس درمیان میں ان کے برہنہ جنسی اعضا پیلی پیلی ریت کو بے کیفی، اداسی، پژمردگی سے تکتے رہے۔

مکتبۂ دانیال سے شائع ہونے والے

محمد عمر میمن کے
دیگر تراجم

- فنِ فکشن نگاری (جلد اوّل)

  فنِ فکشن نگاری (جلد دوم)

  فنِ فکشن نگاری (جلد سوم) (ممتاز مغربی ادیبوں سے مکالمے)

- سمرقند (امین مالوف)
- روشنی کی یہ خیرہ کن نابودگی (طاہر بن جلون)
- وجود کی ناقابلِ برداشت لطافت (میلان کنڈیرا)

وجود کی ناقابلِ برداشت لطافت (ناول)

میلان کنڈیرا

ترجمہ: محمد عمر میمن

روشنی کی یہ خیرہ کن نابودگی (ناول)

طاہر بن جلون

ترجمہ: محمد عمر میمن